خود نوشت

افکارِ سرسیّد

مرتّب و مدوّن

ضیاء الدین لاہوری

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون : ۰۴۲_۵۴۲۷۹۰۱_۲

Khud Nawisht Afkar-i-Sir Syed
By
Zia-ud-din Lahori

ISBN No: 969-8793-38-7

ضابطہ

نام کتاب	خودنوشت افکارسرسید
اشاعتِ جدید	نومبر۲۰۰۴ء
ناشر	محمد ریاض درانی
سرورق	جمیل حسین
کمپوزنگ	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر' وحدت روڈ لاہور
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس پرنٹرز' لاہور
قیمت	-/150 روپے

اشاعت ہذا : اکتوبر ۲۰۰۵ء

انتساب

ان اساتذہ اور دانش وروں کے نام

جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی

نہیں مانتے

اور حقائق قبول کرنے کی بجائے

تاویلات ''ایجاد'' کرتے رہتے ہیں

اظہارِ تشکر

''خودنوشت افکارِ سرسید'' کی ترتیب و تدوین میں متعدد ذاتی کتب خانوں کے علاوہ مندرجہ ذیل لائبریریوں سے خصوصی استفادہ کیا گیا:

لاہور: پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔ پنجاب پبلک لائبریری ۔ عجائب گھر لائبریری۔ دارالسلام لائبریری۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری۔ برٹش کونسل لائبریری۔ مجلس ترقی ادب لائبریری

کراچی: انجمن ترقی اُردو لائبریری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس لائبریری۔ ادارہ ہمدرد لائبریری۔

لندن: رائل ایشیا ٹک سوسائٹی لائبریری۔ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز (لندن یونیورسٹی) لائبریری۔ برٹش (میوزیم) لائبریری۔ انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز۔

مرتب و مدوّن کتاب ہذا مطالعہ کی سہولتیں بہم پہنچانے پر متذکرہ بالا لائبریریوں کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کارکنوں کا بھی جنہوں نے متعلقہ مواد کی تلاش اور عکسی نقول فراہم کرنے میں اس کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔

فہرست مضامین

معجزات وکرامات

حضرت ابراہیمؑ کے معجزات

حضرت موسیٰؑ کے معجزات

حضرت یونسؑ کے معجزات

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات

آنحضرتؐ کے معجزات

موضوع روایات

عذاب الٰہی

آثار قیامت اور اس کا قیام

عالم آخرت اور سزا وجزا

مسائل توحید ونجات

مسائل نماز

مسائل رمضان

ارکان حج

بدعات

باطل تعظیمی عقائد

اوہام

بزرگوں کے تصورات

خوابوں کی تعبیر

شیعوں کے ناپسندیدہ مسائل

متفرق مسائل

سابقہ شریعتوں کے چند احکام

تہذیبی و تمدنی خیالات

عادات و اطوار

تعصبات

غلام اور لونڈیاں

عائلی مسائل

متفرق

تعلیمی نظریات

انگریزی حکومت اور تعلیم

زبان ذریعہ تعلیم

تعلیم کے مختلف شعبے

جدید تعلیم کے منفی پہلو

سیاسی و تاریخی افکار

مملکت کے مسائل

اسلامی سزائیں

خلفائے راشدین

غیر مذاہب پر مسلم حکمرانوں کے ظلم

انگریز اور ہندوستان

غیر سلطنتیں اور ہندوستانی مسلمان

جدید سیاست ہند

عرضِ ناشر

ضیاء الدین لاہوری نے برصغیر کی نامور شخصیت سرسید احمد خاں کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر خاصی تحقیق کی ہے۔ متنازعہ امور میں حقائق تک پہنچنے کا اُن کا اپنا انداز ہے جو تحقیق کے شعبہ میں ایک اہم جہت متعین کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اصل تاریخی دستاویزات کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور جب اُن تک رسائی ہو جاتی ہے تو متعلقہ موضوعات کی تحریریں چن چن کر سامنے لاتے ہیں۔ اُن کے پیش کردہ حوالے خود بولتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے! اس طرح وہ ایسے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جنھیں پیشہ ور اہل قلم قارئین کی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں یا تحریفات کے ذریعے اصل معانی کو کچھ کا کچھ بنا ڈالتے ہیں۔ تحقیق میں انشا پردازی کے ذریعے من پسند نتائج اخذ کرنا اُن کے ہاں جائز نہیں۔

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کی اپنی تحریروں اور تقریروں کے متن سے ان کی حیات اور افکار سے متعلق اہم اقتباسات الگ الگ اس طرح ترتیب دیے ہیں کہ وہ سرسید کی ''خودنوشت'' کا روپ دھار گئے ہیں۔ اس صورت میں وہ بعض ایسے حقائق منظر عام پر لائے ہیں جو اکثر قارئین کے لیے سخت حیرت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ''خودنوشت حیات سرسید'' اور ''خودنوشت افکارِ سرسید'' کے نام سے فاضل مرتب و مدوّن کی یہ کاوش سنجیدہ اہل علم میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہے۔ جمعیۃ پبلی کیشنز ان تالیفات کی اشاعت نو پیش کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقائق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد ریاض درانی

متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور

فون: 042-5427901-2

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

حرفے چند

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں مختلف علوم وفنون میں ایسی نادر روزگار شخصیات پیدا ہوئی ہیں کہ چشم فلک نے کسی اور خطہ ارض پر کم ہی اس کا نظارہ کیا ہوگا' لیکن اگر تاریخ کی آخری دو صدیوں میں عقیدت و ارادت کے اظہار اور تذکرہ وتبصرہ کے لیے کسی ایک ہی شخصیت کا انتخاب ضروری ہو، جو علم وعمل میں — ہر دو لحاظ سے جامع صفات اور جامع جہات ہو تو اس فرد فرید کے نام کے سوا کوئی دوسرا نام زبان میں نہیں آ سکتا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک گوشے میں محو خواب ابدی ہے اور جسے دنیا سر سید احمد خاں کے نام سے یاد کرتی ہے۔

سرسید احمد خاں نے زبان' ادب' صحافت' تعلیم' سیاست' اصلاح قومی کی تاریخ میں گہرے نقوش ثبت کیے تھے جو بعد کی تاریخ کے ہر دور میں روشن سے روشن تر ہوتے رہے ہیں' لیکن سرسید نے جتنے عظیم الشان کارنامے انجام دیے تھے ویسی ہی ان سے بڑی غلطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں۔ اس لیے لازم ٹھہرا کہ ان سے اتنا ہی شدید اختلاف کیا جائے۔ سب سے زیادہ ان کے مذہبی عقاید موضوع بحث بنے اور اس سے کم ان کے تعلیمی افکار اور سیاسی نظریات پر نقد کیا گیا۔ بلاشبہ اگر ان کے مذہبی عقاید کو اختیار کرلیا جائے تو مذہبی عقاید وایمانیات کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اگر ان کے سیاسی افکار کو بیسویں صدی میں بھی مسلمان اپنا نصب العین قرار دے لیتے تو آزادی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکتا تھا' اگر ان کی دعائیں شرف قبول حاصل کرلیتیں تو آج بھی اہل وطن کے سروں پر برٹش استعمار کا سورج چمک رہا ہوتا، اور اگر ان کے تعلیمی افکار کو مطمح نظر قرار دے لیا جاتا تو برطانوی اقتدار کے دفتری نظام کو چلانے اور

اسے مستحکم کرنے والی مسلمان نام کی ایک غلام قوم محکومانہ زندگی گزار رہی ہوتی۔

اس کے باوجود زندگی کے کسی دائرہ فکر وعمل میں سرسید کی عظمت اور ان کی شخصیت کے گہرے اور پائیدار اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید سے تمام تر اور شدید ترین اختلافات کے باوجود اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شخصیت، سیرت اور افکار میں کوئی بات ایسی ضرور تھی کہ ان کو قومی اور ملی زندگی کے کسی دائرے سے نکال پھینکنا تو درکنار، انہیں نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ ہو سکا۔ ان کی عظمت کا سورج آج بھی نصف النہار پر ہے اور ہندوستان پاکستان میں اور ہر مذہب اور ہر طبقہ فکر میں ان سے محبت کرنے والوں کی تعداد کو گنا نہیں جا سکتا۔

رہا مسئلہ قومی زندگی کی تعمیر میں علی گڑھ کے مرکز ملی کی خدمات کا، تو اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بلاواسطہ سرسید کی تحریک کا ہرگز نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ بیسویں صدی کے حالات کانگریس کی سیاسی اور دیوبند کی انقلابی تحریک کے اثرات اور خود علی گڑھ کے مرکز میں ردعمل کے برگ وبار تھے۔

سرسید احمد خاں کی زندگی سے لے کر اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مستند اور جامع کتاب حالی کی "حیات جاوید" ہے، لیکن حیات جاوید اپنی اہمیت کے باوجود اکابر اہل علم کے نقد ونظر سے نہ بچ سکی۔ دوسری کوئی تصنیف تو اس کے کسی ادنا باب کے معیار تک بھی نہ پہنچ سکی، اہل علم کی نظروں میں اعتبار کیا حاصل کرتی۔ ہر تالیف اپنے مولف کے افکار وخیالات کی آئینہ دار تھی۔ کوئی مولف ایسا نہ تھا جس نے اپنی زندگی کے چند برس بھی سرسید کے عہد، ان کی شخصیت وسیرت، ان کے افکار اور ان کے کارناموں کے سنجیدہ مطالعے اور ان پر غور وفکر میں گزارے ہوں۔ ان کی تالیفات کے مقاصد بھی مختلف تھے۔ بہت سے حضرات نے نصاب کے مطابق تعلیم وتدریس کی ضرورتوں سے کتابیں تالیف کی تھیں۔ علمی حلقوں میں ان کے اعتبار حاصل نہ کر سکنے کی ایک بڑی یہ بھی تھی۔

ضیاء الدین لاہوری کی حیثیت اس عہد کے تمام مولفوں اور مصنفوں سے قطعی مختلف ہے۔ ان کے پیش نظر کسی نصابی کتاب کی تالیف نہیں تھی۔ سرسید کے بارے میں اپنے افکار وخیالات کو تالیف کر دینے کے شوق میں انہوں نے قلم نہیں اٹھایا۔ تعلیم وتدریس کی کوئی ضرورت

اس مشقت کے لیے ان کی دامن کش نہیں ہوئی تھی۔ ان کا مقصد سرسید کی عظمت کی تلاش اور اس عہد میں ان کی معنویت کی دریافت تھی۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً پچیس برس، اپنی عمر کا بہترین حصہ، اور اعلا ذہنی و فکری صلاحیتیں سرسید پر غور و فکر اور تحقیق میں صرف کی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تگ و دو کا میدان پاکستان سے انگلستان تک وسیع رہا ہے اور انہوں نے سرسید کی تصنیفات و تالیفات اور مطبوعات کے علاوہ ان کے دستیاب مخطوطات کے ایک ایک حرف کا مطالعہ کیا ہے اور اپنی پسند اور اپنے خیال کے مطابق ایک تالیف کا کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ سرسید کے اپنے بیانات و تحریرات سے اخذ کر کے حوالے کے ساتھ درج کر کے سرسید کی خودنوشت کے ہر دو پہلوؤں —— سوانح و افکار کا ایک عجیب و حسین مرقع تیار کر دیا ہے۔ تالیفی حیثیت سے ''حیات جاوید'' کے بعد یہ سب سے زیادہ مستند اور جامع کتاب ہے اور ''خودنوشت'' کی حیثیت سے حیات جاوید پر اس کی اہمیت موفق ہے۔ انہوں نے غلط اور صحیح سے بحث نہیں کی، جو کچھ ہے سرسید کی اپنی تقریر و تحریر اور الفاظ و بیان میں ہے۔ ان کی شخصیت کے ہر پہلو، ان کے افکار و عقاید اور ان کی سیرت کی ہر جہت اور ان کی خدمات کے ہر گوشے اور خوب و زشت پر ان کی اپنی گواہی ہے اور سرسید جیسی عظیم علمی و عملی اور جامع جہات شخصیت کے بارے میں جو کچھ سوچا جا سکتا ہے وہ سب ''خودنوشت'' میں موجود ہے۔

جہاں تک کتاب کے حسن تالیف و تدوین مطالب کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ضیاء الدین لاہوری کے ذوق و کاوش نے اسے حسن تالیف کی ایک مثال بنا دیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی پذیرائی اصحاب ذوق و فکر اور اہل علم و عمل کے ہر دائرے میں کی جائے گی۔ جس طرح حیات جاوید کی اشاعت سے سرسید کے مطالعے کا ایک دور شروع ہوا تھا، اسی طرح اس کتاب کے مطالب کی روشنی میں آئندہ سرسید کے مطالعے، ان کے افکار و سیرت پر غور و فکر اور ان پر تصنیف و تالیف کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ اس دور کے فاتح باب جناب ضیاء الدین لاہوری ہیں۔

مرتّب و مدون پر ایک نظر

ضیاءالدین لاہوری

پیدائش

لاہور ۱۹۳۵ء

تعلیم

ایم اے (ایجوکیشن) ۱۹۶۶ء
انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ پنجاب یونیورسٹی لاہور

پیشہ

تعلیم و تدریس/تحقیق

مطبوعہ تصانیف

سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی - جوہر تقویم - رویت ہلال موجودہ دور میں -
خودنوشت حیاتِ سرسید - خودنوشت افکارِ سرسید - نقش سرسید - بہادر شاہ ظفر کے شب و روز
Hijra & Chirstian Calendars

موضوعاتِ تحقیق

سرسید اور تحریک علی گڑھ - جنگ آزادی ۱۸۵۷ء - اسلامی تقویم

نقل وطن اور تحقیقی کام

محکمہ تعلیم و سائنس انگلستان کی منظوری سے ۱۹۷۰ء میں برطانیہ میں آباد ہونے کے حقوق حاصل ہوئے مگر وطن سے ناطہ نہ توڑا اور (تنہا) آنا جانا رہا۔ اس دوران زیادہ عرصہ بیوی بچوں کے ساتھ آبائی شہر لاہور ہی میں قیام کیا۔ لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے علاوہ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن یونیورسٹی اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں سے بھرپور استفادہ کیا اور تحقیقی مقالے تحریر کیے جو پاک و ہند کے موقر علمی جرائد میں طبع ہوئے۔

عرضِ احوال

(از مرتب)

سرسید احمد خاں کا شمار انیسویں صدی کی انقلابی شخصیات میں کیا جاتا ہے۔ تقریر و تحریر کی ان میں پیدائشی صلاحیتیں موجود تھیں۔ انہوں نے اوائل شباب ہی میں تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اور لکھتے چلے گئے۔ قلم آخر دم تک ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اس قدر لکھا کہ تحریر کے دریا بہا دئے۔ بڑھاپے میں بھی ان کی قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ ان کی تصانیف مسلسل منظر عام پر آتی رہیں۔ ان کے دماغ میں خیالات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ لکھتے مگر عمر نے وفا نہ کی اور بعض تصنیفی و تالیفی اشاعتی منصوبوں کی تکمیل کی حسرت دل میں لئے اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کی دلچسپیاں علم و ادب کی کسی خاص صنف تک محدود نہ تھیں۔ موقع کی مناسبت سے جو موضوع بھی ان کے ہاتھ لگا اس پر طبع آزمائی کی۔ ''سید الاخبار'' سے لے کر ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کی ادارت تک کے طویل سفر میں انہوں نے صدہا مضامین لکھے اور ڈھیروں کتابیں تالیف کیں۔ دینی مباحث، مسائل تصوف، فلسفہ کے دقیق نکات، علم ہیئت کی توضیحات، تاریخی تذکرے، سیاسی مصلحتیں، معاشرتی اقدار، تعلیمی اصلاحات، تہذیبی و تمدنی روایات، صحافتی ذمہ داریاں، قانونی وضاحتیں، نظم و نسق، زبان و ادب وغیرہ وغیرہ متعدد موضوعات پر انہوں نے لکھا، ماہرانہ انداز میں لکھا اور مسائل زیر بحث کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ انہوں نے معروف تاریخی کتب کی تصحیح و تدوین کے علاوہ خصوصی اہمیت کی حامل کتابوں کے تراجم بھی کئے۔

سرسید کی متعدد تصانیف ان کے مختلف ادوار کے افکار و نظریات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ۱۸۷۸ء میں جب انہوں نے اپنی تمام تصانیف کو دوبارہ یکجا کر کے ''تصانیف احمدیہ'' کے نام سے متعدد جلدوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو لکھا کہ ''ان تصانیف سے خود ہمارے لئے ہمارے خیالات کی ایک تاریخ موجود ہو جائے گی جس پر تعجب سے نگاہ ہو سکے گی کہ کس طرح پر وہ تبدیل ہوتے گئے۔''[۱] آج برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ مختلف گروہوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے سرسید کی مختلف تصویریں سجا رکھی ہیں۔ سرسید کے تبدیل ہوتے رہنے والے خیالات میں سے وہ جہاں سے چاہیں اپنے مطلب کے اقتباسات چن لیتے ہیں اور ان کی مدد سے ان کی شخصیت کے متضاد پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تصدیق کے طور پر حوالے پیش کئے جاتے ہیں اور ان حوالوں کو جھٹلانا اس لحاظ سے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ تحریریں بہرحال سرسید کی تصانیف میں موجود ہوتی ہیں، فیہ الگ بات ہے کہ وہ ان خیالات سے رجوع کر چکے ہوں۔

سرسید کے مضامین اور ان کی تصانیف کی تعداد کو مدنظر رکھا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ مصروفیت کے اس دور میں ان کے تفصیلی مطالعہ کا وقت بہت ہی کم لوگوں کے پاس ہے۔ جن کے پاس وقت اور وسائل موجود ہیں وہ تن آسانی یا خاص مکتبہ فکر کے حامل ہونے کی بنا پر سرسید کے مختلف ادوار کے خیالات کو سامنے رکھ کر ان کی اصل تصویر پیش نہیں کرتے۔ پاکستان کے نصابی دانش ور اور اس سے متاثرہ افراد سرسید کو دوقومی نظریے کا بانی قرار دیتے ہیں، جب کہ ہندوستان میں سرسید کے اقوال کے حوالے سے انہیں متحدہ قومیت کا علم بردار ظاہر کیا جاتا ہے۔ ایک فریق کانگریس کے خلاف سرسید کی آرا کو ان کی دوراندیشی سے تعبیر کرتا ہے جب کہ دوسرا فریق اسے سب پرنسپل بیک (Beck) کا کیا دھرا قرار دیتا ہے۔ بعض معاملات میں دونوں فریق ہم نوا بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اردو یا انگریزی زبان ذریعہ تعلیم کے مسئلے پر دونوں سرسید کے متروک خیالات پر ان کی عظمت کا ڈھانچہ تعمیر کرتے ہیں۔ دونوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وقوعہ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کی بحالی کے سلسلہ میں ان کی ''مخلصانہ مساعی'' کا ذکر گول کر دیا جائے، اور اگر مجبوری ایسا کرنا پڑ ہی جائے تو ان کی

مذکورہ خدمات ''وقتی مصلحت'' نام کی حسین اور پرفریب چادر میں لپیٹ کر پیش کی جائیں جب کہ سرسید اپنے طرزِ فکر و عمل کو دلی یقین کا مظہر، سچا، کھرا، خلوص و ایمان پر مبنی اور خدا و رسول کی اطاعت بتاتے رہے۔ سرسید کے شیدائی دانش وران کے اصل افکار کے برعکس اپنے زورِ قلم سے سرسید کو اس صورت میں پیش کرتے ہیں جس میں وہ خود انہیں دیکھنا چاہتے ہیں، نہ کہ اس صورت میں جو اُن کی اصل تصویر تھی۔ ان کی بنائی ہوئی شبیہہ ان کے اپنے تصورات کا آئینہ ہوتی ہے۔ سرسید کے خیالات پر پردہ ڈالنا تو ایک عام سی بات ہوگئی ہے، وہ دیانت داری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کے بعض اقوال سیاق و سباق کے بغیر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس سے مطلب الٹ جاتا ہے۔ اپنی ضرورت کے پیشِ نظر وہ جعل سازی پر بھی اتر آتے ہیں اور سرسید کے منہ سے وہ الفاظ اگلواتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہے۔

جن حالات کے زیرِ اثر سرسید کی فکری اور عملی قیادت نے جنم لیا، پروان چڑھی اور بالآخر ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئی اس کے بیان میں ان عوامل کی نشان دہی بخوبی کی جاسکتی ہے جو اُن کے افکار کی بنیاد میں کارفرما تھے۔ ان حالات کے درست تجزیہ کے بغیر صرف سرسید کے عزم و استقامت اور ان کی اختیار کردہ بعض حکمت عملیوں کی مبینہ کامیابیوں کو بنیاد بنا کر نتائج اخذ کرنا اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے مترادف ہوگا۔

سرسید احمد خاں کے خاندانی پس منظر پر غور کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اجداد پدری جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے عہد سے مغلیہ دربار سے برابر منسلک چلے آرہے تھے۔ بقول سرسید ان کے باپ دادا کو شہنشاہانِ مغلیہ نے بڑے بڑے خلعت و خطاب عطا فرمائے تھے[۲] اور جو انہوں نے بھی اپنے بچپنے میں حاصل کئے تھے[۳]۔ حالی لکھتے ہیں کہ ''سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانہ میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں...... انہوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو، باوجودیکہ ان کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔[۴] وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اس کے لوازمات بھی دے سکے''۔[۵]

تعجب تھا کہ وہ کیوں اس میں تساہل کرتے جاتے ہیں آخر کار
بصلاح جنرل آکٹر لونی کے جو ریذیڈنٹ تھے اور دبیر الدولہ سے
نہایت دوستی رکھتے تھے ..... دبیرالدولہ نے استعفیٰ دے دیا''۔ [۱۲]

سرسید کے خاندانی پس منظر کی مذکورہ بالا جزئیات پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حاکم وقت سے خیر خواہی اور وفاداری ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے سرسید کے خون میں رچی ہوئی تھی۔ جب بے حیثیت مغلیہ دربار سے لاتعلق ہوکر انہوں نے انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار کی تو خاندانی اثر ورسوخ، جذباتی وابستگی، ذاتی لیاقت اور محنت وجاں فشانی نے ان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

ملازمت کے آغاز کے ساتھ ہی انہوں نے تصنیف وتالیف میں بھی گہری دلچسپی لینی شروع کی اور مذہبی وتاریخی کتب تحریر کیں جس سے ان کی علمی قابلیت کا چرچا ہونے لگا۔ ''آثار الصنادید'' کے حوالے سے ان کی شہرت آسمان کو چھونے لگی مگر ملک کے سیاسی حالات کے بارے میں ان کے ذاتی خیالات پر ابھی پردہ پڑا ہوا تھا، گوکہ بعد میں انہوں نے اپنی سابقہ تحریروں کی نشان دہی کی جن کے مطابق وہ وقوعہ ۱۸۵۷ء سے بھی قبل اپنے سیاسی افکار کا اظہار بالواسطہ کرتے رہے تھے۔ مثال کے طور پر وہ ''آثار الصنادید'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۸۵۴ء میں، جب میں نے ایک تاریخ دہلی کی پرانی عمارتوں اور اگلی عمل داریوں کی لکھی تو اس میں سلسلہ سلطنت خاندان مغلیہ کا ۱۸۰۳ء سے، یعنی جب سے کہ لارڈ لیک سپہ سالار انگلشیہ نے دہلی کو فتح کیا، منقطع کیا اور ہندوستان کی سلطنت میں سلسلہ شاہان انگلستان کا قائم کیا۔ اس سے یقین ہوسکتا ہے کہ اس ہنگامہ کے پہلے سے میری نیت یہی تھی کہ تمام اہل ہند جان لیں کہ اب سلطنت خاندان مغلیہ کی ختم ہو گئی ہے اور ہندوستان کی بادشاہت شاہان انگلستان کی ہے''۔ [۱۳]

باوجودیکہ آخری مغل حکمران ہر امر میں انگریزوں کے دست نگر ہو چکے تھے اور عملی طور پر نظم ونسق کے اختیارات انگریزوں ہی کے ہاتھ میں تھے مگر برصغیر میں اس سے پہلے مغلیہ

سلطنت کے اختتام کا حتمی اعلان کرنے کی جرأت غالباً ابھی کسی کو نہیں ہوئی تھی۔ یہ سہرا سرسید احمد خاں کے سر ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی علمی انداز میں انگریزی حکومت کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کام رضا کارانہ طور پر اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جنگ آزادی کا زمانہ آیا تو انہوں نے انگریزی سرکار کی تائید میں اپنی عملی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور اپنی جان کو داؤ پر لگا کر انگریزوں کی حفاظت کی اور پھر بجنور میں ہندو مسلم فسادات کے دوران ہندوؤں کے تعاون سے اپنے ایک ملازم دوست کے ساتھ انگریزی حکومت کے منتظم بھی مقرر ہوئے۔ اس تمام عمل میں انہوں نے سخت مصیبتیں اٹھائیں جس کا تفصیلی ذکر انہوں نے اپنی تالیف ''سرکشی ضلع بجنور'' میں کیا ہے۔ سرسید کی ان خدمات پر انگریز حاکم کے تاثرات ان کی اپنی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

> ''میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں۔ اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ ''تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چال

چلن اور نہایت طرف داری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے، جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے، سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بنا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے"۔ میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدردانی کی۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ آمین۔"[۱۴]

بعد میں اس نمک حلالی کے صلے میں سرسید کو ترقی اور انعام و اکرام کے علاوہ دو نسلوں تک دوس[و] روپیہ ماہواری پنشن سے نوازا گیا۔[۱۵]

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کا ایک ایسا سلسلہ چل[ا] کہ ابن الوقت لوگ تو معافیاں مانگ کر یا سلطانی گواہوں کے طور پر دوسروں کے خلاف جھوٹی سچی شہادتیں فراہم کر کے صاف بچ گئے مگر آزادی کے پرستار پھانسیاں پانے لگے۔ متعد[د] رہنماؤں کو کالے پانی کی سزا دی گئی اور بے شمار حریت پسند قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے لگے۔ بہت سے ملک سے فرار اور کئی ایک روپوش ہو گئے۔ خوف و ہراس کے اس عالم میں ایوان حکومت تک صرف آزمودہ کار خیر خواہوں کی شنوائی ممکن تھی۔ مسلمانوں میں قیادت کا میدان خالی تھا اور انگریزوں کو ایسے قابل اعتماد اشخاص کی ضرورت تھی جن میں مسلمانوں کی رہنمائی کی خصوصیات موجود ہوں تاکہ ان کے ذہنوں سے بغاوت کے جذبات نکال کر انہیں وفادار شہری بننے کی ترغیب دی جا سکے۔ سرسید ان صلاحیتوں کے بہترین مالک تھے۔ انہوں نے اپنے قول و عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ ان پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ظلم

جور کے اس دور میں سرکار انگریزی کے سند یافتہ خیر خواہ اور معتمد وفادار کی حیثیت سے انہیں سچی بات کہنے پر بھی حکمرانوں کی طرف سے اپنے خلاف کسی قسم کی بدگمانی کا خطرہ یا خوف نہ تھا۔ محنت مشقت ان کی طبیعت کا خاصہ تھی، تحریر و تقریر کا ملکہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا اور ان خوبیوں کی بدولت انہیں انگریزوں کے انتقام کا خصوصی شکار ہونے والی قوم کے ایک طبقہ کو اپنے پیچھے لگانے کا گر آتا تھا۔ اس عالم میں وہ آگے بڑھے اور مسلمانوں کی حمایت میں اپنا قلم اور رسوخ استعمال کرتے ہوئے انہیں حکمرانوں کی وفاداری کا درس دینا شروع کیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہم خیال لوگوں اور مراعات یافتہ گروہ کے بااثر افراد کو ساتھ لے کر برصغیر کے ایک عظیم مسلمان قائد کے طور پر ابھرے۔ یہ سمجھنا کہ سرسید ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہونے والی انگریزوں کی منتقمانہ کارروائیوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو بچانے کے لئے میدان عمل میں آئے تھے درست نہیں۔ مذکورہ بالا حالات و واقعات کے تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید کی اصل شخصیت ۱۸۵۷ء سے قبل ہی وجود میں آ چکی تھی جو ۱۸۵۷ء میں عملی طور پر ظاہر ہوئی اور اس کے بعد ایک ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

سرسید نے اطاعت و فرماں برداری اور وفاداری کے جذبات کی نشو و نما کے لئے ایک مثالی تعلیمی ادارے کے قیام کو اس مقصد کا بنیادی اور موثر ذریعہ سمجھتے ہوئے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد میں یہ مقصد نہایت اہمیت کا حامل ہے:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق و کار آمد رعایا بنانا اور ان کے طبائع میں ایسی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔''[16]

کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک موقع پر اس مقصد کو کھلے الفاظ میں اس طرح بیان کیا۔

''من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلبہ کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیرکٹر (Character) کا نقش پیدا ہو اور اس سے خفیف سا انحراف بھی حق امانت سے انحراف کے مترادف ہے''۔[17]

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے تحت سرسید کا لگایا ہوا یہ پودا کہاں تک بارآور ہوا، اس کا بیان ان کے عظیم معتقد اور مستند سوانح نگار الطاف حسین حالی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''اس کوہ وقار شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری' یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ اس نے ایک جماعت کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے' اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو ان کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی سلامتی' بلکہ اپنا وجود' ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں۔ ان کو اپنے اسلاف کی اقبال مندی کے خواب نظر آنے موقوف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں۔''[۱۸]

سرسید نے تعلیمی منصوبوں کے ساتھ ساتھ مذہبی فکر کا بھی ایک سلسلہ قائم کیا جسے اس زمانہ میں ''نیچری'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا۔ عام مسلمانوں نے ان کے بعض عقائد کو الحاد اور کفر قرار دیا بلکہ انہیں اپنے بعض قریبی رفقا کی بھی سخت تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کے مذہبی افکار کی طلبہ میں ممکنہ اشاعت کا تصور ان کے کالج کی سخت مخالفت کا سبب بنا اور یہ صورت حال ایک حد تک ان کی تعلیمی کاوشوں کے مقاصد پر بھی اثر انداز ہوئی۔ سرسید ذہنی دائرے میں بھی اپنے مشن کی تکمیل میں سرگرم رہے۔ انہوں نے خدا اور رسول کے حوالوں سے غیر ملکی حکمرانوں کی اطاعت و فرماں برداری کو فرض اور واجب قرار دیا اور تفسیر القرآن میں ان عقائد کا اظہار کیا:

''جو لوگ اس ملک میں' جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں' یا امن کا اعلانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو' اور گو صرف بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی' یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔''[19]

اگرچہ دینی حلقوں میں بھی بعض ایسے بااثر طبقے موجود تھے جو انگریزوں کی اطاعت کو اپنے ایمان کا ضروری جزو خیال کرتے تھے مگر عام عقائد پر مذہبی بحث کھل جانے سے یہ توجہ بٹ گئی اور ان کی اطاعتی فکر کی ترویج میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اگر یہ محاذ نہ کھلتا اور سرسید اپنا اصل مقصد حاصل کرنے کی فکر میں مگن رہتے تو سیاسی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں ضرور تاخیر ہوتی۔ جب نوزائیدہ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آ کر متحرک ہوئی تو سرسید نے کانگریس کے مقاصد کے خلاف زبردست لیکچر دیے جن میں مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ اس مخالفت کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا وہ ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے:

''مسلمانوں کی آئندہ بہبودی اور ترقی کے لئے بحیثیت ملکہ معظمہ انگلستان اور قیصرہ ہند کی باامن اور تابع اور وفادار رعایا ہونے کے' میں بوجہ ہونے برٹش سبجیکٹ (Subject) اور وفادار سٹیزن (Citizen) کے' اور اپنے ہم وطنوں کا عموماً اور ہم مذہب مسلمانوں کا خصوصاً سچا خیر خواہ ہونے کے' بہت زیادہ اور سخت مخالف ہوں کل ایسی جمہوری تحریکوں کا جو برٹش رول (Rule) کے خلاف شکایتیں اور رنجشیں بھڑکاتی ہیں اور اس ملک میں' جہاں مختلف اقوام اور مذاہب آباد ہیں، اس کی اعلیٰ قوت اور اختیار کو تزلزل میں ڈالتی ہیں۔''[20]

سرسید کو اس بات پر سخت شکایت تھی کہ ''جس طرح نیشنل کانگرس کی کارروائی ہوتی ہے اور پولیٹیکل مباحثوں کے لئے جابجا مجلسیں کی جاتی ہیں اور عام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ رعایا کے واجبی حقوق ادا نہیں کرتی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نالائق اور جاہل آدمیوں کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ظالم یا کم از کم نامنصف ہے''۔[21]

معتقدات خود ان کے اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے ہیں۔ ہر شخص اپنے نظریات میں مختار ہے۔ ان میں سے جو آپ کو قبول ہوں ان کی داد سرسید ہی کو دیجیے اور جن سے آپ متفق نہیں ان کی نقاب کشائی کے لئے مجھے نہ کوسیے۔ میں نے تو صرف اس قدر گستاخی کی ہے کہ عمر کا ایک بڑا حصہ اس کام پر وقف کر کے تصویر کے دونوں رخ منظر عام پر لانے کا فریضہ انجام دیا ہے تا کہ ہماری آئندہ نسلیں شخصیت پرستی کے فسوں سے آزاد ہو سکیں۔ دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی شخصیتوں کے صحیح مقام کا تعین ان کے اقوال و افعال کی روشنی میں کریں اور جذباتی انشا پردازی کے زور سے اپنی مرضی کے مطابق ان کی تصویریں بنانے یا بگاڑنے سے احتراز کریں۔''

میں آخر میں واجب الاحترام بزرگ محقق جناب حکیم محمود احمد برکاتی کی مشفقانہ رہنمائی اور نامور فاضل جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کے مسلسل تعاون کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی بدولت میں نے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ آپ میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس سلسلہ میں برخوردار خالد اعجاز مفتی کی جدو جہد بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ ان کرم فرماؤں کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے بعض نادر مآخذ کی نشان دہی اور دستیابی میں میرے ساتھ پر خلوص تعاون کیا۔ نام لئے بغیر میں ان حضرات کا بھی شکریہ ادا کرنے میں بخل سے کام نہیں لوں گا جنہوں نے اس پراجیکٹ کو اپنی دانشوری کی بنیاد میں رخنہ سمجھ کر مجھے مختلف طریقوں سے مایوس کر کے اس کام سے باز رکھنے کی بالواسطہ کوشش کی مگر ان کی انہی منفی کوششوں نے میرے عزائم کو مزید تقویت بخشی۔ دراصل اس قسم کے لوگوں کے رویہ نے ہی مجھے اس کام پر مائل کیا تھا لہٰذا میں انہیں بھی ایک حد تک اس کی تکمیل میں بالواسطہ طور پر شریک سمجھتا ہوں۔

الحقائق' آصف بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور

ضیاء الدین لاہوری

حوالہ جات

۱- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸ مئی ۱۸۷۸ء، ص ۵۷۳

۲- جام جم، ص ۹

۳- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۴ اگست ۱۸۷۶ء، ص ۴۷۶

۴- حیات جاوید (۱)، ص ۳۹

۵- ایضاً، ص ۱۷

۶- ایضاً، ص ۴۸

۷- سیرت فریدیہ، ص ۱۶-۱۸

۸- ایضاً، ص ۲۹

۹- ایضاً، ص ۲۴

۱۰- لائل محمڈنز آف انڈیا (۱)، ص ۱۱

۱۱- سیرت فریدیہ، ص ۲۶

۱۲- ایضاً، ص ۲۶-۲۸

۱۳- لائل محمڈنز آف انڈیا (۱)، ص ۱۲

۱۴- سرکشی ضلع بجنور، ص ۶۷

۱۵- لائل محمڈنز آف انڈیا (۱)، ص ۱۷

۱۶- دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں، ص ۱۷۹

۱۷- تذکرہ وقار، ص ۲۱۲

۱۸- کلیات نثر حالی (۲)، ص ۵۷

۱۹- تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۳۹

۲۰- مکتوبات سرسید، ص ۶۲۸

۲۱- دی پریزنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس، ص ۶۲

مذہبی معتقدات

الہامی و دینی کتب

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت:

قرآن مجید کو ہم وحی متلو یا خدا کا کلام یقین کرتے ہیں مگر جب وہ انسانوں کی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ طرز پر وحی ہوا ہے تو اس لئے ہم اس کو اس زمانہ کے لٹریچر سے تعبیر کرتے ہیں، مگر وہ کلام ایسا بے نظیر اور بے مثل ہے کہ آج تک نہ کسی سے ویسا ہوا ہے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ نہ مثل اس کے آئندہ ہو سکتا ہے۔[1]

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ قرآن مجید نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر واقع ہے...... مگر یہ بات کہ اس کی مثل کوئی نہیں کہہ سکا یا کہہ سکتا، اس کے من اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کسی کلام کی نظیر نہ ہونا اس بات کی تو بلاشبہ دلیل ہے کہ اس کی مانند کوئی دوسرا کلام موجود نہیں ہے مگر اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ بہت سے کلام انسانوں کے دنیا میں ایسے موجود ہیں کہ ان کے مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہوا مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے...... قرآن گو کیسا ہی فصیح ہو مگر جو معارضہ ہے وہ اس کی فصاحت و بلاغت یا اس کی عبارت کے بے نظیر ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس کے بے مثل ہادی ہونے میں ہے۔[2]

قرآن مجید کی فصاحت بے مثل کو معجزہ سمجھنا ایک غلط فہمی ہے فاتو بسورۃ من مثلہ کا یہ مقصد نہیں ہے۔[3]

---

[1] آخری مضامین، ص ۱۳ [2] تفسیر القرآن (۱)، ص ۳۳ [3] تصانیف احمدیہ، حصہ ا، جلد ا، ص ۲۱

ہمارے قدمانے صرف ایک اوپری دلیل اس کے معجز ہونے کی قرار دی تھی یعنی فصاحت اور کلام کی عمدگی، اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آج تک کسی بشر سے، نہ کسی فصیح و بلیغ سے اس کی ایک یا دس آیتوں کے برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا، باوجودیکہ ان سے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہہ لاؤ۔ بلاشبہ میں بھی قرآن مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں اور کیوں نہ تسلیم کروں جب کہ میں یقین کرتا ہوں کہ وہ خدا کا کلام اور وحی متلو ہے، اس کے الفاظ وہی ہیں جو خدا کی طرف سے رسولؐ کے دل میں ڈالے گئے تھے اور رسولؐ کی زبان سے ہم لوگوں تک پہنچے، اور میں یہ بھی قبول کرتا ہوں کہ آج تک کسی بشر سے مثل اس کے نہیں کہا گیا مگر اس دلیل کو ایک خام دلیل سمجھتا ہوں اور جو الفاظ قرآن مجید میں اس امر کی نسبت آئے ہیں ان کا یہ مطلب قرار نہیں دیتا ہوں۔[1]

تفسیر قرآن مجید بمقابلہ جدید علوم

ہمارا قول ہمیشہ سے یہ ہے کہ قرآن مجید کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ جو اس کا مقصد ہے وہ ہر زمانے اور ہر درجہ علم میں یکساں ہوتا ہے۔[2]

بعض ناسمجھ یہ بحث کرتے ہیں کہ جو تفسیر...... تم نے بیان کی، بدوان عرب اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین بھی ان آیتوں کی یہی تفسیر سمجھتے تھے یا نہیں؟ مگر ایسی حجت کا پیش لانا اصل بات کو نہ سمجھنے کا باعث ہے۔[3]

سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن مجید کو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ان امور سے جو لوگوں کے دل میں منقش تھے یا ان رسوم سے جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں، بشرطیکہ مخالف اس مقصد کے نہ ہوں جس کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، کچھ بحث یا تعرض نہیں تھا اور اسی لئے اسی طرح ان کو چھوڑ دیا جس طرح پر کہ وہ تھے۔[4]

ترقی علوم خود اس امر کا تصفیہ کرنے والی تھی اور قرآن مجید کا مقصد اس سے زیادہ اعلیٰ اور افضل تھا اور ہرگز مصلحت نہ تھی کہ خدا ایسے باریک مسئلہ کو ان بدوؤں اونٹوں کے چرانے

---

[1] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۲۹۲ [2] مقالات سرسید (۴)، ص ۵۴ [3] ایضاً، ص ۵۶
[4] آخری مضامین، ص ۴۲

والوں کے سامنے یا ان عالموں کے سامنے جن کے علم و تجربہ نے کافی ترقی نہیں کی تھی بیان کر کے لوگوں کو پریشانی میں ڈالتا اور تعلیم اخلاق کو جو اصلی مقصد مذہب کا تھا' ایسے دقیق مسائل میں ڈال کر برباد کر دیتا۔[۱]

اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن مجید میں بندوں کی زبان میں اور ان ہی کے محاورات کے موافق کلام کرتا ہے اور جب ان کو کسی محسوس چیز سے ہدایت کرتا ہے یا محسوسات سے اپنے کمال قدرت کو ثابت کرتا ہے تو ان ہی کے خیالات کے موافق اور جس طرح کہ وہ شے محسوس ہوتی ہے اسی کے مطابق کلام کرتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر ایسے موقع پر خیالات کی تبدیلی اور حقائق اشیا کے سمجھانے پر متوجہ ہوتو اصلی مقصد روحانی تربیت کا فوت ہو جائے۔[۲]

پس اگر موسیٰ کو کوئی ٹرگنا میٹری (Trignometry)[★1] کا قاعدہ نہ آتا ہو اور اس نے اس کے بیان میں غلطی کی ہو تو اس کی نبوت و صاحب وحی و الہام ہونے میں نقصان نہیں آتا کیونکہ وہ ٹرگنا میٹری یا اسٹرانومی (Astronomy)[★2] کا ماسٹر نہیں تھا۔ وہ ان امور میں تو ایسا ناواقف تھا کہ ریڈسی (Red Sea)[★3] کے کنارہ سے کنعان تک کا جغرافیہ بھی نہیں جانتا تھا اور یہی اس کا فخر اور یہی دلیل اس کی نبی اولوالعزم ہونے کی تھی۔[۳]

کتب الہامی اخلاقی و روحانی تربیت سے علاقہ رکھتی ہیں۔ پھر بالفرض اگر کسی الہامی کتاب میں اقلیدس اور جرثقیل کے دلائل یا علم ہیئت کے مسائل کے بیان میں غلطی ہو تو کیوں وہ غلط مانی جائے کیونکہ وہ الہام اس سے متعلق نہیں۔ یہی سبب ہے کہ سچی کتب الہامی نے ان امور کی جو دیگر علوم سے علاقہ رکھتے تھے' کچھ بحث نہیں کی ہے بلکہ ان امور کے متعلق جو عامیانہ خیال عام لوگوں کے تھے ان کو اسی طرح چھوڑ کر ان کی اخلاقی تعلیم کو اختیار کیا ہے مگر لوگوں نے ناسمجھی سے ان کو حقائق محققہ قرار دیا ہے۔[۴]

خدا نے ان پڑھ بدوؤں کے لئے ان ہی کی زبان میں قرآن اتارا ہے۔ پس ہمیشہ قرآن مجید کے سیدھے سیدھے صاف صاف معنی لینے چاہئیں اور نکات بعد الوقوع اور کنایات

★1 علم مثلث ★2 علم فلکیات ★3 بحر احمر

۱۔ آخری مضامین، ص ۴۸ ۲۔ تفسیر السموت، ص ۸۷ ۳۔ مقالات سرسید (۱۳)، ص ۳۹۶

۴۔ ایضاً، ص ۳۹۷

قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ

فقہائے اسلام نے نہایت غلط قیاس اور بے جا استدلال سے اور صرف اپنے دل کے پیدا کئے ہوئے خیالات سے قرآن کی آیتوں کا اس طرح پر منسوخ ہونا قرار دیا ہے جو خدا کی شان اور قرآن کے ادب کے بالکل برخلاف ہے اور ہرگز مذہب اسلام کا وہ مسئلہ نہیں ہے اور نہ ان فقہا کے استنباط کے لئے کوئی دلیل ہے۔[1]

ہم ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتے اور یقین کرتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے اترا اور بے کم و کاست موجودہ قرآن میں، جو درحقیقت آں حضرت صلعم کے زمانہ حیات میں تحریر ہو چکا تھا، موجود ہے اور کوئی حرف بھی اس سے خارج نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہے۔[2]

ہم نے تمام قرآن میں کوئی ایسا حکم نہیں پایا اور اس لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے۔[3]

اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ان تمام آیتوں کو جن سے مفسرین اور فقہا نے قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونے دعویٰ پیش کیا ہے، مجموعی طور پر سامنے رکھ لیا جائے اور ان پر غور و تعمق کی نظر ڈالی جائے اور ان کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جائے تو ان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیتیں شرائع سابق انبیا کے بعض احکام سے تبدیل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں، نہ قرآن مجید کی آیتوں کے باہم ناسخ و منسوخ ہونے سے۔[4]

توریت اور انجیل میں تحریف

جو لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات ہے کہ زبور کے آنے سے توریت اور انجیل کے آنے سے زبور اور قرآن کے آنے سے انجیل اس مراد سے منسوخ ہو گئی کہ ان میں کچھ نقص تھا، یہ ان کی سمجھ محض غلط ہے۔ نہ ہم مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات ہے، نہ ہمارا یہ اعتقاد ہے، اور اگر کوئی جاہل مسلمان اس کے برخلاف کہے تو وہ اپنے مذہب اور

---

[1] تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۶۵ [2] ایضاً، ص ۱۴۳ [3] ایضاً، ص ۱۶۷ [4] آخری مضامین، ص ۲۶

اپنے مذہب کے احکام سے واقف نہیں۔[1]

میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کی ہے اور نہ علمائے مقدمین و محققین اس بات کے قائل تھے، مگر علمائے متاخرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف وتبدیل کی ہے۔[2]

مسلمانوں کے مذہب میں تحریف سے کتب مقدسہ میں ان کی عبارتوں کا تغیر وتبدیل کرنا مرادنہیں ہے بلکہ زبانی لوگوں کو بدل کر لفظ پڑھ سنانے یا کلام الٰہی کو اخفا کرنا یا احکام الٰہی کو بدلنا یا کلام الٰہی کے غلط معنی اور غلط تاویلیں بیان کرنا مراد ہے۔[3]

ہم مسلمانوں کے مذہب بموجب اس توریت کے اصلی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ یہی توریتیں ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں مروج تھیں اور باوجودیکہ یہودیوں کو تحریف کا بڑا الزام دیا گیا تھا مگر اس بات کا الزام، کہ یہ توریت اصلی نہیں ہے، کبھی نہیں دیا گیا۔[4]

بعض دیندار علماء مسیحی نے اگر کچھ لفظی تغیر وتبدیل کی تو وہ بھی وہ تحریف، جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے، ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ لوگ یقینی جانتے تھے کہ اس کے صحیح اور اصلی اور سچے معنی وہی ہیں جس طرح ہم نے لفظوں کو بدلا ہے حالانکہ قرآن مجید میں جس تحریف کا ذکر ہے وہ ایسی تحریف نہیں ہے بلکہ وہ اس تحریف کا ذکر ہے جس کو وہ لوگ جانتے تھے کہ صحیح اور سچا اور اصلی مطلب یہ نہیں ہے جو ہم بیان کرتے ہیں اور پھر دیدہ ودانستہ اس میں تحریف کرتے تھے اور جان بوجھ کر غلط عبارت پڑھتے تھے یا غلط معنی بیان کرتے تھے۔[5]

کتب احادیث کی روایات

تمام کتب احادیث اور بالتخصیص کتب تفاسیر اور سیر اس قسم کی روایات کا مجموعہ ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح اور قابل تسلیم اور ناقابل تسلیم حدیثیں اور روایتیں مندرج ہیں۔[6]

---

۱ تبیین الکلام (۱)، ص ۲۶۸ ۲ تفسیر القرآن (۱)، ص ۴ ۳ تبیین الکلام (۱)، ص ۹۱ ۴ ایضاً (۲)، ص ۱۶ ۵ ایضاً (۱)، ص ۶۹ ۶ آخری مضامین، ص ۱۳۰

ہیں اور جن میں سے کتب مفصلہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

''ابن اسحاق، ابن ہشام، طبقات کبیر المشہور بہ واقدی، طبری، سیرت ہشامی، ابوالفدا، مسعودی، مواہب لدنیہ۔''

ان کے سوا عربی اور فارسی زبان میں اور بھی کتابیں ہیں جو ان ہی سے بنائی گئی ہیں۔ ان ک
میں سے پہلی چار کتابیں بہت قدیم ہیں اور باقی بہت پچھلی۔ یہ سب کتابیں تمام سچی او
روایتوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مختلط مجموعہ ہے جس میں صحیح اور غلط، مشتبہ اور درس
جھوٹی اور سچی کسی کا کچھ امتیاز نہیں اور جو کتابیں زیادہ قدیم ہیں ان میں اس قسم کا اختلا
زیادہ ہے۔[1]

میرے نزدیک سیرت ہشامی اور ابن اسحاق وغیرہ سب واہیات اور الف لیل
مہابھارت کے برابر ہیں۔ بلاشبہ میں ان کتابوں کو نہایت غیر معتبر جانتا ہوں۔ ہزا
روایتیں غلط اور بے سند اُن میں مندرج ہیں۔[2]

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بھی تمام تصانیف ان ہی نامعتمد کتابوں پر مبنی ہیں
واقدی، ہشامی، مولود نامہ، معراج نامہ...... میں بجز بے ہودہ باتوں کے اور کچھ
ہے۔[4]

واقدی کچھ بڑا معتبر شخص نہیں ہے۔ وہ تو حاطب اللیل یعنی اندھیری رات میں لکڑ
چننے والا ہے۔ اس کی غلط روایتوں اور جھوٹے قصہ اور کہانیوں اور بے سند باتوں سے تما
نے اس کو نامعتبر ٹھہرایا ہے۔ محمد بن عبدالباقی الزرقانی.... کی کتابیں موجود ہیں جو کچھ بھی
قیمت کے لائق نہیں، بجز اس کے کہ جو افواہ اس نے سنا اور جو آواز چڑیا کی خواہ کوے کی اس
کان میں آئی وہ اس نے لکھ دی، کوئی طریقہ تحقیق کا اور کوئی راستہ تنقیح کا اس نے اختیا
کیا۔[5]

غرض کہ اب فن سیر کی تمام کتابیں، کیا قدیم کیا جدید، مثل ایسے غلہ کے انبار کے
جس میں سے کنکر، پتھر، کوڑا کرکٹ کچھ چنا نہیں گیا اور ان میں تمام صحیح و موضوع، جھوٹی او

---

۱ خطبات احمدیہ، ص ۸ ۲ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۳۵ ۳ ایضاً، ص ۱۷۶ ۴ خطبات احمد
۵ ایضاً، ص ۹

ـاور بے سند' ضعیف و قوی' مشکوک و مشتبہ روایتیں مخلوط اور گڈمڈ ہیں۔[1]

وہ (روایتیں) الف لیلہ و قصہ حاتم طائی سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، اس لئے کہ اپنے
ـت کے لئے بالکل محتاج دوسری سند یا دلیل یا کسی اور وجہ قابل اعتماد کی ہیں۔ پس اگر وہ
ـیتیں اور کتابیں ہمارے مذہب کی بنیاد قرار پائیں اور ان پر مسائل مذہب کا مدار ٹھہرے تو
ـمانی مذہب تو لونڈوں کا کھیل اور دیو پری کا قصہ ہو جائے گا' **نعوذ بالله منها**۔[2]

اگر ان کتابوں کو ہم استنباط مسائل مذہبی میں دخل دیں تو ہم صاف صاف ہندوؤں کے
ـد ہوں گے جنہوں نے مہابھارت کو اپنے ہاں کتب مقدسہ میں داخل کرلیا ہے۔[3]

مسلمان مورخوں نے جو کتابیں اسلام کی تاریخ کی لکھی ہیں' خواہ وہ سنی عالموں کی لکھی
ـی ہوں یا شیعہ عالموں کی' لغویات و مہملات اور جھوٹے قصوں اور موضوع روایتوں سے بھری
ـی ہیں اور غلو مذہبی نے اور اختلاف مذہبی نے ان کو زیادہ تر بدنما اور درجہ اعتبار سے ساقط کر
ـہ ہے بلکہ اصلی واقعات کو ایسا خراب کیا ہے کہ ان کی اصلی حالت دریافت کرنی مشکل ہے۔[4]

فروعات حنفیہ میں سے ایک کتاب ''درمختار'' ہے جو ۱۰۷۱ ہجری یا ۱۶۶۰ء میں لکھی گئی تھی
ـفروعات حنفیہ میں سے یہ کتاب نہایت معتبر اور معتمد علیہ ہے۔ اس کتاب میں چند اشعار
ـیہ اس مضمون کے درج ہیں جن میں فروعات حنفیہ کو اور ائمہ کی فروعات پر ترجیح دی ہے اور
ـوں کو برا لکھا ہے۔ انہی شعروں میں سے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے:

''خدا کی لعنت اور قہر بے شمار اس شخص پر جو امام ابوحنیفہ کا پیرو نہیں ہے۔''[5]

اجتہاد اور فقہ

ـہ کی تدوین

حدیث کے بعد مقدس علم فقہ کا ہے۔ ائمہ مجتہدین کے زمانے سے پہلے ہر ایک شخص
ـیث پر' جو اس کو پہنچی تھی' یا تعامل پر عمل کرتا تھا۔ اس زمانے کے [illegible]

ـطبات احمدیہ، ص ۸ ۲؎ ابطال غلامی، ص ۱۵۵ ۳؎ ایضاً، ص ۱۵۶ ۴؎ [illegible] ۲۱۸
ـریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۱۶

میں لکھی گئی تھیں اور جو مطلب ان کا وہ سمجھتا تھا یا جس کو عالم اور مقدس سمجھتا تھا اس کی سمجھ کرتا تھا۔[1]

اگلے زمانہ کے نیک اور متدین، مگر مذہب کی طرف زیادہ متوجہ، عالموں نے یہ خ کہ جہاں تک ہو سکے ہر ایک کام کسی مذہبی سند پر کیا جائے۔ پس جو واقعہ یا امر پیش آتا ا لئے فکر کرتے کہ اس کو کس مذہبی سند سے متعلق کریں اور پھر خواہ کھینچ تان کر اور تاو یا استدلالات دوراز کار کر کے کسی نہ کسی سند سے متعلق کر دیتے تھے یا کسی اصول عام کے، خود ان ہی نے قائم کیا تھا، تابع کر دیتے تھے۔ ان علما کے اقوال و استدلالات رفتہ رفتہ ہونے لگے جن کی بدولت کتب فقہ و اصول فقہ ہمارے ہاں پیدا ہو گئیں۔ اس زمانہ میں لوگ ان علما کے اقوال و استدلال کو ایک رائے سے زیادہ رتبہ کا نہیں سمجھتے تھے مگر رفتہ رفتہ علما کے اقوال بطور سند کے تصور ہونے لگے اور پھر ایک زمانہ کے بعد وہی مذہب اسلام اور شرع اس کا نام ہو گیا اور غیر مذہب والوں نے شرع محمدی اس کا نام رکھا۔[2]

اس معصوم، سیدھے سادے، سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا تعالیٰ کے بہت سدھاوٹ و صفائی و بے تکلفی سے جاہل، ان پڑھ، بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہنچائے۔ میں وہ نکتہ چینیاں باریکیاں گھسیڑی گئیں اور وہ مسائل فلسفیہ اور منطقیہ ملائی گئیں کہ ا اس صفائی اور سدھاوٹ اور سادہ پن کا مطلق اثر نہیں رہا۔ یہ مجبوری لوگوں کو اصلی احکا قرآن و معتمد معتمد حدیثوں میں تھے، چھوڑنا پڑا اور زید و عمر کے بنائے ہوئے اصول کی کرنی پڑی۔[3]

تقلید کا عمل

اہل سنت و جماعت میں چار امام مقبول ہوئے اور جو امام جس شہر یا نواح شہ وہاں کے لوگ یا جو اس کے شاگرد تھے اسی کی رائے پر چلتے تھے۔ رفتہ رفتہ تقلید کا زور ہ علم نے قرآن و حدیث پر غور کرنا اور اس سے مسائل کا استخراج کرنا چھوڑ دیا اور جو مجتہدین نے کہا اسی پر اکتفا کیا۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے مادہ اجتہاد کا زوال ہ

[1] آخری مضامین، ص ۱۲ [2] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۴۹ [3] ایضاً، ص ۴۹۱ [4] آخری مضامی

یہ بات سچ ہے کہ ہم کو متعدد مسائل میں مسلمانوں سے اختلاف ہے۔ ہم تقلید کو تسلیم نہیں کرتے، مذہب کو تقلیداً قبول کرنے سے تحقیقاً اس پر ایمان لانا بہتر جانتے ہیں اور اسی طرح اور بہت سے مسائل اعتقادی و تمدنی ہیں جن سے یا جن کے طرز بیان و طریقہ استدلال سے ہم کو اختلاف ہے۔[۱]

جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علما کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔[۲]

ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پائے اس پر عمل کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور سمجھ کا پابند نہیں ہے...... ہر شخص آپ اپنے لئے مجتہد ہے۔[۳]

اس زمانہ میں ایک فرقہ ہے جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتا ہے اور اس کے مخالف اس کو وہابی کہتے ہیں۔ وہ فرقہ تقلید کا منکر اور عمل بالحدیث کا قائل ہے مگر وہ بھی تقلید میں پھنسا ہوا ہے اس لئے کہ اس نے حدیث مجتمعہ میں درایت کو چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کو حرام سمجھتا ہے اور حدیثوں کی نسبت اگلے لوگ جو لکھ گئے ہیں اس کی تقلید کرتا ہے اور جس قدر لوگوں کی مقلدین ائمہ مجتہدین تقلید کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ لوگوں اور راویوں کی یہ فرقہ تقلید کرتا ہے۔[۴]

اس زمانہ میں ہر ایک کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مگر اب نہ پہلے سے عالم ہیں اور جو ہیں، کیا مقلد اور کیا اہل حدیث، سب تقلید کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان میں مادہ اجتہاد و تحقیق معدوم ہو گیا ہے۔ پس ہر ایک اپنی لکیر پر فقیر ہے اور کولھو کے بیل کی مانند اسی حلقہ میں چکر کھاتا جاتا ہے جس حلقہ میں اس کو آنکھ بند کر کے ہانکا تھا۔[۵]

اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنی مکنونات ضمیر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے، نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان

---

۱ مقالات سرسید (۱۰)، ص ۲۰۷ ۲ خطوط سرسید، ص ۱۰۰ ۳ خطبات احمدیہ، ص ۱۸۴

۴ آخری مضامین، ص ۱۷ ۵ ایضاً، ص ۱۹

سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا اور تقلید کی پروانہیں کرتا ورنہ...... میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں ہونے کے لئے ائمہ کبار درکنار مولوی جٹو کی بھی تقلید کافی ہے۔[1]

میں سچ اپنے دل کا حال کہتا ہوں کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی۔ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔[2]

میں خیال کرتا ہوں کہ جیسا مجھ کو مسلمانی مذہب کی سچائی پر یقین ہے، بہت کم مسلمان ہوں گے جن کو ایسا یقین ہو اس لئے کہ میں نے بطور ماں باپ کی تقلید کے نہیں بلکہ بقد طاقت کے تحقیق کر کے مسلمانی مذہب کے اصولوں کو تمام مذاہب معلومہ کے اصولوں سے اور عمدہ اور سچا خیال کیا ہے۔[3]

سوائے رسول خدا صلعم کے کسی کی تقلید واجب نہیں ہے اور سوائے رسول خدا صلعم کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا قول و فعل دینیات میں بلا دلیل حجت ہو، اور جو شخص کسی سمجھے وہ مشرک فی النبوت ہے۔[4]

میں جو اسلام کو ابو حنیفہ و شافعی سے زیادہ دوست رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ابو شافعی تو درکنار ابو بکرؓ و عمرؓ بھی بالفرض اگر کچھ غلطی کریں تو بھی اسلام میں کچھ نقصان نہیں سکتا۔[5]

اگر بالفرض تمام اجتہادات و استدلالات حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں ثابت ہو جائے تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں آتا۔ وہ جیسا خدا کے ہاں سے اترا ویسا پاک وصاف ہے۔[6]

نئے مجتہد کی ضرورت

مذہب شیعہ امامیہ کا نہایت صحیح اور سچا مسئلہ ہے کہ ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضرور ہے۔ زمانہ مجتہد العصر سے خالی نہیں ہوتا...... مگر متاخرین اہل سنت و جماعت نے عجیب غلط مسئلہ ہے کہ اجتہاد ختم ہو گیا اور اب کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا۔ مگر اب تک ان کو اس میں شبہ ہے کہ نعوذ

---

۱ خطوط سرسید، ص ۷۲ ۲ ایضاً، ص ۹۳ ۳ مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۲۸۱ ۴ تہذیب الاخلاق، ص ۳۴۴ ۵ خطوط سرسید، ص ۷۲ ۶ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۴۹

نہا مثل خاتم النبیین کے خاتم المجتہدین کون ہے؟ کسی نے زید کو اور کسی نے عمرو کو بتلایا ہے۔[1]
کیسی بڑی غلطی اہل سنت و جماعت کی ہے کہ اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم مانتے ہیں۔
س غلطی اعتقاد نے ہم مسلمانوں کے دین و دنیا میں نہایت نقصان پہنچایا ہے، اس لئے ہم کو
ضرور ہے کہ ہم اس خیال کو چھوڑیں اور ہر بات کی تحقیق پر مستعد ہوں، خواہ وہ بات دین کی ہو یا
نیا کی۔ غور کرنا چاہیے کہ ہر گاہ زمانہ حادث ہے اور نئے نئے امور اور نئی نئی حاجتیں ہم کو پیش
تی ہیں، پس اگر ہمارے پاس زندہ مجتہد موجود نہ ہوں گے تو ہم مردہ مجتہدوں سے نئی بات کا
مسئلہ، جو ان کے زمانہ میں حادث بھی نہیں ہوئی تھی، کیونکر پوچھیں گے؟ پس ہمارے لئے بھی
مجتہد العصر والزماں کا ہونا ضرور ہے۔[2]

مسلمانوں کے بعض فرقے

فرقوں کا آغاز

یہ مسئلہ اسلام کا نہیں ہے کہ مذہب اسلام میں تہتر فرقے ہیں اور ناجی ان میں سے ایک ہی ہے۔ یہ تو ایک موضوع روایت ہے جس کو اس زمانہ کے لوگوں نے، جب کہ مسلمانوں میں باہم مسائل فروعی میں اختلاف پڑا، اپنی تائید کے لئے بنا لی ہے۔ اس روایت کا موضوع ہونا روایتاً و درایتاً محققین کے نزدیک ثابت ہے۔[3]

مذہب اسلام ابتدا میں بہت سے برسوں تک ایک ایسا مذہب رہا جس کا منشا صرف ذات باری کی پرستش تھی مگر سنہ ہجری کی دوسری صدی میں جبکہ اس کے اصول کی نسبت علما کے خیالات قلم بند ہوئے تو اس کے چار فرقہ قائم کئے گئے یعنی حنفی و شافعی و مالکی و حنبلی، اور کچھ عرصہ تک مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل رہا کہ ان فرقوں میں سے جس کسی کے مسئلہ کو چاہیں پسند کریں اور اس کی پیروی کریں۔ لیکن جب بنی امیہ اور بنی عباس بادشاہ ہوئے تو انہوں نے ایک حکم تمام مسلمانوں کے نام اس مضمون کا جاری کیا کہ وہ ان چار فرقوں میں سے کسی ایک فرقہ کے تمام مسئلوں کو قبول کر لیں، چنانچہ بعد اس حکم کے جو لوگ اس کے خلاف کرتے تھے ان کو سزا دی

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲) ص ۱۹۵ [2] ایضاً ص ۱۹۶ [3] ایضاً، ص ۳۹۲

جاتی تھی۔ چنانچہ اس جبری حکم کے باعث سے آزادانہ رائے کا اظہار مسدود ہو گیا اور
دست اندازی کا بڑا زور شور ہوا مگر اس وقت میں بھی بہت سے آدمی ایسے تھے جو خفیہ
مذہب کے پابند تھے اور ظاہر ان کی یہ جرات نہ تھی کہ سوائے چند معتمد آدمیوں کے کسی
رائے کا اظہار کریں۔ اور ایسے لوگ اس زمانہ میں اہل حدیث کہلاتے تھے جو حضرت رسول
کے قول کے معتقد تھے اور مندرجہ بالا چاروں فرقوں کے مسلکوں کے پابند نہ تھے۔[1]

وہابی فرقہ کی وجہ تسمیہ

عرب میں ایک ملکی لڑائی برپا ہوئی چنانچہ عبدالوہاب بادشاہ نجد کے بیٹے نے
مخالفوں کو شکست دی اور خاص اپنے پیدا کئے ہوئے تخت پر بیٹھا مگر اس کا عقیدہ وہی تھا ج
حدیث کا تھا اور چونکہ وہ اپنے عہد میں سب سے زیادہ قوت رکھتا تھا لہٰذا اس نے اعلانیہ
مذہب کے عقائد کی ہدایت کی اور جہاں تک ہو سکا ان کو جاری کیا۔ اس کی وفات کے بع
کے عقیدہ کا ایک اور بادشاہ تخت نشین ہوا جس نے اپنے جلوس کے بعد بہت جلد مکہ معظ
زیارت کی تیاری کی لیکن جس وقت اس نے مکہ معظمہ کے شریف سے اپنے عقیدہ کے بمو
زیارت کرنے کی اجازت چاہی تو اس نے اس کی درخواست کو قبول نہ کیا۔ اس وقت اس با
نے کہا کہ کسی شخص کو یہ استحقاق حاصل نہیں ہے کہ مجھ کو مکہ میں جانے سے روکے۔ چنانچہ وہ
گھس گیا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں کو فتح کر لیا۔ بعد اس کے اس نے ان تمام دستو
اور رسموں کو موقوف کیا جو خالص مذہب اسلام میں لوگوں کی طرف سے داخل ہو گئی تھیں، او
چار نشان اس درگاہ مقدس کے اندر گویا ان چاروں فرقوں کے پیروؤں کے واسطے بنائے
تھے ان کو اور بعض اولیاء اللہ کی قبروں کو، جن کو بہت لوگ بمنزلہ بت کے پوجتے تھے، توڑ ڈالا۔
جس کے سبب سے جاہل قوم ترک اور عبدالوہاب کے معتقدوں کے درمیان ایک سخت عداو
پیدا ہو گئی۔ پس اس زمانہ سے عبدالوہاب کے پیرو بجائے اہل حدیث کے وہابی کہلانے لگے

---

[1] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۱۱ [2] ایضاً، ص ۱۳

ہندوستان کے وہابی اور انگلش گورنمنٹ

ہم کو تو اس بات کی کہ لوگوں نے کسی کا کیا نام رکھا ہے کچھ پروا نہیں کرتے مگر جناب مولانا مولوی ابوسعید محمد حسین کو وہابی نام ہونا گوارا نہ تھا۔ انہوں نے گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ اس فرقے کو جو درحقیقت اہل حدیث ہے اور لوگوں نے از راہ ضد و حقارت کے اس کا نام وہابی رکھ دیا ہے' گورنمنٹ اس کو وہابی کے نام سے مخاطب نہ کرے۔ مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب کو اس نام کے گوارا نہ ہونے کی ایک معقول وجہ بھی تھی ان واقعات کے سبب سے جو اسماعیل پسر عبدالوہاب کے زمانے میں حجاز میں گزرے تھے جو اپنے باپ عبدالوہاب کے مسائل کا معتقد تھا جس کی طرف اس فرقے کو منسوب کیا جاتا ہے۔ ان واقعات کے سبب سے سلطان ترکی اس فرقے کو مخالف بھی سمجھتا تھا۔ وہی خیال ترکوں کا بذریعہ ان تاریخوں کے' جو انگریزی زبان میں وہابیوں کے حالات میں تحریر ہوئیں' ہندوستان کے انگریزوں میں آیا اور بعض واقعات مشتبہ' جو ہندوستان کی سرحد پر گزرے' ان سے اس خیال کو زیادہ تقویت ہوگئی اور ان اسباب سے وہابی کے لفظ میں ایک مفہوم مخالف سلطنت ہونا بطور ایک جزو اس کے معنوں کے سمجھا جانے لگا حالانکہ یہ خیال محض غلط تھا۔ وہابیت کو سلطنت کی مخالفت سے کچھ تعلق نہ تھا اور بلاشبہ گورنمنٹ کی طرف سے کسی فرقے کی نسبت ایسے لفظ کا استعمال کرنا' جس کے معنی میں مفہوم مخالف سلطنت شامل ہو گیا ہو' مناسب نہ تھا اور مولوی محمد حسین صاحب کو اس کا گوارا نہ کرنا نہایت بجا تھا۔ ہم کو امید ہے کہ وہ فرقہ جس کو لوگ وہابی کہتے ہیں اور جو اپنے عقائد اور مسائل مذہب میں نہایت سخت اور بہت پختہ ہے اور خدائے واحد کے سوا ظاہراً و باطناً وحیلۃً و صریحۃً اور کسی کی طرف التجا نہیں کرتا وہ اس مسئلے پر بھی نہایت پختہ ہے کہ جس سلطنت میں وہ لوگ بطور رعیت کے رہتے ہیں کبھی اس سلطنت سے مخالفت نہیں کر سکتے خواہ وہ سلطنت عیسائیوں کی ہو یا یہودیوں کی یا بت پرستوں کی' یہاں تک کہ اگر اس سلطنت میں مذہبی آزادی نہ ہو تو اس سلطنت سے ان کو ہجرت کرنا لازم ہوتا ہے مگر مخالفت کرنا جائز نہیں ہوتا۔ انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اس فرقے کے لئے' جو وہابی کہلاتا ہے' ایک رحمت ہے۔ جس طرح ہندوستان میں کل مذاہب کے لوگوں کو کامل مذہبی آزادی ہے' جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں

ان میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادی مذہب ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری
وہابی رہنا مشکل ہے اور مکہ معظمہ میں تو اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی وہابی کہہ دے تو اسی وقت
خانے یا حوالات میں بھیجا جاتا ہے گو وہ کیسا ہی مقدس اور نیک مولوی ہو یا سی ایس آئی
وہابی جس آزادی مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں رہتے ہیں دوسری جگہ ان
میسر نہیں۔ ہندوستان ان کے لئے دارالامن ہے۔ پس وہابیوں کی نسبت یہ خیال کہ ان
سلطنت کے مخالف ہونا لازمی ہے' ایک غلط خیال تھا۔ غرض کہ مولوی محمد حسین کی کوشش
گورنمنٹ نے منظور کرلیا کہ آئندہ سے گورنمنٹ کی تحریرات میں اس فرقے کو وہابی کے
سے تعبیر نہ کیا جائے بلکہ اہل حدیث کے نام سے' جس کا نام وہ فرقہ اپنے تئیں مستحق سمجھتا
موسوم کیا جائے۔[1]

وہابیت اور متعصب وہابی

میری دانست میں تمام دنیا کے باشندوں نے شاید وہابیت کے اصلی معنی کو بہت ہی
سمجھا ہے اور اس کی اصلیت کو اس طرح پر بیان کرنا کہ وہ عوام کی سمجھ میں بھی بخوبی آ جا
نہایت مشکل ہے۔ میری دانست میں جو نسبت مذہب پروٹسٹنٹ والے کو رومن کیتھولک
ساتھ ہے وہی نسبت ایک وہابی کو اسلام کے اور فرقوں کے ساتھ ہے۔[2]

وہابی اپنے مذہب میں بڑے پکے اور نہایت سچے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اصول سے کسی
حال میں منحرف نہیں ہوتے۔[3]

میں اس بات کو بلاشبہ تسلیم کرتا ہوں کہ بعض وہابی ایسے متعصب ہوتے ہیں کہ وہ صرف
کافروں ہی کو نہیں بلکہ ان مسلمانوں کو بھی ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں جو اُن کے عقیدہ کے خلاف
عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور خود وہ اہل سنت و جماعت مسلمان بھی جو وہابی نہیں ہیں' وہابیوں کے
نزدیک برے خیال کئے جاتے ہیں حالانکہ وہابی خود بھی اہل سنت کہلاتے ہیں۔ چنانچہ متعصب
وہابی ایسے لوگوں سے ملنے جلنے یا ان سے محبت رکھنے اور ان کے رنج و راحت میں شریک ہونے
بلکہ ان کے ساتھ نماز پڑھنے تک کو برا جانتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسے متعصب وہابی منافق

---

[1] آخری مضامین (طبع سوم)، ص ۱۵۹ [2] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۷ [3] ایضاً، ص ۲۸

لوگ ہیں اور ان کی رائیں سراسر غلطی پر مبنی ہیں اور ان کے ایسے قول وفعل خاص ان کی ہی ذات سے علاقہ رکھتے ہیں، کچھ وہ وہابیت کے اصول نہیں ہیں۔[۱]

بعض متعصب وہابی، جن کو میں یہود ہٰذا الامت سمجھتا ہوں اور جن کے تمام افعال صرف دکھلاوے کی باتوں پر منحصر ہیں اور جو انگریزی زبان پڑھنے کو حرام سمجھتے ہیں، انگریزوں اور کافروں سے صاحب سلامت کرنا گناہ جانتے ہیں، ان سے دوستی کفر سمجھتے ہیں، ان کی اہانت اور تذلیل کو بڑی دیانتداری جانتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کرنا کفر خیال کرتے ہیں، اگر اتفاقاً ان سے مصافحہ کی نوبت آ جائے تو ہاتھ دھو ڈالنا فرض کہتے ہیں، اگر دھوکے میں عیسائی سے صاحب سلامت ہو جائے تو جا کر اس سے یہ کہنا کہ میرا اسلام پھیر دے، اس کا کفارہ جانتے ہیں...... یہ متعصب وہابی وہ لوگ ہیں جو علوم کے بھی دشمن ہیں، فلسفہ کو وہ حرام بتلاتے ہیں، منطق کو وہ حرام کہتے ہیں، علوم طبیعات کا پڑھنا تو ان کے نزدیک کفر میں داخل ہے۔[۲]

وہابی بدعتی کشمکش

ہماری قوم عجیب حالت مذہبی میں گرفتار ہے۔ ہم اہل سنت و جماعت کا ذکر کرتے ہیں جن کے دوفرقے القاب وہابی و بدعتی ملقب ہیں۔ پہلے حضرت بلاشبہ عقائد میں نہایت درست اور قریب حق کے ہیں، الا ظاہری افعال اور سختی اور سنگ دلی اور قساوت قلبی اور تعصب پر اس قدر سرگرم ہیں کہ اندرونی نیکی ایک بھی ان میں نہیں رہی اور ٹھیک وہی حال ہے جو علماء یہود کا تھا جو دن رات ظاہری رسومات مذہبی میں مبتلا تھے۔ اور دوسرے حضرت اگرچہ نیکیوں کی جانب کسی قدر متوجہ ہیں، الا رسوم آبائی کے اس قدر پابند ہیں اور بدعات محدثہ کے اس قدر پیرو ہیں کہ رومن کیتھولک کے قدم بقدم ہو گئے ہیں بلکہ ان کو بھی مات کر دیا ہے۔[۳]

مسلمانوں کے بدعتی اور وہابی فرقوں میں حد سے زیادہ دشمنی ہے اور ان کی دشمنی کی مثال ایسی ہے جیسی کہ یورپ کے عام تہذیب کے زمانہ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان تھی۔[۴]

۱۔ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۲۷ ۲۔ مقالات سرسید (۱۰)، ص ۱۹۹ ۳۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۲۲
۴۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۶۷

یہودیوں کا بھی یہی حال تھا کہ محض ظاہری باتوں کو انہوں نے یہودیت سمجھ
کے ہاں کے علماء وفقہاء، جو ربی اور قوہن کہلاتے تھے، صرف ظاہری باتوں پر چلتے تھ
نے بھی اپنے ہاں دو فرقہ قائم کئے تھے، ایک صدوقی جیسے سنیوں میں اہل حدیث اور
شیعوں میں اخباری، دوسرا فروسی جیسے کہ سنیوں میں فقہی اور شیعوں میں اصولی۔ یہ دونو
ذرا ذرا سی باتوں پر بحث کرتے تھے اور اسی کو کمال دین داری جانتے تھے۔ اس بات
احتیاط کرتے تھے کہ بکرا اس قدر انگشت لمبی چھری سے تین رگڑوں میں ذبح ہو مگر ا
پروانہ تھی کہ آیا کہاں سے تھا! توریت کو بے طہارت چھونے اور بے لوبان جلائے کھو
بہت احتیاط ہوتی تھی مگر اس بات کی کہ اس میں لکھا کیا ہے، کچھ پروانہ تھا۔ چھاتی
توریت کے حروف مقطعات کا نقش لگانا نہایت ایمان اور اتقا کا کام سمجھتے تھے مگر جو
میں بھری ہوئی تھی اس کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ یہی حال بعینہٖ ہمارے زمانہ کے مقدس
ہے۔[1]

ہندوستان میں فرقہ بندی کی کیفیت

فروع مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس جبل
بندش کو توڑا ہے اور اس رشتۂ اخوت کو، جسے خود خدا نے قائم کیا تھا، چھوڑا ہے؟ جس قص
میں جاؤ، جس مسجد اور امام باڑے میں گزر ہو، ہم مسلمانوں کے شیعہ و سنی، وہابی و بدعتی، لا
مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے۔[2]

جب مسلمانوں کے دو گروہوں میں اختلاف ہوتا ہے تو یہ اختلاف صریح حرام
شے کی بابت نہیں ہوتا، البتہ مکروہ وغیر مکروہ یا مستحب و مباح کے درمیان ہوتا ہے۔[3]

اس زمانے میں سنی و شیعہ، وہابی و بدعتی، موحد و اہل حدیث جو اپنے تئیں بڑا دین
ہیں یہ خیال رکھتے ہیں کہ آپس میں مختلف خیالات کے لوگوں میں دوستی و ہمدردی اور
محبت و یگانگت ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کا دل خود تعصبات اور بدی و بد اخلاقی سے بھرا ہوا
اور ان کے دل میں بجز اپنے ہم مشرب کے اور کسی کی جگہ نہیں رہتی، اس واسطے وہ سوا

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۵۴ [2] سفرنامہ پنجاب، ص ۹ [3] مقالات سرسید (۱۳)، ص ۵۶۴

ہم مشرب کے اور سب سے عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں اور اس کو نہایت ثواب اور دین داری میں اپنا کمال سمجھتے ہیں مگر ہماری سمجھ میں انسان میں اس سے زیادہ کوئی بدی نہیں ہے۔[۱]

ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں، عہدوں میں کم ہیں، اگر پھر ان میں شیعہ وسنی وخارجی وناصبی اور وہابی وبدعتی کا تفرقہ پڑے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہے؟[۲]

ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے، جبکہ وہ خدا و خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت ومخالفت رکھنی نہیں چاہیے۔[۳]

اس بات پر بحث کرنے سے کہ فلاں رافضی ہے اور فلاں وہابی اور فلاں بے دین یا لامذہب، کچھ نتیجہ نہیں ہے۔ یہ تو بارہ سو برس سے ہوتی آئی ہے اور شاید یوں ہی ہوتی چلی جائے گی جب تک کہ وحدت کا زمانہ آئے گا۔[۴]

نیچری

اس زمانہ میں ایک اور فرقہ پیدا ہوا ہے جو اپنے تئیں ٹھیٹ مسلمان کہتا ہے..... اپنے مذہب کو ٹھیٹ اسلام کہتا ہے مگر اور لوگ ان کو حقارت سے طبیعین یا نیچری کہتے ہیں۔ وہ سب لقبوں سے، جو اُن کو دئے جائیں، خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ جو حقارت سے حقارت کا لقب ہم کو دیا جائے ہمارے مذہب یا عقائد کو اس سے حقارت نہیں ہوتی بلکہ اس حقیر لقب کو عزت اور اس میں برکت ہوجاتی ہے۔[۵]

وہ لوگ..... جو نیچر کے اور قانون نیچر کے قائل ہیں مگر یقین کرتے ہیں کہ ایک صانع یا خالق ہے جس نے نیچر اور قانون نیچر کو پیدا کیا ہے، اور کہتے ہیں کہ خود نیچرل سائنس ایک صانع کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو اگلے زمانے میں حکماء الٰہیین اور اس زمانے میں نیچر یمن یا ٹھیٹ مسلمان یا ٹھیٹ اسلام کے پیرو کہے جاسکتے ہیں۔[۶]

---

۱ بحوالہ برگِ گل، سرسید نمبر (۲)، ص ۳۴۶ ۲ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۶۰۶ ۳ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۶۷
۴ مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۹۴ ۵ النظر (باب سوم)، ص ۳-۴ ۶ مقالات سرسید (۴)، ص ۲۸

نیچر کے اصول

نیچر (Nature) ایک انگریزی لفظ ہے اور وہ ٹھیک مرادف ہے لفظ ”فطرۃ اللہ“ اور قانون قدرت کے۔[۱]

یہ لفظ ہم نے قرآن مجید سے اخذ کیا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ”فطر اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ۔[۲]

خدا سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ جس طرح اس نے آسمان و زمین و مافیہا تمام مخلوقات کو پیدا کیا اسی طرح اس نے نیچر کو بھی پیدا کیا۔[۳]

اس کا قانون قدرت کبھی ٹوٹتا نہیں۔ وہ ہر طرح کے قانون قدرت کے بنانے پر قادر ہے مگر جو قانون قدرت کہ اس نے بنادیا پھر اس کے برخلاف کچھ ہوتا نہیں۔[۴]

جو چیز انسان کی فطرت میں ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس کا بدل دینا خود انسان کی یا دوسرے انسان کی طاقت سے گو کہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو خارج ہے۔[۵]

خدا نے جو ہم کو پیدا کیا ہے اور ہمارے واسطے جو ہدایت بھیجی ہے وہ ہدایت بالکل ہماری خلقت، ہماری فطرت، ہمارے نیچر کے مطابق ہے اور یہی اس کی سچائی کی دلیل ہے۔[۶]

نیچر خدا کا فعل ہے اور مذہب اس کا قول اور سچے خدا کا قول و فعل کبھی مخالف نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضرور ہے کہ مذہب اور نیچر متحد ہو۔[۷]

پس جو مذہب کہ ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ان کی صداقت کی یہی معیار ہوسکتی ہے کہ اگر وہ مذہب فطرت انسانی یا نیچر کے مطابق ہے تو سچا ہے۔[۸]

اسلام بالکل فطرت کے مطابق ہے اور اس لئے میں نے کہا ہے کہ الاسلام ھو الفطرت و الفطرت ھو الاسلام بہت ٹھیک مسئلہ ہے۔[۹]

نیچر جس کو خدا نے ”فطرت“ کہا ہے اسلام کا دوسرا نام ہے۔[۱۰]

---

۱ تہذیب الاخلاق (۲) ص ۳۲۸ ۲ مقالات سرسید (۳) ص ۲۹۹ ۳ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۹۸
۴ تہذیب الاخلاق (۲) ص ۱۸۲ ۵ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۸۸ ۶ ایضاً، ص ۱۹۷ ۷ تہذیب الاخلاق (۲) ص ۵۲۳ ۸ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۹۷ ۹ ایضاً، ص ۱۹۸ ۱۰ مقالات سرسید (۳) ص ۱۷

جس قدر کہ فرائض مذہب اسلام میں ہیں وہ فطرت اللہ یعنی نیچر کے مطابق ہیں۔[۱]

قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فطرت اللہ یعنی نیچر اور اس کے کارخانہ قدرت کے برخلاف ہو۔[۲]

کوئی معجزہ کسی نبی کا خلاف نیچر اور خلاف فطرت اللہ نہیں ہے گو اس کی ماہیت ہماری سمجھ میں نہ آئے کیونکہ ہزاروں کام نیچر کے ایسے ہیں جن کی ماہیت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔[۳]

نیچری — ایک طعنہ مگر مذہب خدائی

جو ہمارے خدا کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے۔ خدا نہ ہندو ہے نہ عرفی مسلمان' نہ مقلد نہ لامذہب' نہ یہودی نہ عیسائی' وہ تو پکا چھٹا ہوا نیچری ہے۔ وہ خود اپنے کو نیچری کہتا ہے۔ پھر اگر ہم بھی نیچری ہوں تو اس سے زیادہ ہم کو کیا فخر ہے![۴]

جتنے پیغمبر گزرے سب نیچری تھے۔ خدا خود نیچری ہے۔ جب لوگوں نے نیچر کے قوانین کو چھوڑا تب ہی اس نے پیغمبر بھیجا۔ جو پیغمبر آیا اس نے کیا کیا؟ پھر لوگوں کو نیچر کا رستہ بتایا اور جتنا بگاڑا تھا اتنے کو پھر سنوارا۔ جب موسیٰ سے نیچرلسٹ (Naturalist)★ کو لوگوں نے مجنوں کہا تو پھر ہم کس گنتی میں ہیں؟ ہم کو جو چاہیں کہیں۔[۵]

خدا نے ہم کو' ہماری جان کو' ہماری سمجھ کو' ہمارے قیاس کو' ہمارے دل و دماغ کو' ہمارے روئیں روئیں کو نیچر سے جکڑ دیا ہے' ہمارے چاروں طرف نیچر ہی نیچر پھیلا دیا ہے۔ نیچر ہی کو ہم دیکھتے ہیں' نیچر ہی کو ہم سمجھتے ہیں' نیچر سے خدا کو پہچانتے ہیں' پھر نیچری نہ ہوں تو کون ہوں۔ کوئی کیسا ہی مسلمان ہو ہم تو بلاشبہ فطرتی مسلمان ہیں۔ ہمارے باپ دادا بھی کچھ [illegible] کرامات دیکھ کر ایمان نہیں لائے تھے' وہ بھی فطرتی مسلمان تھے۔[۶]

جب ہمارا دادا ابراہیمؑ نیچری تھا تو ہم اس کی ناخلف اولاد نہیں ہیں جو نیچری ہمارے خدا کا' ہمارے باپ دادا کا تمغہ ہے۔ ہم نیچری' ہمارا خدا نیچری' ہمارے

★ فطرت پسند

۱ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۱۷ ۲ ایضاً، ص ۳۳۷ ۳ ایضاً، ص ۳۳۰ ۴ ایضاً، ص ۱۴۷ ۵ ایضاً، ص ۱۵۲ ۶ ایضاً

نیچری۔ اگر کوئی اس مقدس لفظ کو بری نیت سے استعمال کرتا ہے وہ جانے اور اس کا ایمان۔ وہ صرف ہم ہی کو نہیں کہتا بلکہ خدا کو، پیغمبر کو، ابراہیم کو، سب کو کہتا ہے۔ [۱]

ہم کو تعجب ہے کہ وہ لوگ جو ائمہ اربعہ کے مذہب پر نہیں چلتے غیر مقلد یا لامذہب کیوں گالی سمجھتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ ائمہ اربعہ کی تقلید نہیں کرتے اور ان کے مذہب پر چلتے۔ پھر سچ بات سے کیوں برا مانتے ہیں اور اوروں کی نیت کو کیوں برائی پر لے جاتے ہیں وہی لوگ اور ان کے چھوٹے بڑے بھائی ہم کو حضرات نیچریہ کہتے ہیں۔ ہم تو نہ ان کے سے برا مانتے ہیں، نہ ان کی نیت میں برائی لگاتے ہیں بلکہ ان کا احسان مانتے ہیں کہ سچ کہتے ہیں۔ [۲]

جب کہ ہمارے پاس نیچر ہی سچائی کا معیار ہے تو ہم نیچری ہونا کیوں نہ گوارا کریں کیوں علماء زمانہ کی طرح لوگوں سے التجا کریں کہ ہم کو وہابی مت کہو حنفی کہو، ہم کو لامذہب مقلد مت کہو موحد و اہل حدیث کہو۔ ہم تو سب کو اجازت دیتے ہیں کہ ہم کو جو چاہو سو کہو۔ نیچری ہونے میں کیا برائی ہے جس کو ہم گوارا نہ کریں۔ [۳]

نیچری کافر ہوں یا لامذہب یا بدمذہب مگر وہ ایسے مذہب کو، جیسا کہ منبر پر اعوذ پڑھنے والے کا ہے، پسند نہیں کرتے...... ٹھیٹ مسلمان اور سچے تابع دار سچی شریعت کے ہیں۔ گناہ بھی کرتے ہیں اور گنہ گار بھی ہوتے ہیں مگر دغاباز اور مکار اور ریاکار نہیں ہوتے۔ [۴]

گو کہ ہم نیچری ہوں لیکن ہم کو خدا پر مولویوں سے زیادہ بھروسا ہے۔ [۵]

خدا کی شان اور خدا کی عظمت اور اس کا جاہ و جلال اور انبیا کی شان اور ان کی قدر و منزلت بھی بغیر نیچرلسٹ کے کوئی نہیں جان سکتا۔ تھوڑی دیر کے لئے خدا کا اور انبیا کا اس طرح پر، جیسا کہ علماء اسلام نے قرار دیا ہے، تصور باندھو۔ اگر مجسمیہ ہو تو اس کو ایک نہایت قوی گراں ڈیل، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، بلور کی سی پنڈلیاں، انسان کی سی صورت، گوری گوری نورانی چہرہ، سفید ڈاڑھی، سر پر تاج یا لال پھندنے دار ٹوپی، تخت پر بیٹھا ہوا، اردگرد ہاتھ باندھے دست بستہ کھڑے ہوئے خیال کرو۔ اگر ان کو گمراہ سمجھو تو اتنا تو ضرور یقین کرو کہ قیامت

---

[۱] مقالات سرسید (۱۵)، ص ۱۵۳ [۲] ایضاً، ص ۱۴۶ [۳] ایضاً، ص ۱۵۹ [۴] ایضاً (۳)، ص ۲۲

[۵] مکتوبات سرسید، ص ۳۷۸

ضرور اس کو دیکھیں گے گو صورت شکل نہ معلوم ہونے سے پہچاننے میں مشکل پڑے۔ اس کا دربار لگا ہوا ہوگا۔ وہ تخت پر بیٹھا ہوا ایک خوشی و غرور سے کہتا ہوگا ''لمن لملک الیوم۔'' اس کے ہالی موالی کہتے ہوں گے ''للہ الواحد القھار''۔ عدالت لگی ہوگی' انصاف ہو رہا ہوگا' مجرم پیش ہوتے ہوں گے' گواہ گواہی دے رہے ہوں گے' ہر ایک کا اعمال نامہ پڑھا جاتا ہوگا' ترازو میں کچھ تل رہا ہوگا' ایک طرف۔ کالی کالی بد ہیئت ڈراؤنی صورت دوزخ کے فرشتے اور دوسری طرف گورے گورے جنت کے فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے' ادھر دوزخ جوش مار رہی ہوگی' اس کی آتشیں زبانیں ''ھل من مزید' ھل من مزید'' کہہ کر چلا رہی ہوں گی' ادھر جنت میں میوے لٹک رہے ہوں گے' پھول کھلے ہوئے ہوں گے' دودھ و شراب کی نہریں بہہ رہی ہوں گی' حوریں اور غلمان اپنے اپنے دوستوں کے انتظار میں ٹہل رہے ہوں گے۔ انصاف بھی بے مثل ہوگا۔ تقدیر کا مسئلہ اگر صحیح ہو تو جو کام خود حضرت نے کیے ہیں اس کی سزا دوسروں کو دی جائے گی۔ چھوٹے بچوں کو اس لئے سزا ملے گی کہ تم کافروں کے ہاں کیوں پیدا ہوئے۔ غرض کہ آخر کار فی صدی دو تین بہشت میں جائیں گے' باقی سب دوزخ میں بلکہ ان میں سے بھی کچھ کسی الزام سے' کچھ کسی الزام سے' کچھ نیچری ہونے کے الزام سے چھنٹ جائیں گے۔ صرف دو چار اہل حدیث یا دس پانچ مقلد وہابی جائیں گے۔ دوزخ بھرپور اور بہشت خالی ویران رہ جائے گی۔ نیچری اس وقت بھی پکاریں گے کہ بہشت میں جانا نہ یہودی ہونے پر موقوف ہے نہ عیسائی ہونے پر' نہ وہابی ہونے پر موقوف ہے نہ اور کچھ ہونے پر' بلکہ اصل یہ ہے کہ ''من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون''۔ پھر دیکھئے ان کی یہ صدا سنی جاتی ہے یا نہیں؟ ہم کو تو یقین ہے کہ ضرور سنی جائے گی۔ اگر سنی گئی تو پھر نیچریوں ہی کی بدولت سب کا بیڑا پار ہے۔[1]

---

[1] مقالات سرسید (۱۵)، ص ۱۵۶

نبوت کے لوازم

ملکۂ نبوت

خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے انسان کو مختلف قسم کے ملکہ اور ذہن اور دماغ کا پیدا
ہے۔ جس قسم کا ملکہ اور ذہن اور دماغ کسی کو دیا ہے اس نے اس کو اپنی ماں کے پیٹ میں ہی
ہے اور اپنی ماں کے پیٹ میں ہی اس کو لے کر پیدا ہوا ہے۔ یہ ملکہ ذہن اور دماغ کسی چیز نہ
ہے بلکہ وہی ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے۔ ہاں، قوائے طبعی کے قویٰ ہونے کے ساتھ یہ بھی قو
ہوتا جاتا ہے۔ اس قسم کی فطرت جب کسی کو ایسے امر کی نسبت دی جاتی ہے جو انسان کی فطر
سے اور اس کی روح کا اس کے مبداء سے تعلق قائم رکھنے سے اور انسان کے مختلف قویٰ
اعتدال میں رکھنے سے متعلق ہوتی ہے، اور وہ فطرت اس امر خاص میں ایسی ہوتی ہے کہ مثل ا
کے دوسرا نہیں رکھتا تو وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کو زبان شرع میں پیغمبر یا رسول کے لفظ
تعبیر کیا جاتا ہے، اور درحقیقت وہ خدا کا پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔[1]

جن جن علوم اور جن حقائق اشیا کی صداقت دریافت کرنے کا جس میں کامل ملکہ ہے
اسی کا پیغمبر ہے، مگر یہ لفظ خاص ہو گیا ہے اور صرف اخلاقی و روحانی علم کی صداقت دریافت
کرنے والے شخص کو، جس میں اس کی صداقت دریافت کرنے کا کامل ملکہ ہو جو وحی و الہام
تعبیر کیا جاتا ہے، نبی یا پیغمبر کہتے ہیں۔[2]

ایسا ہادی جس میں اس قسم کی ہدایت کی کامل فطرت ہوتی ہے وہی نبی ہوتا ہے اور وہ
فطرت ملکۂ نبوت، ناموس اکبر، جبریل اعظم کے لقب سے ملقب کی جاتی ہے۔ وہ کسی بات
سوچتا ہے اور کچھ نہیں جانتا، دفعتاً اس کے دل میں بغیر کسی ظاہری اسباب کے ایک القا ہوتا
اور قلب کو ایک صدمہ اس کے القا سے محسوس ہوتا ہے، جیسے کہ اوپر سے کسی چیز کے گرنے
صدمہ ہوتا ہے یا اس قسم کا ایک انکشاف اس کے دل پر ہوتا ہے جو سچ مچ وہ جانتا ہے کہ تما
حجاب اٹھ گئے ہیں اور جس کی میں تلاش میں تھا مثل سپیدہ دم صبح میرے سامنے موجود ہے۔[3]

---

[1] تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۰۰-۲۰۱ [2] مقالات سرسید (۱۳)، ص ۴۰۰ [3] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۲

میں ملکہ نبوت والہام کو بھی ایک قوت انسانی کے قویٰ میں سے سمجھتا ہوں مگر ہر ایک انسان میں اس ملکہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔[۱]

میں نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتا ہوں۔ نبیؑ کو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں کیوں نہ ہو نبی ہوتا ہے۔ جب پیدا ہوتا ہے تو نبی ہی پیدا ہوتا ہے جب مرتا ہے تو نبی ہی مرتا ہے۔[۲]

ختم نبوت کا مفہوم

وحی اور الہام اس ہمیشہ ہمیشہ ہست ہستی کا دائمی فیض ہے جو نہ منقطع ہوا ہے نہ منقطع ہوگا۔ اگر وہ کسی زمانہ کسی سے ہم کلام ہوا ہے تو وہ اب بھی ہم کلام ہونے کو موجود ہے۔ اگر کبھی اس نے کسی کو اپنا دیدار دکھایا ہے تو وہ اب بھی دکھانے کو حاضر ہے۔ اگر وہ آگ کی صورت یا آدمی کی مورت بننا جانتا تھا تو اب بھی وہ جانتا ہے مگر وہ شخص چاہیے جس سے وہ ہم کلام ہو اور جس کو اپنا دیدار دکھائے ع

عشق گر مرد ست مردے بر سر کار آورد
ورنہ چوں موسیٰ لبے آورد و بسیار آورد

خدا تو ایسا فیاض ہے کہ مکھی کے دل میں بھی وحی ڈالتا ہے پھر انسان کے دل میں وحی یا الہام ڈالنے سے اس نے کبھی منہ نہیں موڑا۔ مگر انسان کا دل کم سے کم مکھی کا سا تو ہونا چاہیے جس میں وہ آسکے۔ ہمارے اس مضمون کو کٹ ملا پڑھ کر سمجھیں گے کہ ہم نے کفر بکا ہے اور ختم نبوت سے انکار کیا ہے مگر یہ ان کی نادانی ہے جو ختم نبوت کو بمعنی انقطاع فیض مبدء فیاض سمجھتے ہیں۔ ہم ختم نبوت کے قائل ہیں اور پھر چشمہ فیض رحمت کو جاری مانتے ہیں اور خدا سے انسان کے تعلق کو کبھی منقطع نہیں سمجھتے...... ختم نبوت دوسری چیز ہے اور عدم انقطاع رحمت دوسری چیز۔[۳]

روحانی ترقی یا تہذیب کے باب میں جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے وہ حد یا انتہا اس کی ہے اور اسی لئے وہ خاتم ہیں۔ اب اگر ہزاروں لوگ ایسے پیدا ہوں جن میں ملکہ نبوت ہو مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم نبوت فرمایا ہے ملکۂ نبوت کا ختم اور فیضان الٰہی کا خاتمہ نہیں فرمایا بلکہ اولیاء امتی کانبیاء بنی اسرائیل

---

[۱] مقالات سرسید (۱۳)، ص ۳۹۹ [۲] تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۸ [۳] مقالات سرسید (۱۳)، ص ۳۹۲-۳۹۳

کے لفظ سے اس ملکہ نبوت کا تا قیامت جاری رہنا پایا جاتا ہے۔[۱]

میں تو جناب رسول خدا صلعم کو خاتم النبیین جانتا ہوں بوجہ ختم نبوت یا رسالت کے ا
ایسے خاتم کو تاخرز مانی اور افضلیت دونوں لازم ہیں ...... ہاں، فیض الٰہی کبھی ختم نہیں ہونے کا
بقول حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ ع

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آں چہ مسیحا می کرد[۲]

وحی اور الہام

جس طرح کہ انسان میں اور قوئی ہیں اسی طرح ملکہ وحی والہام بھی اس میں ہے......
الہام ووحی بھی بعض انسانوں میں معدوم ہوتا ہے، بعض میں کم ہوتا ہے، بعض میں زیادہ اور بعض
میں بہت زیادہ۔[۳]

ان کے دل میں وہ بات پیدا ہوتی ہے جس کو وہ وحی والہام قرار دیتے ہیں کیونکہ
جانے جاتی ہے اور بن بلائے آتی ہے۔ یہ ایک فطری مناسبت ہے جو ہر ایک کے کام
ساتھ انسانوں کو ہوسکتی ہے، جعفر زٹلی کو زٹل کے ساتھ، ایک شاعر کو شعر کے ساتھ، ایک نیچری
نیچر کے ساتھ، مگر جس انسان کو یہ فطرتی مناسبت روحانی تربیت کے ساتھ ہوتی ہے اس کو پیغمبر
کہتے ہیں اور اوروں کو زٹلی اور شاعر اور نیچری۔[۴]

مطلق وحی کا آنا صرف انبیا ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ انبیا کے سوا مقدس لوگوں پر بھی
آتی ہے۔[۵]

ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی حالت کو سوچا اور دوسروں کی حالت کو دیکھا اور ا
ایسا امر ان کے دل میں پڑا جس سے انہوں نے تعلیمی اور تربیتی اور سوشیلی اثروں پر غلبہ پایا
دل میں پڑنے والی شے کو بھی ہم الہام اور وحی کہتے ہیں۔ اگر وحی والہام نہ تھا تو اور کیا تھا
نے کالون اور لوتھر کے دل کو اس پرانے راستے سے پھیرا اور ہمارے ہی زمانہ میں اس

---

۱ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۳۲ ۲ ایضاً، ص ۳۱۲-۳۱۴ ۳ مقالات سرسید (۱۳)، ص ۳۸۸
۴ النظر (باب ہشتم)، ص ۵۶ ۵ تبیین الکلام (۱)، ص ۷

تعظیم و ادب شخص بابو کشیب چندر سین کے دل کو خدائے واحد کی طرف موڑا اور سوامی دیانند سرسوتی کے دل کو مورتی پوجن سے پھیرا؟[۱]

مسلمان ان دونوں قسم کی وحیوں میں، یعنی جو نبی پر آئے اور جو غیر نبی پر آئے، تمیز رکھنے کو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو وحی انبیا کو ہوتی ہے اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی، نہ اصل وحی میں اور نہ تعبیر معنی میں۔ اور جو وحی انبیا کے سوا اور مقدس لوگوں کو ہوتی ہے اس میں سمجھنے کی غلطی کا احتمال ہے، خواہ باعتبار وحی سمجھنے اس واقعہ کے جو ہوا خواہ باعتبار تعبیر اور تفہیم معنی وحی کے۔ علاوہ اس کے ایسی وحی جس سے شریعت کا کوئی نیا حکم پیدا ہو، وہ نبی کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی۔[۲]

کلام اللہ کا نزول

جب کہ ہم کسی پر، خواہ جبرائیل ہو، حسبِ اعتقاد جمہور مسلمین خدا اور انبیا میں مثل ایلچی کے واسطہ ہے اور خواہ وہ خود نبی مبعوث ہو، جیسا کہ میرا خاص اعتقاد ہے، خدا کے کلام کا نازل ہونا کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ خدا نے اس کے دل میں بجنسہٖ وہ الفاظ، جن کو بعد اس کے وہ تلفظ کرے گا، مع ان کے معنی کے جو مقصود ہیں، پیدا کیا ہے یا القا کیا ہے اور وہی لفظ بجنسہٖ نبی نے تلفظ کئے ہیں...... یہی میرا اعتقاد قرآن مجید کی نسبت ہے کہ وہ بلفظہٖ مع معانی ہا قدیم و کلام خدا ہے اور خود خدا نے اپنا کلام پیغمبر خدا میں بلا واسطہ پیدا کیا ہے، جیسا کہ میں نے کسی مقام پر کہا ہے ع

زجبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم[۳]

ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ انبیا اور اولیا کوئی غیبی آواز نہیں سنتے۔ سنتے ہوں گے، مگر وہ خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ اس القا کا اثر ہے جو اُن پر ہوا ہے اور وہ ان ہی کے نفس کی آواز ہے جو اُن کے کان میں آئی ہے۔ وہ بیداری میں اسی طرح آواز کو سنتے ہیں جیسے کہ سوتے میں خواب دیکھنے والا سنتا ہے یا جیسے کہ بعضی دفعہ لوگوں کو، جو کسی خیال میں مستغرق ہوں، بغیر کسی بولنے والے کے کان میں آواز آتی ہے۔[۴]

---

۱ مقالات سرسید (۱۳)، ص ۳۹۲ ۲ تبیین الکلام (۱)، ص ۱۱ ۳ تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۲۸-۲۲۹
۴ ایضاً، ص ۲۳۹

وحی، جو آں حضرتؐ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوئی تھی، دو قسم کی تھی۔ اول وہ تھی جس کے
الفاظ پیغمبر خدا پر نازل ہوتے تھے اور بجنسہ وہی الفاظ پیغمبر خدا پڑھ کر سناتے تھے، دوسری وہ
کا مطلب پیغمبر خدا پر القا ہوتا تھا اور پیغمبر خدا اپنے الفاظ میں اس کو بیان فرماتے تھے۔ اول
کی وحی کو ہم اصطلاحاً وحی متلو یا قرآن یا کلام اللہ کہتے ہیں اور دوسری قسم کی وحی غیر
حدیث۔[1]

ملائک واجنہ اور شیطان

فرشتوں کا وجود

فرشتوں کے وجود کی نسبت لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں...... ان کو نوری
گورا گورا سفید برف کا رنگ، نوری شمع کی مانند بانہیں، بلور کیسی پنڈلیاں، ہیرے کیسے پاؤں
خوبصورت انسان کی شکل مگر نہ مرد نہ عورت تصور کیا ہے، آسمان ان کے رہنے کی جگہ قرار دی
آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کے لئے ان کے پر لگائے ہیں۔
شاندار اور کسی کو غصہ ور و غضب ناک، کسی کو کم شان کا، کسی کو صور پھونکتا، کسی کو آتشیں کو
سے مینہ برساتا خیال کیا ہے...... وہ فرشتوں کو ہوا کی مانند لطیف اجسام سمجھتے ہیں اور
شکلوں میں بن جانے کی ان میں قدرت جانتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ آسمانوں
رہتے ہیں اور پردار ہیں کہ اُڑ کر زمین پر اترتے ہیں اور زمین پر سے اُڑ کر آسمان پر چلے جا
ہیں اور چیلوں کی طرح آسمان اور زمین کے بیچ میں منڈلاتے ہیں۔[2]

قرآن مجید میں فرشتوں کا ذکر آیا ہے اور اس لئے ہر ایک مسلمان کو، جو قرآن پر
رکھتا ہے، فرشتوں کے موجود اور ان کے مخلوق ہونے پر یقین کرنا ضرور ہے، مگر جہاں تک
ہے اس پر بحث ہے کہ وہ کیسی مخلوق ہے۔ عام خیال مسلمانوں کا اور علماء اسلام کا یہ ہے کہ
طرح انسان و حیوان جسم و صورت و شکل رکھتے ہیں اسی طرح وہ بھی جسم اور صورت و شکل ر

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۲۶۳ [2] تفسیر القرآن (۱)، ص ۴۶ - ۴۸

ں خدا کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں اور دنیا کے کام جو ان سے متعلق ہیں کرتے کرتے ہیں۔ اور حیوانات کے جسم اور ان کے جسم میں اتنا فرق ہے کہ ان کا جسم محسوس نہیں ہوتا، چھونے سے ہاتھ کو لگتا ہے، نہ دیکھنے سے آنکھ کو دکھائی دیتا ہے۔ اور باوجود اس قدر نازک ونے کے وہ بہت بڑے بڑے اور نہایت مشکل مشکل کام کرتے ہیں، پہاڑ اٹھا لیتے ہیں، زمین و الٹ دیتے ہیں۔ اور ان میں یہ بھی طاقت ہے کہ کبھی اپنے جسم کو ایسا کر لیتے ہیں کہ ان کی صلی صورت، جو بہت بڑی خیال کی گئی ہے، دکھائی دے جاتی ہے۔ اور ان میں یہ بھی قدرت ہے کہ جس شخص کی صورت چاہیں بن جائیں اور انسانوں کی طرح انسانوں کے پاس آ کر اتیں کریں۔[1]

ملائکہ کے وجود سے ہم کو انکار نہیں ہے۔ جس قدر اختلاف ہے وہ صرف ان کی حقیقت و ماہیت کی نسبت ہے اور علی الخصوص قرآن مجید میں جو لفظ ملک و ملائکہ آیا ہے اس کی مراد کی نسبت ہے۔[2]

قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے، ثابت نہیں ہوتا بلکہ برخلاف اس کے پایا جاتا ہے..... فرشتے نہ کوئی جسم رکھتے ہیں اور نہ دکھائی دے سکتے ہیں۔ ان کا ظہور بلا شمول مخلوق موجود کے نہیں ہو سکتا۔[3]

قدیم زمانہ کی تمام دنیا کی قوموں کا یہ حال تھا کہ جو امور عجیب و غریب ان کے سامنے ایسے پیش آتے تھے جس کی علت ان کی سمجھ سے باہر تھی، اس کو کسی ایسی قوت یا ایسے شخص سے منسوب کرتے تھے جو انسان سے برتر اور خدا سے کمتر تھی۔ اسی خیال سے تمام بت پرست قوموں نے اپنے ہاں خیالی دیوتا اور دیویاں، اور خدا پرست قوموں نے اپنے ہاں فرشتے قائم کر لئے۔[4]

جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قوتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں، ملک یا ملائکہ کہا ہے۔[5]

۱۔ تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۴۲ ۲۔ ایضاً (۳)، ص ۴۷ ۳۔ ایضاً (۱)، ص ۴۹ ۴۔ ایضاً ص ۱۴۷
۵۔ ایضاً ص ۴۹

جبریل کی حقیقت

وحی تو وہی ہوتی ہے جو خدا سے پیغمبر کو دی جاتی ہے مگر مفسروں نے اس کا بیان' کیونکر دی جاتی ہے' ٹھیک طور پر نہیں کیا۔ انہوں نے خدا اور رسول کو دنیا کے بادشاہ اور وز[یر] مانند اور وحی کو بادشاہ کے کلام یا حکم یا پیغام کی مانند سمجھا ہے اور جبریل کو ایک مجسم فرشتہ' با[دشاہ] وزیر میں ایلچی پیغام لے جانے والا' قرار دیا ہے۔[1]

تمام علمائے اسلام اس کو ایک مخلوق جداگانہ' خارج از خلقت انبیا' قرار دے کر اس کو [خدا کا] ایلچی کے خداو نبی میں واسطہ قرار دیتے ہیں اور جبریل اس کا نام بتاتے ہیں۔ ہم بھی جبریل روح القدس کو شے واحد یقین کرتے ہیں مگر اس کو خارج از خلقت انبیا مخلوق جداگانہ تسلیم [نہیں] کرتے۔[2]

مسلمانوں نے تصور کیا ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیتیں خدا سے سن کر [آیا] لیتے تھے اور آں حضرتؐ کو آ کر سناتے تھے۔[3]

خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبریل[...] ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ اس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیا[ت] ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے' اس کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ خود ہی وہ مجسم چیز ہوتا ہے جس میں سے خدا کے کلا[م کی] آوازیں نکلتی ہیں۔ وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و بے صوت کلام کو سنتا[ہے] خود اسی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے۔ اسی کا عکس [اس] کے دل پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے۔[4]

خدا اور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے' پڑھتا ہے' وہی مطلب بتاتا ہے' اور یہ سب کام اسی فطری قوت نبوت کے ہیں جو خدا تعالیٰ مثل دیگر قوئ انسانی کے انبیا میں بمقتضائے ان کی فطرت کے پیدا کی ہے' اور وہی [قوت] ناموس اکبر ہے اور وہی قوت جبریل پیغامبر۔[5]

---

1 تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۶   2 ایضاً (۲)، ص ۲۴۱   3 ایضاً (۱)، ص ۱۴۱   4 ایضاً، ص ۲۹   5 ایضاً[...]

قرآن مجید میں صرف دوفرشتوں یعنی جبریل ومیکائیل کا نام آیا ہے۔ وہ دونوں فرشتے یہودیوں کے ہاں بھی اسی نام سے مشہور ہیں۔[۱]

ان دونوں کے نام قرآن مجید میں آنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ درحقیقت اس نام کے دوفرشتے مع تشخصہا علیحدہ علیحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے کہ زید وعمر کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دوفرشتوں کے سوا اور بھی بہت سے فرشتے ہیں مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا۔ حضرت عزرائیل بھی بڑے مشہور فرشتے ہیں جو سب کے پاس آئیں گے اور کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ اگرچہ ان کا ذکر بلفظ ملک الموت قرآن میں آیا ہے مگر ان کا کچھ نام نہیں بیان ہوا ہے۔ ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کئے ہوئے ہیں جو مختلف قویٰ کے تعبیر کرنے کو انہوں نے رکھ لئے تھے۔[۲]

کراماً کاتبین کے فرائض

جمہور مسلمین کا یہ اعتقاد ہے کہ انسان اپنی زندگی میں جو اچھے برے کام کرتے ہیں ان کو دوفرشتے لکھتے جاتے ہیں۔ قیامت کے دن ان سے حساب کتاب ہوگا اور اعمال تولے جائیں گے۔ جس کی نیکیاں بھاری نکلیں گی وہ نجات پائے گا اور جس کی بدیاں بھاری ہوں گی وہ عذاب پائے گا۔[۳]

اعمال نیک یا افعال بد کے جو اثرات روح انسانی میں مستقر ہوتے جاتے ہیں ان کو خدا تعالیٰ نے کتابت کراماً کاتبین کی مثال میں بیان کیا ہے' اور وہی ذریعہ ہیں نیکی اور بدی کی مقدار ظاہر ہونے کا۔[۴]

قرآن مجید میں جن کو ملائکہ حفظہ کہا گیا ہے وہی کراماً کاتبین ہیں..... حفظہ سے مراد کوئی وجود خارج از انسان مراد نہیں ہے بلکہ حفظہ کا اور کراماً کاتبین کا' جن کو مفسرین متحد مانتے ہیں' صرف قویٰ انسانی پر اطلاق ہوا ہے۔[۵]

---

۱ تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۴۰ ۲ ایضاً ص ۱۵۳-۱۵۴ ۳ مقالات سرسید (۱)، ص ۱۹۴ ۴ تفسیر القرآن (۷)، ص ۴۷ ۵ ایضاً ص ۴۴

جنوں کی مخلوق

تمام علمائے اسلام نے جنوں کی جداگانہ ایسی ہی مخلوق قرار دی ہے جیسے کہ انسان کی
قرآن مجید سے جنوں کی ایسی مخلوق ہونے کا ثبوت نہیں ..... عام مسلمان خیال کرتے ہیں
ایک ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں مرد اور عورت دونوں ہیں۔ وہ لڑ
اور لڑکیاں جنتے جناتے ہیں، طرح طرح کی شکلوں میں بن جاتے ہیں، انسانوں کے سر
آتے ہیں، ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کو اٹھا لے جاتے ہیں، ان کو مار ڈالتے ہیں، انسانو
عاشق ہو جاتے ہیں، ان کو تازہ بہ تازہ میوے لاکر دیتے ہیں، اور دکھائی نہیں دیتے مگر
چاہیں اور جس شکل میں چاہیں اپنے تئیں دکھلا دیتے ہیں یعنی اپنے جسم میں دفعتاً ایسا مادہ
کر لیتے ہیں کہ دکھائی دینے لگتا ہے، آدمی کی صورت بن کر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو
ہیں، عامل ان کو آدمی بنا کر اپنے گھوڑے کا سائیس کر لیتے ہیں مگر اس میں سے ایک بات
قرآن مجید سے ثابت نہیں۔ [1]

کتب احادیث و سیر میں جو قصے جنوں کے لکھے ہیں وہ تو ایسے ہیں جیسے کہ اس زمانہ
مشہور ہوتے ہیں اور جن کی کچھ اصلیت نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی معتبر حدیث موجود نہیں ہے
سے واقعی حالات ایسی مخلوق کے اور ان کے افعال کے، جیسا کہ عرب جاہلیت کا خیال تھا، ثا
ہوتے ہیں۔ [2]

قرآن مجید میں بھی کہیں استعارۃً جن کا اطلاق شیطان مغوی للانسان پر ہوا ہے اور کہ
وحشی اور شریر انسانوں پر اور کہیں بطور الزام و خطابیات کے اسی وجود خیالی پر جس کا مشرک
یقین کرتے تھے۔ مگر خطابیات کے طور پر بیان کرنے سے فی الواقع ویسی مخلوق کے ہونے
ثبوت نہیں ہوتا۔ [3]

جہاں جن کے لفظ کا فی الواقع ایک مخلوق مستقل پر اطلاق ہوا ہے اس سے جنگلی اور و
انسان مراد ہیں جو پوری پوری تمدنی حالت میں نہیں ہیں۔ [4]

---

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۸۰-۸۱ [2] تفسیر الجن، ص ۳۳ [3] تفسیر القرآن (۳)، ص ۸۱
[4] ایضاً (۵)، ص ۱۶۵

حضرت سلیمانؑ اور جن

حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں جن و شیاطین کا' جو حضرت سلیمان کے ہاں بہت سے کاموں پر متعین تھے' قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اس سے وہ پہاڑی و جنگلی آدمی مراد ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے ہاں بیت المقدس بنانے کا کام کرتے تھے اور جن پر بسبب وحشی اور جنگلی ہونے کے' جو انسانوں سے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے رہتے ہیں اور نیز بسبب قوی اور طاقتور اور محنتی ہونے کے جن کا اطلاق ہوا ہے۔ پس اس سے وہ جن مراد نہیں ہیں جن کو مشرکین نے اپنے خیال میں ایک مخلوق مع ان اوصاف کے جو اُن کے ساتھ منسوب کئے ہیں' مانا ہے جن پر مسلمان بھی یقین کرتے ہیں۔[1]

ان وحشی اور جنگلی اور پہاڑی آدمیوں پر جو حضرت سلیمانؑ کی سرکار میں عمارت کے لئے پہاڑ سے پتھر لاتے اور جنگلوں سے لکڑی کاٹنے کا کام کرتے تھے' قرآن مجید میں جن کا اطلاق ہوا ہے۔[2]

جب حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کے لئے تخت منگانا چاہا' ایک زبردست پہاڑی آدمی نے کہا ''میں ابھی اٹھالاتا ہوں''۔ یہ جو مفسرین نے قصہ بنایا ہے کہ وہ تخت شہر سبا یعنی ملک یمن میں تھا' نہ اس کی کچھ اصلیت ہے نہ اس کا کچھ ثبوت ہے۔ سلیمانؑ کے مکان میں وہ تخت ہوگا' انہوں نے اس کو منگانا چاہا۔ ایک شخص نے کہا ''حضور! میں ابھی اٹھالاتا ہوں۔'' اس میں نہ کچھ عجیب قصہ ہے نہ کوئی بات ہے مگر ہاں' واعظین کے لئے منبر پر بیٹھ کر عجیب و غریب' دور از کار اور دور از عقل باتیں بنانے کو کافی نہیں۔[3]

شیطان کی اصلیت

قرآن مجید میں ابلیس اور اسی معنی میں شیطان کا لفظ آیا ہے۔[4]

قرآن مجید میں یہ نام تو آیا مگر اس کی حقیقت یا ماہیت کچھ بیان نہیں ہوئی البتہ ہم اس کی کچھ صفات قرآن مجید اور بعض احادیث سے پاتے ہیں۔[5]

۱۔ تفسیر القرآن (۳)، ص ۸۴-۸۵ ۲۔ ایضاً (۵)، ص ۱۶۷ ۳۔ تفسیر الجن، ص ۳۰
۴۔ تفسیر القرآن (۵)، ص ۱۶۴ ۵۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۰۹

مفسروں کو بڑی دقت پڑی ہے کیونکہ وہ شیطان کو ایک جدا گانہ مخلوق خارج
اور خدا تعالیٰ کا مخالف اور لوگوں کو بدی و نافرمانی پر رغبت دینے والا اور بہکانے والا گ
میں ڈالنے والا قرار دیتے ہیں۔[1]

اب ان صفات شیطان کا جو ہمارے پاک خدا اور سچے پیغمبر نے بتلائی ہیں، ہم ا
اثر تو پاتے ہیں مگر کسی وجود خارجی کو نہیں پاتے۔ دن رات ہم کو شیطان بہکاتا ہے اور
میں پھنساتا ہے مگر کوئی وجود خارجی محسوس نہیں ہوتا بلکہ ہم بالیقین پاتے ہیں کہ خود ہم
ایک قوت ہے جو ہم کو سیدھے راستے پر سے پھیرتی ہے، ہم کو بے انتہا ترغیبوں سے بہکا
شیطان سمجھ کر اس کی ڈاڑھی پکڑ لیتے ہیں اور زور سے طمانچہ مارتے ہیں مگر جب آنکھ کھ
اپنی ہی سفید ڈاڑھی اپنے ہاتھ میں اور اپنا ہی گال لال دیکھتے ہیں۔[2]

میں شیطان کے وجود کا قائل ہوں مگر انسان ہی میں وہ موجود ہے، خارج عن ا
نہیں۔[3]

لفظ شیطان سے اگر کوئی وجود خارج من الانسان مراد لی جائے تو ضرور قرآن ن
باللہ غلط یا خلاف واقعہ ماننا پڑے گا کیونکہ حقیقت میں کوئی وجود خارجی مغوی للانسان مو
ہے۔[4]

جو لوگ اس کے قائل ہوئے ہیں انہوں نے خود اپنی ہی صورت آئینہ میں دیکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہمت کاملہ سے انسان کا خمیر اور اس کی بناوٹ الگ
سے مرکب کی ہے جس میں خیر و شر دونوں ہیں اور جو قویٰ ملکوتی اور قویٰ بہیمی کہے جا
ان میں سے قویٰ بہیمی، جو انسان کو برائی اور شرارت کی طرف ترغیب دیتے ہیں، ان کا
میں شیطان رکھا گیا ہے، نہ یہ کہ وہ انسان سے علیحدہ کوئی مخلوق ہے۔[6]

قرآن مجید میں شیطان کا لفظ ان ہی قویٰ پر جو بمقابلہ قویٰ ملکوتیہ کے انسان
بمقتضائے فطرت و خلقت انسانی کے ہیں، اطلاق ہوا ہے، نہ کسی ایسے وجود خارجی پر جو
مقابل اور اس کا مد مخالف ہو۔[7]

---

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۸۸ [2] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۱۰ [3] ایضاً، ص ۳۳۱ [4] ایضاً
[5] ایضاً [6] تبیین الکلام (۲)، ص ۱۴۶ [7] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۸۹

قصہ تخلیق آدم

اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں: ایک خدا' دوسرے فرشتے (یعنی قویٰ ملکوتی)' تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قویٰ بہیمی)' چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ ان قویٰ کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں)۔ مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے۔[1]

اگر فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علیحدہ وجود رکھتے ہیں' جیسے کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے' تو بھی یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہ مباحثہ خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا کیونکہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے بلکہ اس کے حکم کو بجالاتے ہیں...... پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا ٹنٹا کیا تھا؟[2]

اگر ان الفاظ کے وہی معنی ہوں تو خدا میں اور فرشتوں میں خدائی اور بندگی کا ہے کو ہوئی' بھٹیاروں کی تو تو میں میں ہوئی۔ اگر یہ سچ ہو تو ہم کو اپنے نوکروں کی بھی شکایت نہیں رہنے کی کیونکہ خدا کے نوکر ہمارے نوکروں سے بھی زیادہ ٹرے ہیں۔ اس تمام قصہ سے اگر وہی ظاہری معنی مراد ہوں تو خدا کے علو مرتبہ اور تقدس اور تنزیہ میں بٹا لگتا ہے۔[3]

اصل یہ ہے کہ...... خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اس میں ہیں ان کی برائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کی اور اونٹ چرانے والوں کی فہم سے بہت دور تھا اس لئے خدا نے انسانی فطرت کی زبان حال سے آدم و شیطان کے قصے یا خدا اور فرشتوں کے مباحثے کے طور پر اس فطرت کو بیان کیا ہے تاکہ ہر کوئی' خواہ اس کو فطرت کا راز سمجھے خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ' خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا' اصلی مقصد حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔[4]

---

۱ تفسیر القرآن (۱)، ص ۶۳ ۲ ایضاً، ص ۵۴ ۳ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۱۳ ۴ تفسیر القرآن (۱)، ص ۵۴

ابلیس کی نافرمانی

اس قصہ میں جو سجدہ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی زمین پر سر ٹیکنے کے نہیں ہیں بلکہ اطاعت اور فرماں برداری یا تذلل کے ہیں۔[1]

خدا تعالیٰ نے ان قویٰ متضادہ کی جن سے انسان مرکب ہے اس طرح پر فطرت بنائی ہے کہ قویٰ ملکوتی اطاعت پذیر و فرماں بردار ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں الا قویٰ بہیمیہ نہایت سرکش اور نافرماں بردار ہیں۔ ان ہی کو قابو میں لانا اور فرماں بردار کرنا انسان کا انسانی کام ہے۔ ان کے سرکش ہونے کو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا کہیں یوں فرمایا ہے کہ اس نے اپنے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا کہیں فرمایا ہے کہ اس کافر نے غرور کیا اور کہا کہ "کیا میں ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جو سڑی مٹی سے بنی ہے؟ میں تو اس سے افضل ہوں۔ وہ تو مٹی کا پتلا ہے اور میں آگ کا پوت ہوں" ...... یہ فطرتی تضاد ان دونوں قسموں کے قویٰ میں ہے اس کے اظہار کے لئے قویٰ بہیمیہ کو بطور سخت دشمن کے قرار دیا ہے اور اس کی زبان حال سے اس کی فطرت بیان کی ہے کہ میں جب تک انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک اس کی اولاد رہے گی اس کو بہکاتا اور راست پر سے بھٹکاتا رہوں گا۔ یہ الفاظ کہ میں انسان کو دائیں بائیں آگے پیچھے غرض چہار طرف سے گھیروں گا صاف صاف ان قویٰ بہیمیہ کی فطرت کا اظہار کرتے ہیں جو انسان میں ہے اور ہر ذی عقل و ہوش غور کرنے پر خود اپنے میں یہ سب باتیں پاتا ہے اور جان سکتا ہے کہ کس طرح ان قویٰ بہیمیہ نے چاروں طرف سے اس کو گھیر رکھا ہے۔[2]

شجر ممنوعہ کا پھل

علماء اسلام نے اس کے بیان میں عجیب باتیں کی ہیں۔ جو لوگ کہ صرف لفظوں پر چلتے ہیں انہوں نے تو جنت کو ایک خیالی بہشت عالم بالا پر مان لیا اور درخت سے بھی سچ مچ کا کوئی درخت (گیہوں کا یا انگور کا یا انجیر کا) اور "ہبوط" سے عالم بالا سے زمین پر گرنا......

---

[1] تفسیر القرآن (۱)، ص ۵۷ [2] ایضاً، ص ۶۶-۶۷

ے علماء اسلام نے جن کو اس قسم کے قصص میں یہودیوں کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ہے ان کی پیروی کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ جنت زمین پر تھی اور ہبوط سے انہوں نے جنت سے باہر نکال دینے کے معنی لئے۔ معتزلہ نے اس کی جگہ بھی بتادی کہ فلسطین میں فارس و کرمان کے بیچ میں تھی، اور بعضوں نے کہا کہ سدرۃ المنتہیٰ بھی زمین ہی پر تھا۔ مگر ہم ان معنوں میں کسی کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم شروع ہی سے اس قصہ کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے بلکہ صرف انسانی فطرت کا اس فطرت کی زبان حال سے بیان قرار دیتے ہیں۔ پس انسان کا جنت میں رہنا اس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہے جب تک کہ وہ مکلّف کسی امر و نہی کا نہ تھا...... اور اس کا شجر ممنوعہ کے پاس جانا یا اس کا پھل کھانا اس کی فطرت کی اس حالت کا بیان ہے جب کہ وہ اوامر و نواہی کا مکلّف ہوا اور ہبوط سے اس کی فطرت کی اس حالت کا تبدیل ہونا مراد ہے جب کہ وہ غیر مکلّف سے مکلّف ہوا۔[1]

یہ ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ بیان فطرت انسانی کا ہے مگر عام لوگ اس راز فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے اس لئے خدا نے ابتدا سے اس راز کو ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور جو نتیجہ راز فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہیے وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے خواہ تم یہ سمجھو کہ خدا و فرشتوں میں مباحثہ ہوا اور شیطان نے خدا سے نافرمانی کی اور آدم بھی گیہوں کا درخت کھا کر خدا کا نافرمانبردار ہوا، خواہ میں یوں سمجھوں کہ اس بڑے تماشا کرنے والے نے جو بھان متی کا ایک تماشا بنایا ہے اس کے راز کو اس بھان مت کی اصطلاحوں میں بتایا ہے۔[2]

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ سچ مچ کا ایک درخت تھا اور اس کا پھل توڑ کر حوا نے کھا لیا اور آدم کو بھی کھلا دیا؟ نہیں...... حقیقت میں یہ درخت مثل باغ کے اور درختوں کے نہ تھا بلکہ بھلائی اور برائی کی پہچان کی ماہیت کے ظہور اور انکشاف کو، جو انسان پر ہوئے تھے، خدا نے بھلائی اور برائی کی پہچان کے درخت سے تعبیر کیا تھا۔ پھر اس درخت کا پھل کھانا صرف اس ماہیت کا قبول کر لینا ہے۔ انسان نے اپنی نادانی اور بے وقوفی سے خواہش کی کہ وہ صفت پہچان نیک و بد کی اس

---

۱ تفسیر القرآن (۱)، ص ۵۸-۵۹ ۲ ایضاً، ص ۷۹

میں ڈالی جائے اوراس بھاری بوجھ کے اُٹھانے پر (جسے آسمان وزمین نہ اُٹھا سکے تھے) ا
ہو گیا اور اپنے سر پر دھر لیا۔[1]

ہم مسلمان آدمؑ وحوا کی اس نافرمانی کو شرعی گناہ نہیں سمجھتے اور نہ اس واقعہ کے سبب ا
کی نسل پر گناہ کا آنا ٹھہراتے ہیں بلکہ اس واقعہ کو باعث علم خیر وشر کا انسان کی نسل کے لئے
دیتے ہیں۔[2]

معجزات وکرامات

معجزات وکرامات کی حقیقت

انسان میں ایک ایسی قوت ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے قوائے متخیلہ کی طرف تو
ہے اور پھر اس میں ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے اور ان میں طرح طرح کے خیالا
گفتگو اور صورتیں، جو کچھ اس کو مقصود ہوتی ہیں، ڈالتا ہے۔ پھر ان کو اپنے نفس موثرہ کی قوت
دیکھنے والوں کی حس پر ڈالتا ہے۔ پھر دیکھنے والے ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ گویا وہ خارج میں
ہے حالانکہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔[3]

یہ قوت بمقتضائے خلقت بعضوں میں ضعیف اور بعضوں میں قوی اور بعضوں میں
ہوتی ہے، اور جس طرح اور قوائے انسانی ورزش سے قوت پکڑتے ہیں جیسے کہ پنجہ کشی کی ا
سے پنجہ میں، کلائی کی ورزش سے کلائی میں زیادہ قوت آجاتی ہے اسی طرح اس قوت دماغ
بھی خاص قسم کی ورزش سے قوت زیادہ ہو جاتی ہے...... ان اثروں کو جب کہ مسلمانوں
ظاہر ہوتے ہیں مسلمان کرامت سے تعبیر کرتے ہیں اور جب کہ غیر مذہب والے
ہوتے ہیں اس کو استدراج سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ دونوں کی اصلیت واحد ہے...
قوت نفسی کے آثار جب انبیا علیہم السلام سے ظاہر ہوتے ہیں تو اس کو معجزہ سے تعبیر کر
ہے۔[4]

---

[1] تبیین الکلام (۲)، ص ۱۵۷ [2] ایضاً، ص ۱۷۳ [3] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۲۵ [4] ایضاً، ص ۲۲۳

معجزات وکرامات پر اعتقاد

تمام فرق اسلامیہ معجزات کوحق بیان کرتے ہیں اور سوائے معتزلیوں اور استاد ابو اسحاق اسفرائی کے، جو اہل سنت و جماعت میں سے ہیں، تمام فرقے کرامات اولیا کے بھی قائل ہیں اور شیعہ صرف دوازدہ امام علیہم السلام میں حصر کرامت کرتے ہیں۔ معتزلے اس وجہ سے کرامات کے منکر ہیں کہ اگر اولیا سے بھی کرامات ہوں تو اس میں اور معجزہ میں کچھ تمیز باقی نہیں رہتی اور پھر معجزہ ثبوت نبوت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔[1]

بہت عجیب باتیں افواہاً ایسے بزرگوں کی نسبت مشہور ہو جاتی ہیں جن کی درحقیقت کچھ اصل نہیں ہوتی مگر لوگ ان بزرگوں کے تقدس کے خیال سے ایسے موثر ہوتے ہیں کہ اس کی اصلیت کی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور بے تحقیق اس پر یقین کر لیتے ہیں۔[2]★

مذہب اسلام اس امر کا جس کو لوگ معجزہ وکرامت کہتے ہیں، سخت مخالف ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے معجزوں کا ذکر ہے، مگر وہ کیا ہیں؟ انسان کا پیدا کرنا، مینہ کا برسانا، اناج کا میووں کا اُگانا، سورج چاند ستاروں کا پیدا کرنا، اور یہی درحقیقت معجزے ہیں۔[3]

★ سرسید کے دورہ پنجاب ۱۸۸۴ء میں ان کے ہم سفر رفیق سید اقبال علی کرامات کے ضمن میں گورداس پور کا ایک واقعہ یوں تحریر کرتے ہیں: ''سید صاحب سکھوں کی ایک سنگھت میں گئے جس کو ہماری طرف کی زبان میں ''گوردوارہ'' کہنا چاہیے۔ مشہور تھا کہ وہاں دالان کی ایک دیوار ہے جو ہلانے سے ہلتی ہے اور گویا ایک کرامات کے طور پر سمجھی جاتی ہے۔ سید صاحب کا مقصد وہاں جانے سے اس دیوار کا دیکھنا تھا۔ یہ مکان بسبب اس جنباں دیوار کے ''جھولنا محل'' کے نام سے مشہور ہے۔ ہم سب وہاں گئے اور دیکھا کہ اس جگہ پختہ دو دالان آگے پیچھے بنانے تجویز ہوئے تھے۔ دونوں دالانوں کی چار دیواری اور در بن گئے تھے۔ پچھلے دالان کی چھت پٹ گئی ہے اور اگلے دالان کی چھت کسی سبب سے نہیں پٹی مگر اس کا روکار، جس میں متعدد در لدے ہوئے ہیں، نہیں پٹے۔ جب کوئی آدمی اس کی روکار پر چڑھ کر اور اس کے طول کے وسط میں بیٹھ کر ہلاتا ہے تو وہ روکار اس سبب سے کہ اس میں در زیادہ ہیں دو ڈھائی انچ کے قریب جھوکا کرتی ہے اور ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جو دیوار اس طرح کی بنی ہوئی ہو جس میں متعدد در ہوں اور اس پر چھت کا بوجھ یا اور کسی قسم کا دباؤ نہ ہو اسی طرح پر ہلے گی، مگر وہاں کے لوگوں نے اس کو گرو کی کرامات خیال کیا ہے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اسی طرف کے ایک مسلمان صاحب نے کہا کہ گرو صاحب کی کرامات نہیں ہے۔ جہاں یہ مکان ہے پہلے وہاں ایک شاہ صاحب کا تکیہ تھا۔ سکھوں نے اپنی عمل داری میں ان کو نکال دیا اور سکھ مذہب کی سنگھت بنائی، یہ ان شاہ صاحب کی کرامات ہے۔ سید صاحب نے کہا کہ اگر آپ اس کو گرو صاحب ہی کی کرامات رہنے دیں تو آپ کا کیا ہرج ہے!'' (سفرنامہ پنجاب، ص ۹۷)

۱۔ تفسیر القرآن (۳)، ص ۳۷ ۲۔ ایضاً، ص ۲۷ ۳۔ مقالات سرسید (۱)، ص ۱۲۷

کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس میں کبھی ایسے عجائبات
ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں اور کوئی سمجھ دار آدمی ان کو تس
کرے بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک
خالی ہوتا ہے۔[1]

ٹھیٹ مذہب اسلام میں جو سب سے زیادہ خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس نے اپنی
کے ثبوت میں کسی معجزے یا کرامت کا حیلہ و بہانہ نہیں کیا، گو کہ بعد کو اس کے پیروؤں
غلطی اور کم فہمی سے اس کے ساتھ کرامت اور معجزہ کا ایسا لا انتہا سلسلہ باندھ دیا اور ایس
اس کی نسبت بیان کیں جن کو خود مذہب اسلام نہ جانتا ہوگا۔[2]

انسان کے دین اور دنیا اور تمدن و معاشرت بلکہ زندگی کی حالت کو کرامت اور
یقین یا اعتقاد رکھنے سے زیادہ خراب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔[3]

حکما و فلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار کسی وجہ سے کیا ہو مگر ہمارا انکار صرف اس
نہیں ہے کہ وہ مخالف عقل کے ہیں اور اس لئے ان سے انکار کرنا ضرور ہے بلکہ ہمارا ا
بنا پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات و کرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرق عادت یعنی
فطرت یا خلاف جبلت یا خلافت خلقت یا خلاف قدرۃ التی قدرھا اللہ کے امتناع
ہے۔[4]

انبیا علیہم السلام میں معجزات کا (علی المعنی المتعارفہ) یا اولیاء اللہ میں کرامات کا یقین
(گو کہ اعتقاد کیا جائے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت ان میں دی ہے) توحید فی الصفا
نامکمل کر دیتا ہے۔[5]

ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزے یا کرامت کے ہونے کا یقین کرنا ذات با
توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور نامکمل کر دینا ہے اور اس کا ثبوت پیر پرست و گور
لوگوں کے حالات سے جو اس وقت بھی موجود ہیں اور صرف معجزہ و کرامت کے خیال
پیر پرستی و گور پرستی کی رغبت دلائی ہے اور خدائے قادر و مطلق کے سوا دوسرے کی طرف

---

۱ آخری مضامین، ص ۲۳ ۲ مقالات سرسید (۱)، ص ۱۴۳ ۳ ایضاً ۴ تفسیر القرآن (۳)
۵ ایضاً، ص ۲۹

رجوع کیا ہے اور منتیں ماننا اور نذر و نیاز چڑھانا اور ان کے نام کے نشانات بنانا اور جانوروں کی بھینٹ دینا سکھایا ہے' بخوبی حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے سچے ہادی محمد رسول اللہؐ نے اور ہمارے سچے خدا وحدہ لاشریک نے صاف صاف معجزات کی نفی کر دی تا کہ توحید کامل بندوں کو حاصل ہو۔[1]

ہم کو اور اسلام کو تو فخر اس بات پر ہے کہ ہمارے برحق پیغمبر خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس تو کوئی معجزہ و عجزہ نہیں ہے' اگر ہوگا تو خدا کے پاس ہوگا۔ ہم کو اور اسلام کو تو اس سچے ہادی پر فخر ہے جس نے نہ لکڑی کو سانپ کر دکھایا اور نہ اپنے دست مبارک کو چمکایا' نہ سچی بات پر کچھ پردہ ڈالا' نہ خدا کی قدرت کے قانون کو توڑنے کا دعویٰ کیا۔[2]

خود ہمارے سردار نے معجزوں کی نفی کی ہے پھر کس طرح ہم معجزوں کو مان سکتے ہیں! ہاں اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خدا نے انسان میں ایک ایسی قوت رکھی ہے جو دوسرے انسان میں اور دوسرے انسان کے خیال میں اثر کرتی ہے اور اس سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جو نہایت عجیب معلوم ہوتے ہیں اور جن میں سے بعض کی علت ہم جانتے ہیں اور بہت سوں کی علت نہیں جانتے بلکہ اس کے عامل بھی اس کی علت نہیں جانتے۔ اسی قوت پر اس زمانہ میں ان علم کی بنیاد قائم ہوئی ہے جو مسمریزم (Mesmerism) اور سپریچوایلزم (Spiritualism)* کے نام سے مشہور ہیں اور سابقین بھی اس کے عامل تھے مگر اس علم سے ناواقف تھے یا اس کو مخفی رکھتے تھے۔ مگر جب کہ وہ ایک قوت ہے قوائے انسانی میں سے اور ہر ایک انسان میں بالقوہ موجود ہے جیسے قوت کتابت تو اس کا کسی انسان سے ظاہر ہونا معجزہ میں داخل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو فطرت انسانی میں سے انسان کی ایک فطرت ہے۔[3]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کے) پاس' جو افضل الانبیائے والرسل ہیں' معجزہ نہ ہونے کے بیان سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین علیہم السلام کے پاس بھی کوئی معجزہ نہیں تھا۔ اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے در حقیقت وہ

---

* روحانیت

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۳۸ [2] ایضاً، ص ۲۲۰-۲۲۱ [3] ایضاً (۲)، ص ۲۴۵

معجزات نہ تھے بلکہ وہ واقعات تھے جو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوئے تھے۔[1]

بے شک ہمارے بعض اخوان کو اس پر غصہ آئے گا اور قرآن مجید میں سے بعض امو
معجزہ قرار دے کر اور ان کو مافوق الفطرت سمجھ کر پیش کریں گے اور کہیں گے کہ قرآن مجید
معجزات مافوق الفطرت موجود ہیں...... اگر وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مفسرین کے اقو
پیش کریں یا یہ کہیں کہ تیرہ سو برس سے کسی نے' صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین یا علما
مجتہدین و مفسرین نے یہ معنی نہیں کہے بلکہ خدا بھی یہ معنی نہیں سمجھا جو تم کہتے ہو تو ہم ادب
عرض کریں گے کہ اس دلیل سے ہم کو معاف رکھئے اور صرف یہ بتایئے کہ قرآن مجید کے الفا
سے اور محاورات اور استعارات سے' جو قرآن مجید میں آئے ہیں' وہ معنی جو ہم نے بیان کئے
ہوتے ہیں یا نہیں؟[2]★

حضرت ابراہیمؑ کے معجزات

حضرت جبریلؑ کا پرورش کرنا

تفسیروں میں لکھا ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ کے خوف سے' جس نے ایک خواب د
تھا اور لڑکوں کے قتل کا ارادہ کیا تھا' حضرت ابراہیمؑ کی ماں نے ان کے حمل کو چھپایا اور جب
پیدا ہونے کا وقت آیا تو ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا کر جنا اور اس کا منہ پتھروں سے بند کر د
حضرت جبریل نے حضرت ابراہیمؑ کی پرورش کی۔ جب وہ اس پہاڑی کی کھوہ میں بڑے
گئے تو اس کھوہ میں سے پہلی دفعہ رات کو ایک ستارہ دیکھا' پھر چاند دیکھا' پھر سورج دیکھا
خیال اور یہ قصہ دونوں صحیح نہیں ہیں۔[3]

آتش نمرود

انبیا و بنی اسرائیل کے قصے یہود اور مشرقی عیسائیوں میں کثرت سے مشہور تھے

★ اس حوالہ میں صحابہ و تابعین وغیرہم اور خدا سے منسوب معترضین کی جس دلیل کا ذکر کیا گیا ہے وہ
کے رفیق نواب محسن الملک سے متعلق ہے۔ (حوالہ کے لئے ملاحظہ کیجئے "تحریر فی اصول التفسیر"، ص ۱۳)

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۹ [2] تحریر فی اصول التفسیر، ص ۴۴-۴۵ [3] تفسیر القرآن (۳) ص

شبہ نہیں ہے کہ ان میں اصلی واقعات کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں بھی مل گئی تھیں جن کی کچھ اصل نہیں تھی مگر ہمارے علمائے مفسرین نے جہاں کہیں کچھ بھی موقع پایا قرآن مجید کی تفسیر ان ہی مشہور قصوں کے مطابق کر دی ..... اسی قسم کا قصہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت یہودیوں اور مشرقی عیسائیوں میں مشہور تھا۔ ہمارے علمائے مفسرین نے قرآن مجید کی آیتوں کی یہی تفسیر کی کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تھے اور وہاں سے صحیح و سلامت نکلے' حالانکہ قرآن مجید کی کسی آیت میں اس بات پر نص نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ درحقیقت آگ میں ڈالے گئے تھے۔ بے شک ان کے لئے آگ دہکائی گئی تھی اور ڈرایا گیا تھا کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلا دیں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ آگ میں ڈالے گئے' قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے۔[1]

خدا نے ہم کو قانون فطرت یہ بتایا کہ آگ جلا دینے والی ہے۔ پس جب تک یہ قانون فطرت قائم ہے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے۔[2]

مردہ پرندوں کا احیا

یہ قصہ...... ایک رویا حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ انہوں نے رویا میں خدا سے کہا کہ مجھ کو دکھلا یا بتا کہ تو کس طرح مردے کو زندہ کرے گا۔ پھر خواب ہی میں خدا کے بتلانے سے انہوں نے چار پرند جانور لئے اور ان کا قیمہ کر کے ملا دیا اور پہاڑوں پر رکھ دیا۔ پھر بلایا تو وہ سب جانور الگ الگ زندہ ہو کر چلے آئے اور ان کے دل کو مردوں کے زندہ ہونے سے' جن کے اجزا بعد مرنے کے عالم میں مخلوط و منتشر ہو جاتے ہیں' طمانیت ہو گئی۔[3]

حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش

یہ خیال کرنا کہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت سارہ کی اولاد مافوق الفطرت ہوئی تھی' اس پر قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ہے۔[4]

حضرت سارہ ادھیڑ ہو گئی تھیں اور ان کے اولاد نہ ہوئی تھی اس لئے انہوں نے حضرت

---

[1] تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۰۶-۲۰۸ [2] تحریر فی اصول التفسیر، ص ۴۰ [3] تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۹۲
[4] ایضاً (۵)، ص ۳۸

ہاجرہ کو زوجہ بنانے کی اجازت دی کہ ان ہی سے کچھ اولاد پیدا ہو۔ چنانچہ ہاجرہ سے ح
اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت سارہ بھی حاملہ ہوئیں اور حضرت اسحٰ
ہوئے۔[1]

یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سارہ ایسی حد پر پہنچ گئی تھیں جو موافق قانون قدرت ا
اولاد ہونی ناممکن ہو..... مسلمان مفسر جو بغیر غور کے یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کر
عادی ہو گئے اس لئے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کی عمر ا
بڑی ہو گئی تھی کہ ان سے اولاد کا ہونا ناممکن تھا اور اس لئے انہوں نے اس واقعہ کو بطور ایک
کے مافوق الفطرت قرار دیا ہے..... ہر گاہ قرآن مجید سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ
حالت جس میں مطابق قانون قدرت کے اولاد کا ہونا ناممکن ہو' ثابت نہیں ہے تو
یہودیوں کی روایتوں یا توریت کے استدلال پر اس کو ایک واقعہ مافوق الفطرت یقین کر
نہیں ہے۔[2]

حضرت موسیٰؑ کے معجزات

تجلیٔ الٰہی

پہاڑ پر خدا کی تجلی ہونے اور آگ کی صورت میں نزول فرمانے کی نسبت تفسیروں
بہت کچھ بھرا ہوا ہے مگر قرآن مجید میں یہ واقعہ نہایت صاف صاف اور سیدھے لفظوں میں
ہوا ہے جس میں کچھ بھی پیچیدہ بات نہیں ہے...... اگر ان قصوں اور کہانیوں سے قطع نظ
جائے جو یہودیوں نے اس کی نسبت بنالی ہیں اور ان کی کتابوں میں مندرج ہیں' اور ج
پیروی کر کے ہمارے ہاں کے مفسروں نے ان ہی قصوں کو مختلف طرح پر اپنی تفسیروں م
دیا ہے' اور صرف قرآن مجید کی آیتوں پر غور کیا جائے تو ان آیتوں سے مندرجہ ذیل امور
جاتے ہیں:

۱۔ موسیٰؑ نے جو آگ دیکھی تھی حقیقت میں وہ آگ ہی تھی۔ نہ خدا تھا اور نہ خدا

[1] خطبات احمدیہ، ص ۱۱۲ [2] تفسیر القرآن (۵)، ص ۳۸-۴۰

...ہ ہرے سبز درخت میں سے وہ آگے روشن ہوئی تھی' اور درخت نہیں جلتا تھا جیسا کہ لوگ ...ں کرتے ہیں..... طور سینا آتشیں پہاڑ تھا۔ اس میں سے جو لو نکلی ہوگی اس کو حضرت موسیٰ ... دیکھ کر یہ بات کہی کہ میں نے آگ دیکھی ہے' وہاں سے کوئی خبر یا تھوڑی سی آگ لے کر ...ا ہوں۔

۲- جو آواز موسیٰؑ کو وہاں آئی یا جو کلام خدا نے موسیٰ سے کیا اس کو اس آگ سے کچھ ...ق نہ تھا..... اس بات کا قرار دینا کہ وہ آواز آگ میں سے آئی تھی' کسی طرح قرآن مجید ...ے نہیں پایا جاتا۔

۳- چونکہ خدا کا وجود اس کی تمام مخلوقات سے' اور خصوصاً ایسی مخلوق سے جو لوگوں کی ...نکھ میں زیادہ تر عجیب ہیں' ثابت ہوتا ہے اس لئے خدا نے حضرت موسیٰ کو اس عجیب مخلوق کی ...رف متوجہ کیا جو اُن کے قریب موجود تھی اور جس سے خدا کی شان وقدرت ظاہر ہوتی تھی' یعنی ...ں آتشیں پہاڑ کی طرف جو روشن ہونا شروع ہوا تھا اور جس کی لو کو حضرت موسیٰ دیکھ کر آگ ...ینے دوڑے تھے۔ مگر جب وہ پہاڑ بھڑکا اور گرجا اور اس کے پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرے تو ...ضرت موسیٰؑ غش کھا کر گرے۔[1]

...عصا کا سانپ دکھائی دینا

یہ کیفیت جو حضرت موسیٰؑ پر طاری ہوئی اسی قوت نفس انسانی کا ظہور تھا جس کا اثر ... ...ر ہوا تھا۔ یہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا ... معجزہ کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا ... پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو۔ حضرت موسیٰؑ ... روئے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے اثر ظاہر ہو... انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ ان کو سانپ یا اژدہا ... دی۔ یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا۔ وہ لکڑی لکڑی ہی تھی' اس میں فی الواقع کچھ ... نہیں ہوئی تھی۔[2]

---

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۴۰-۲۴۴ [2] ایضاً، ص ۲۴۴

جادوگروں سے مقابلہ

اس قصہ میں جو کچھ بیان ہے وہ نفس انسانی کی قوت کا ظہور ہے اور اس وجہ ۔
زمانہ کے کافر اس کو بھی سحر سمجھتے تھے' قرآن مجید میں اس پر لفظ سحر کا اطلاق ہوا ہے ورنہ در
وہ امور جو فرعون کے ساحروں نے کیئے اور جو امر کہ حضرت موسیٰ ؑ نے کیا' وہ ظہور قو
انسانی کا تھا مگر چونکہ انبیا علیہم السلام میں از روئے خلقت کے وہ قوت اقویٰ ہوتی ہے ا
حضرت موسیٰ سحرہ فرعون پر غالب آئے۔[1]

درحقیقت وہ لاٹھیاں یا رسیاں سانپ یا اژدہے نہیں ہوگئی تھیں بلکہ بسبب تاثیر قو
انسانی کے' جو ساحروں نے کسب سے حاصل کی تھی' وہ رسیاں اور لاٹھیاں لوگوں کو سا
اژدہے معلوم ہوتی تھیں۔[2]

ید بیضا

قرآن مجید کے الفاظ سے...... پایا جاتا ہے کہ لاٹھیاں اور رسیاں اسی قوت متخ
سبب سانپ یا اژدہے دکھائی دی تھیں تو ید بیضا کا مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس
لوگوں کو اس طرح پر دکھائی دینا اسی قوت نفس انسانی تصرف قوت متخیلہ کا سبب تھا' نہ یہ کہ
معجزہ مافوق الفطرت تھا اور درحقیقت حضرت موسیٰ ؑ کے ہاتھ کی ماہیت بدل جاتی تھی۔[3]

پانی کا پھٹ جانا

بہت لوگوں نے یہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھے ہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ نے دریائے نیل ۔
کیا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے بلکہ انہوں نے بحر احمر کی ایک شاخ سے عبور کیا تھا۔ تمام مف
حضرت موسیٰ ؑ کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے
خلاف قانون قدرت واقع ہوا ہو' جس کو انگریزی میں ''سپر نیچرل'' (super-natural)
کہتے ہیں' اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری' وہ پھٹ گیا اور پا
دیوار یا پہاڑ کے ادھر ادھر کھڑا ہو گیا اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا اور حضرت موسیٰ

★ مافوق الفطرت

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۵۴ [2] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۲۴ [3] ایضاً، ص ۲۲۵

لام بنی اسرائیل اس رستہ سے پار اتر گئے۔ فرعون بھی اسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر میں مل گیا اور سب ڈوب گئے۔ اگر درحقیقت یہ واقعہ خلاف قانونِ قدرت واقع ہوا تھا تو خدا تعالیٰ سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ مثل زمین کے اس پر سے چلے جاتے۔ خشک رستہ نکالنے ی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اس کو تعبیر کرو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوا تھا۔ جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا۔[1]

اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ کے لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی، اور لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ علمائے اسلام تفسیروں میں اور خصوصاً بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی پیروی کرنے کے عادی تھے اور قرآن مجید کے مطالب کو خواہ نخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی روایتوں کے موافق کرتے تھے اس لئے انہوں نے اس جگہ بھی...... اس سیدھے سادے معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا۔[2]

جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تو راتوں رات حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کو نوک میں سے...... پار اتر گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بسبب جوار بھاٹے کے، جو سمندر میں آتا رہتا ہے، اس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب رہ جاتی تھی۔ بنی اسرائیل پایاب و خشک راستہ سے راتوں رات بہ امن اتر گئے...... صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اتر گئے، اس نے بھی ان کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیاں اور سوار و پیادے غلط راستے پر سب دریا میں ڈال دیئے اور وہ وقت پانی کے بڑھنے کا تھا۔ لحہ لحہ میں پانی بڑھ گیا، جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑھتا ہے، اور ڈباؤ ہو گیا جس میں فرعون اور اس کا لشکر ڈوب گیا۔[3]

پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسی مشکل کے وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ کو اور تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔[4]

---

[1] تفسیر القرآن (۱)، ص ۷۱ [2] ایضاً، ص ۸۳-۸۵ [3] ایضاً، ص ۹۹ [4] ایضاً، ص ۸۹

حضرت یونسؑ کے معجزات

مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنا

یہودی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت یونسؑ کو بغیر چبائے سالم کا سالم مچھلی نگل گئی۔[1]
حضرت یونسؑ کے قصے میں اس بات پر قرآن مجید میں کوئی نص صریح نہیں ہے
در حقیقت مچھلی ان کو نگل گئی تھی۔[2]
یہودیوں کا اعتقاد ہے کہ مچھلی نے تین دن کے بعد حضرت یونسؑ کو دریا کے کنارے
اگل دیا مگر قرآن مجید سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا بلکہ قرآن مجید میں حضرت یونس کا دریا کے
پر میدان میں ڈالنا خدا نے مچھلی کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی طرف منسوب کیا ہے۔[3]

فی الفور سایہ دار درخت کا اُگنا

قرآن مجید سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ جس وقت حضرت یونسؑ دریا کے کنارے پر
پر میدان میں آ گئے اسی وقت فی الفور خدا نے ان پر سایہ کرنے کو ایک بیل دار درخت اُگا دیا
فی الفور بڑا ہوا اور ان پر سایہ کر لیا۔[4]

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات

بن باپ کے پیدائش

عیسائی اور مسلمان دونوں خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ صرف خدا کے حکم سے عام
انسانی پیدائش کے برخلاف بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔[5]
ابتدا میں عیسائیوں کو یہ خیال نہیں تھا کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے ہیں۔[6]
اس بات کو خود حواری حضرت عیسیٰؑ کے اور تمام عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کا

۱۔ تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۲۵ ۲۔ تحریر فی اصول التفسیر، ص ۵۷ ۳۔ تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۲۶
۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً (۲)، ص ۲۲ ۶۔ ایضاً، ص ۲۴

خطبہ یوسف سے ہوا تھا۔[1]

حضرت مسیحؑ کے زمانہ کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں، نہ کہ بغیر باپ کے، مگر وہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا روحانی اعتبار سے کہتے تھے...... زمانہ کے گزرنے پر وہ خیال جس سے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہا، محو ہو گیا اور لوگ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھنے لگے اور اسی کے ساتھ یہ قرار دیا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔[2]

میرے نزدیک قرآن مجید سے ان کا بے باپ ہونا ثابت نہیں ہے۔[3]

قرآن مجید نے اس بات میں کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے، کچھ بحث نہیں کی...... جہاں تک کہ اشارہ ہے، حضرت عیسیٰؑ کے روح القدس اور کلمۃ اللہ ہونے کا اور حضرت مریم کی عصمت وطہارت کا اشارہ ہے۔[4]

فرشتہ کا حضرت مریم کو بیٹا ہونے کی بشارت دینا اور ان کا یہ کہنا کہ مجھے مرد نے نہیں چھوا ہے...... رویا میں واقع ہوا تھا...... بیٹا ہونے کی بشارت حضرت اسحٰقؑ کو اور انکی بیوی کو اور حضرت زکریاؑ کو بھی دی گئی تھی۔ پس صرف بشارت سے تو بے باپ کے پیدا ہونا لازم نہیں آتا ہے...... جس زمانہ میں بشارت ہوئی اس زمانہ میں بلاشبہ حضرت مریم کو کسی مرد نے نہیں چھوا تھا بلکہ غالباً ان کا خطبہ بھی یوسف کے ساتھ نہ ہوا تھا، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی یہ امر واقع نہیں ہوا...... کیا عجب ہے کہ اس خواب کے بعد ہی حضرت مریم کو اور ان کے مربیوں کو حضرت مریم کی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو جو آخرکار یوسف کے ساتھ عقد ہونے سے پورا ہوا۔[5]

قانون فطرت نے یہ بتایا ہے کہ جوڑے سے یعنی زن و مرد سے اور نطفہ کے ایک مدت معین تک مقرر جگہ میں رہنے سے انسان پیدا ہوتا ہے، پس اس قانون فطرت کے برخلاف اسی طرح نہیں ہو سکتا جس طرح کہ قولی وعدہ کے برخلاف نہیں ہو سکتا۔[6]

حضرت مریم...... حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔[7]

---

[1] تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۷ [2] ایضاً (۲)، ص ۳۰-۳۱ [3] مکتوباتِ سرسید (۲)، ص ۱۱۶ [4] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲ [5] ایضاً، ص ۳۲-۳۳ [6] تحریر فی اصول التفسیر، ص ۳۹ [7] تفسیر القرآن (۲)، ص ۳۶

مہد میں کلام

قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایسی عمر میں جس میں حسب نا
انسانی کوئی بچہ کلام نہیں کرتا، کلام کیا تھا۔[1]
صرف لفظ "مہد" کا ہے جس پر بحث ہو سکتی ہے مگر مہد سے صرف صغرسنی کا زمانہ مر
نہ وہ زمانہ جس میں کوئی بچہ بمقتضائے قانون قدرت کلام نہیں کر سکتا۔[2]

مٹی کے پرندوں میں جان ڈالنے کا عمل

اس پر بحث یہ ہے کہ کیا درحقیقت یہ کوئی معجزہ تھا اور کیا درحقیقت قرآن مجید سے ا
کے جانوروں کا جاندار ہونا اور اُڑنے لگنا ثابت ہوتا ہے؟ تمام مفسرین اور علمائے ا
جواب یہ ہے کہ ہاں۔ مگر ہمارا جواب ہے کہ نہیں، بشرطیکہ دل و دماغ کو ان خیالات ـ
قرآن مجید پر غور کرنے اور قرآن مجید کا مطلب سمجھنے سے پہلے عیسائیوں کی صحیح و غلط روایا
تقلید سے بٹھالئے ہیں، خالی کر کے نفس قرآن پر بنظر تحقیق غور کیا جائے۔[3]
جب تاریخانہ تحقیق کی نظر سے اس پر غور کی جاتی ہے تو اصل بات صرف اس قدر
ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بچپنے میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مٹی کے جانور بناتے تھے او
کبھی کبھی اب بھی ایسے موقعوں پر بچے کھیلنے میں کہتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈال دے
بھی کہتے ہوں گے...... قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا جس سے معلوم ہو
کہ یہ کوئی امر وقوعی نہ تھا بلکہ صرف حضرت مسیحؑ کا خیال زمانہ طفولیت میں بچوں کے ساتھ
میں تھا۔ علمائے اسلام ہمیشہ قرآن کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق
کرنے کے مشتاق تھے اور بلا تحقیق ان روایتوں کی تقلید کرتے تھے۔ انہوں نے ان الفا
اس طرح تفسیر کی جس طرح غلط سلط عیسائیوں کی روایتوں میں مشہور تھی اور اس پر خیال نہ
کہ خود قرآن مجید ان روایتوں کی غلطی کی تصحیح کرتا ہے...... نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ ا
ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بچپنے کی حالت میں مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے تھ

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۳۷ [2] ایضاً، ص ۲۳۴ [3] ایضاً، ص ۲۳۵

(پ)ھنے والے سے کہتے تھے کہ میرے پھونکنے سے وہ پرند ہو جائیں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت (و)ہ پرند ہو بھی جاتی تھیں، نہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے نہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ پس حضرت (ع)یسیٰؑ کا یہ کہنا ایسا ہی تھا جیسا کہ بچے اپنے کھیلنے میں بمقتضائے عمر اس قسم کی باتیں کیا کرتے (ہ)یں۔[1]

(ا)ندھوں اور کوڑھیوں کی صحت یابی

موجودہ انجیلوں پر تاریخانہ تحقیق سے نظر ڈالی جائے تو اس سے زیادہ سچ اور کچھ نہیں (م)علوم ہوتا کہ یہودی ہمیشہ جھاڑ پھونک کی عادت رکھتے تھے۔ بیماروں کے لئے دعائیں پڑھ کر (ا)ن کی صحت کے لئے ان پر دم ڈالتے تھے، لوگوں کو برکت دیتے تھے۔ لوگ کاہنوں اور اماموں (ا)ور مقدس لوگوں کے ہاتھ چومنے، پاؤں کو ہاتھ لگانے، کپڑے کو چھونے یا بوسہ دینے سے برکت لیتے تھے جیسے کہ اب بھی رومن کیتھولک فرقہ میں رواج ہے۔ ان ہی کی تقلید سے مسلمانوں میں بھی اس قسم کی بہت سی باتیں رائج ہو گئی ہیں۔ اسی دستور کے موافق حضرت عیسیٰؑ بھی بیماروں کو دعا دیتے تھے، ان پر دم ڈالتے تھے، برکت دیتے تھے۔ لوگ ان کے ہاتھوں کو برکت لینے کے لئے چومتے تھے، قدموں کو ہاتھ لگاتے، کپڑے کو چھوتے تھے یا چومتے تھے۔ پس یہ ایک معمولی بات تھی۔ اس بیان کے ساتھ اس بات کا اضافہ کرنا کہ جو اس طرح کرتا تھا فی الفور چنگا ہو جاتا تھا، اندھے آنکھوں والے ہو جاتے تھے اور کوڑھی اچھے ہوتے تھے، اس قسم کی مبالغہ آمیز تحریریں ہیں جیسے کہ ایسے بزرگوں کے حالات لکھنے والے لکھا کرتے ہیں۔[2]

اندھے، لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے کو اور کبڑے اور ٹھنگنے اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی...... یہ سب ناپاک اور گنہ گار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو، کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے، چوڑی ناک کے ہوں یا پتلی ناک کے، کبڑے ہوں یا سیدھے، ٹھنگنے ہوں یا لمبے، پھلی والے ہوں یا جالے والے،

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۳۸-۲۴۰ [2] ایضاً، ص ۲۴۴

سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی تھی۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم
اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ سے نہیں روکا۔ پس یہی ان کوڑھیوں اور اندھوں
کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا۔ جہاں جہاں انجیلوں میں بیماروں کے اچھا کرنے
ہے اس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں ان کے یہی معنی ہیں۔[1]

مُردوں کا احیا

انسان کی روحانی موت اس کا کافر ہونا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ خدا کی وحدانیت تعلیم
اور خدا کے احکام بتانے سے لوگوں کو اس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت
سے نکالتے تھے۔[2]

ہم نے ...... اس مقام پر موت سے کفر اور حیات سے ایمان مراد لیا ہے۔[3]

غائب کی خبروں کا بیان

علمائے مفسرین ......، جو اپنی تفسیر میں عجیب و لایعنی باتوں کا لکھنا اپنا فخر سمجھتے ہیں
کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ چھٹپنے ہی سے مخفی باتوں کی خبر دے دیا کرتے تھے۔ لڑکوں کو جو
ساتھ کھیلتے تھے، بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور تمہارے ماں باپ نے فلاں چیز
مٹھائی) تم سے چھپا کر رکھ چھوڑی ہے۔ وہ لڑکے گھر میں آ کر ماں باپ سے ضد کرتے
وہ چیز نکلتی تھی اور وہ لے لیتے تھے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا کہ جب مائدہ نازل ہوا تو اس
کے کھانے کو جمع کرنے کا حکم نہ تھا مگر لوگ، جن پر مائدہ اترا تھا، اس کو جمع کر رکھتے تھے
حضرت عیسیٰؑ بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمار۔
جو نہایت اعلیٰ درجہ کا علم و فضل رکھتے تھے، کیونکر ایسی بے ہودہ باتیں لکھ گئے ہیں۔[4]

یہود اور علمائے یہود طرح بطرح کے حیلوں اور فریبوں سے ناجائز طور پر لوگوں کا
مارتے تھے، لوگوں کا مال کھاتے تھے، اپنے گھروں میں مال مار کر روپیہ و دولت جمع کرتے
جو بالکل حرام و ناواجب تھا...... پس اسی حرام خوری اور حرام کا مال جمع کرنے کی نسبت

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۴۶-۲۴۷ [2] ایضاً ص ۲۴۷ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۲۴۸

عیسیٰؑ نے فرمایا کہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو یعنی بتاؤں گا کہ حرام کا مال مارتے ہو اور حرام کی دولت اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو نہ کہ یہ بتاؤں گا کہ تمنے کیا کھایا ہے اور کیا گھر میں رکھا ہے...... افسوس ہے کہ علمائے اسلام نے اس کو بھی ایک افسانہ اور خیالی معجزہ کر کے بیان کیا ہے مگر جس کو خدا نے بصیرت دی ہے وہ صاف سمجھتا ہے کہ...... اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے۔[1]

آسمان پر زندہ اُٹھ جانا

حضرت مسیحؑ کے واقعات میں جیسے کہ آپ کی ولادت کا مسئلہ بحث طلب ہے ویسا ہی آپ کی وفات کا مسئلہ بھی غور کے لائق ہے۔ یہودی یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ عیسائی یقین رکھتے ہیں کہ یہودیوں نے ان کو صلیب پر چڑھایا اور وہ صلیب پر ہی مر گئے۔ پھر صلیب پر سے اتار کر قبر میں دفن کیا، پھر وہ جی اُٹھے۔ جمہور مسلمین کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے...... ظاہراً معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے اعتقاد میں چنداں تفاوت نہیں ہے کیونکہ دونوں حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔[2]

حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں نے نہ سنگ سار کر کے قتل کیا، نہ صلیب پر قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا۔[3]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

معراج النبی کا واقعہ

بہت بڑا گروہ علما کا اس بات کا قائل ہے کہ معراج ابتدا سے انتہا تک حالت بیداری میں اور بجسدہ ہوئی تھی مگر اس کے ثبوت کے لئے ان کے پاس ایسی ضعیف دلیلیں ہیں جن سے

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۴۹ [2] ایضاً، ص ۴۰-۴۲ [3] ایضاً، ص ۴۸

امر مذکور ثابت نہیں ہوسکتا۔[1]

قرآن مجید میں کہیں بیان نہیں ہوا ہے کہ اسرا یا معراج بجسدہ وحالت بیداری م
تھی۔[2]

ایک قلیل گروہ علما و محدثین کا یہ مذہب ہے کہ معراج ابتدا سے انتہا تک سونے کی
میں ہوئی تھی یعنی وہ ایک خواب تھا' رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا' مگر اس کی
ایسی قوی ہیں کہ جو شخص ان پر غور کرے گا وہ یقین کرے گا کہ تمام واقعات معراج س
حالت یعنی خواب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھے تھے۔[3]

اصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے معراج کی بہت سی باتیں' جو خواب میں دیکھی ہ
لوگوں سے بیان کی ہوں گی۔ من جملہ ان کے بیت المقدس میں جانا اور اس کو دیکھنا ب
فرمایا ہوگا۔ قریش سوائے بیت المقدس کے اور کسی حال سے واقف نہیں تھے اس لئے
نے امتحاناً آں حضرتؐ سے بیت المقدس کے حالات دریافت کئے۔ چونکہ انبیا کے خوا
اور سچے ہوتے ہیں آں حضرتؐ نے جو کچھ بیت المقدس کا حال خواب میں دیکھا تھا' بیان
معراج کے متعلق جس قدر حدیثیں ہیں ان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
جبریل کا ہاتھ پکڑ کر' خواہ براق پر سوار ہو کر یا پرند جانور کے گھونسلے میں بیٹھ کر' جو درخت
ہوا تھا' بیت المقدس تک جانا اور وہاں سے بجسدہ آسمانوں پر تشریف لے جانا یا بذریع
سیڑھی کے' جو آسمان تک لگی ہوئی تھی' چڑھ جانا خلاف قانون فطرت ہے۔[5]

معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے وہ اس قدر ہے
خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انہو
درحقیقت اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں۔ خواہ وہ شخص ان نشانیوں کو
نشانیاں کہے' خواہ ان نشانیوں کے دیکھنے سے عمدہ ترین احکام کا وحی ہونا مراد لے مگر اس
یقین رکھنا چاہئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خواب میں دیکھا یا جو وحی
انکشاف ہوا وہ بالکل سچ اور برحق ہے۔[6]

۱۔ تفسیر القرآن (۶)، ص ۷۵ ۲۔ ایضاً، ص ۸۰ ۳۔ ایضاً، ص ۹۴ ۴۔ ایضاً، ص ۹۲ ۵۔ ایضاً،
۶۔ خطبات احمدیہ، ص ۴۲۷

ق قمر

شق قمر کا ہونا محض غلط ہے اور بانی اسلام نے کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا۔[۱]

ایۂ ابر

یہ روایت کہ آں حضرتؐ پر بادل کا سایہ رہتا تھا، محض باطل ہے۔ اگر ایسا امر فی الحقیقت
قع ہوا کرتا تو آں حضرتؐ کے اکثر صحابہ و رفقا اس کا تذکرہ کرتے اور احادیث مستندہ میں اس
کا ذکر ہوتا حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ تمام معتبر حدیثوں میں اس کا کچھ ذکر نہیں ہے۔[۲]

یگر معجزات

کسریٰ کے محل کے کنگوروں کا گرنا، آتش کدہ کی آگ کا بجھنا، ساوہ کے چشمہ کا خشک
ونا، بحیرا کا آں حضرتؐ کو نبی ہونے کی خوش خبری دینا، درختوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا، ایک
رخت کے سایہ میں اترنے کے سبب میسرہ کا آپ کو پیغمبر ہونے کی خبر دینا، دھوپ روکنے کو دو
رشتوں کا سایہ کرنا، جبریل کا تین دفعہ بغل میں بھینچنا...... ان میں سے کوئی بات بھی ان اصول
کے مطابق جو صحت روایات کے لئے درکار ہیں...... ثابت نہیں ہے۔[۳]

موضوع روایات

حضرت آدمؑ کا وطن

ہمارے ہم وطن عوام الناس میں جو یہ بات مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جزیرہ
سراندیپ یعنی لنکا میں رہے تھے، یہ محض غلط اور بے اصل بات ہے جس کا پتہ نہ توریت مقدس
سے اور نہ ہمارے ہاں کی مذہبی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔[۴]

---

۱ تصانیف احمدیہ، حصہ (۱) جلد (۱)، ص ۲۱ ۲ خطبات احمدیہ، ص ۳۲۵ ۳ تصانیف احمدیہ، حصہ [illegible]
(۱)، ص ۲۱ ۴ تبیین الکلام (۲)، ص ۱۲۳

امر مذکور ثابت نہیں ہو سکتا۔[1]

قرآن مجید میں کہیں بیان نہیں ہوا ہے کہ اسرا یا معراج بجسدہ وحالت بیداری م
تھی۔[2]

ایک قلیل گروہ علما و محدثین کا یہ مذہب ہے کہ معراج ابتدا سے انتہا تک سونے کی
میں ہوئی تھی یعنی وہ ایک خواب تھا' رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا' مگر اس کی
ایسی قوی ہیں کہ جو شخص ان پر غور کرے گا وہ یقین کرے گا کہ تمام واقعات معراج سو
حالت یعنی خواب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھے تھے۔[3]

اصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے معراج کی بہت سی باتیں' جو خواب میں دیکھی ہ
لوگوں سے بیان کی ہوں گی۔ من جملہ ان کے بیت المقدس میں جانا اور اس کو دیکھنا بھ
فرمایا ہوگا۔ قریش سوائے بیت المقدس کے اور کسی حال سے واقف نہیں تھے اس لئے
نے امتحاناً آں حضرتؐ سے بیت المقدس کے حالات دریافت کئے۔ چونکہ انبیا کے خوا
اور سچے ہوتے ہیں آں حضرتؐ نے جو کچھ بیت المقدس کا حال خواب میں دیکھا تھا' بیان

معراج کے متعلق جس قدر حدیثیں ہیں ان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
جبریل کا ہاتھ پکڑ کر' خواہ براق پر سوار ہو کر یا پرند جانور کے گھونسلے میں بیٹھ کر' جو درخت
ہوا تھا' بیت المقدس تک جانا اور وہاں سے بجسدہ آسمانوں پر تشریف لے جانا یا بذر
سیڑھی کے' جو آسمان تک لگی ہوئی تھی' چڑھ جانا خلاف قانون فطرت ہے۔[5]

معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے وہ اس قدر ہے
خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انہو
درحقیقت اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں۔ خواہ وہ شخص ان نشانیوں کو
نشانیاں کہے' خواہ ان نشانیوں کے دیکھنے سے عمدہ ترین احکام کا وحی ہونا مراد لے' مگر اس
یقین رکھنا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خواب میں دیکھا یا جو دل
انکشاف ہوا وہ بالکل سچ اور برحق ہے۔[6]

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۵۷ [2] ایضاً، ص ۸۰ [3] ایضاً، ص ۹۴ [4] ایضاً، ص ۹۲ [5] ایضاً،
[6] خطبات احمدیہ، ص ۴۲۷

ق قمر

شق قمر کا ہونا محض غلط ہے اور بانی اسلام نے کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا۔[۱]

ایۂ ابر

یہ روایت کہ آں حضرتؐ پر بادل کا سایہ رہتا تھا' محض باطل ہے۔ اگر ایسا امر فی الحقیقت قع ہوا کرتا تو آں حضرتؐ کے اکثر صحابہ و رفقا اس کا تذکرہ کرتے اور احادیث مستندہ میں اس کا ذکر ہوتا حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ تمام معتبر محدثوں میں اس کا کچھ ذکر نہیں ہے۔[۲]

یگر معجزات

کسریٰ کے محل کے کنگوروں کا گرنا' آتش کدہ کی آگ کا بجھنا' ساوہ کے چشمہ کا خشک ونا' بحیرا کا آں حضرتؐ کو نبی ہونے کی خوش خبری دینا' درختوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا' ایک رخت کے سایہ میں اترنے کے سبب میسرہ کا آپ کو پیغمبر ہونے کی خبر دینا' دھوپ روکنے کو دو رشتوں کا سایہ کرنا' جبریل کا تین دفعہ بغل میں بھینچنا...... ان میں سے کوئی بات بھی ان اصول کے مطابق جو صحت روایات کے لئے درکار ہیں...... ثابت نہیں ہے۔[۳]

موضوع روایات

حضرت آدمؑ کا وطن

ہمارے ہم وطن عوام الناس میں جو یہ بات مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جزیرہ سراندیپ یعنی لنکا میں رہے تھے' یہ محض غلط اور بے اصل بات ہے جس کا پتہ نہ توریت مقدس سے اور نہ ہمارے ہاں کی مذہبی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔[۴]

---

۱ تصانیف احمدیہ، حصہ (۱) جلد (۱)، ص ۲۱ ۲ خطبات احمدیہ، ص ۴۴۵ ۳ تصانیف احمدیہ حصہ (۱) جلد (۱)، ص ۲۱ ۴ تبیین الکلام (۲)، ص ۱۲۴

پیدائش حوا

تمام حیوانات کی پیدائش ابتدا میں مٹی کے خمیر سے معلوم ہوتی ہے اور اس لئے
کوئی حیوان، جن میں انسان بھی داخل ہے، توالد سے پیدا نہیں ہوا بلکہ ہر ایک کو تولید
اس کے بعد قانون قدرت اس طرح پر جاری ہوا کہ ان متولد حیوانات میں سے جن
مادہ نہیں تھا، ان کی تولید بغیر جوڑے کے ہونی جاری رہی، جیسے کہ اب تک حشرات
ہوتی ہے، اور جن حیوانات میں نطفہ کا مادہ تھا ان کا جوڑا اول تولید سے پیدا ہوا، اس کے
سے۔ قرآن مجید بھی اسی پر ناطق ہے...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد میں سے عورت
ہوئی بلکہ مرد اور عورت دونوں ابتدا میں مٹی سے پیدا ہوئے اور بعد خلق ان کا جوڑا ہوا۔[1]

حضرت آدمؑ کے پہلوٹے بیٹے کا نام

اکثر لوگ سمجھتے ہیں اور بعض مفسرین کی بھی یہی رائے ہے کہ...... حضرت حوا
آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس امر کے قرار دینے کے بعد تفسیروں میں حضرت
شیطان کا قصہ لکھا ہے جو قریب زمانہ وضع حمل کے واقع ہوا اور اس کے بہکانے سے
وحضرت آدمؑ نے اپنے پہلوٹے بیٹے کا نام عبدالحرث یعنی عبدالشیطان رکھا۔ یہ سمجھنا
بالکل لغو اور غلط ہے۔[2]

ناقۂ صالحؑ کی عجیب وغریب خصوصیت

مفسرین اور مورخین کا بیان ہے کہ کفار نے حضرت صالحؑ سے ان کی رسالت
ثبوت میں اس معجزہ کی درخواست کی تھی کہ اگر اس پہاڑی میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو
پیدا ہونے کے ایک سرخ بالوں کا بچہ جنے اور وہ بچہ اسی وقت ہمارے سامنے بڑی
برابر ہو کر چرتا پھرے اور ہم اس اونٹنی کا دودھ پئیں، تب ہم ایمان لائیں گے۔ یہ روایت
ساختہ اور مصنوعی ہے...... اس کی صحت پر کوئی سند نہیں ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی
عجیب واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ہوتا یا کسی مستند حدیث سے اس کا ثبوت پایا

---

[1] خلق الانسان، ص ۴-۵   [2] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۸۴

ح یہ بھی مصنوعی بات ہے کہ اس اونٹنی سے انسان اور حیوان دونوں ڈرتے تھے اور وہ اونٹنی ثمود کے تمام چشموں اور حوضوں کا پانی ایک گھونٹ میں پی کر سب کو سکھا دیتی تھی۔[1]

اس سانڈنی کا معجزہ ہونا اور خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت پیدا ہونا کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام قصہ حضرت صالح ؑ کا بیان کیا اور جو بات سے مقدم اور سب سے زیادہ عجیب تھی کہ پہاڑ کو فی الفور اونٹنی کا حمل رہا اور وہ مثل حاملہ پیٹ کے پھولنا شروع ہوا اور شق ہو گیا اور اونٹنی پلی پلائی ساٹھ گز چوڑی اور معلوم نہیں کس سی سنڈ مسٹنڈ اس میں سے پیدا ہوئی اور پیدا ہوتے ہی اپنے برابر کا بچہ جنا...... اس کا بیان چھوڑ دیا اور مفسرین کو اس کا الہام کیا کیونکہ انہوں نے بغیر غور و فکر اور بغیر کسی معتبر سند کے قصہ کو لکھا ہے جو بغیر الہام کے اور کسی طرح لکھا نہیں جا سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ ہمارے روں نے ایسے ہی لغو، بے معنی قصوں کو قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر کے مسائل مستحکمہ م کو مضحکہ اطفال بنایا ہے اور اس کے نور عالم افروز کو گرد و غبار سے دھندلا کر دیا ہے۔ خدا ان کرے، آمین۔[2]

رت ابراہیم ؑ کے والد کا نام

قرآن مجید میں آزر کو حضرت ابراہیم ؑ کے 'اب' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر قرآن مجید میں کا اطلاق باپ اور چچا دونوں پر آیا ہے...... ظن غالب ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کے باپ کا رح'' تھا۔[3]

ر کعبہ کے مراحل

مسلمانوں میں بہت سی ایسی روایتیں، جو دیو و پری کے قصہ سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، د ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ کعبہ پہلے عرش کے نیچے چار ستون کے چوکھبے کی طرح بنایا تھا۔ اس کے ستون زبرجد کے تھے اور یاقوت احمر کی پچی کاری سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس کا نام تو 'بیت المعمور' ہوا' پھر خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین پر اسی کے مقابل اتنا ہی بڑا

---

[1] ت احمدیہ، ص ۳۸ [2] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۰۰-۲۰۱ [3] ایضاً، ص ۵۶

اوراسی شکل کا گھر بناؤ۔ انہوں نے بنایا اور وہ اس جگہ بنایا تھا جہاں اب کعبہ ہے۔ مگر
کہ وہ فرشتے اچھے انجینئر نہ تھے۔ حضرت آدمؑ کے پیدا ہوتے ہوتے وہ گھر نہ رہا تھا
آدمؑ کو پھر بنانا پڑا مگر نوحؑ کے طوفان نے پھر اس کو ڈھادیا، تب نوحؑ نے بنایا۔ پھر
ٹوٹتا ڈہتا رہا۔ یہ سب جھوٹی روایتیں ...... ہیں جن میں سے ایک جگہ کی بھی کچھ اصل نہیں

کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب کعبہ بنایا تو صرف
دیواریں بنائی تھیں، چھت اس پر نہیں تھی۔ بنی جرہم کے زمانہ میں پہاڑی نالہ کے
حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا کعبہ ڈھے گیا۔ تب بنی جرہم نے اس کو پھر تعمیر کیا۔ پھر وہ عما
زمانہ میں، جو ایک قبیلہ بنی حمیر کا تھا، ڈھے گیا۔ تب عمالیق نے اس کو بنایا۔ پھر اس
نقصان آ گیا تو قصی نے اس کو تعمیر کیا۔ پھر آگ لگنے کے سبب کعبہ جل گیا اور قریش
تعمیر کیا۔ اس زمانہ میں آں حضرت صلعم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کی عمر تخمیناً بارہ چود
تھی۔ یزید کے زمانہ میں جب کعبہ پر فوج کشی ہوئی تو پھر کعبہ جل گیا اور عبداللہ ابن
اس کو تعمیر کیا، مگر حجاج بن یوسف نے عبدالملک ابن مروان کے وقت میں عبداللہ
عمارت کو ڈھا ڈالا اور از سرنو اس کو اسی طرح پر بنادیا جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھا
عمارت موجود ہے وہ حجاج بن یوسف کی بنائی ہوئی ہے۔[2]

حجر اسود کا ورود

مسلمانوں کی کتابوں میں اس پتھر کی نسبت نہایت قصہ آمیز روایتیں لکھی ہیں
اور ابن ماجہ و داری میں بھی چند عجیب عجیب روایتیں آئی ہیں۔ جیسا کہ یہ پتھر نہایت
حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ منسوب ہونے سے قدیمی ہونے پر تقدس اور زیادہ ہوگیا۔
لوگوں نے اس کی نسبت، جیسا کہ پرانی باتوں کی نسبت دستور ہے، قصہ آمیز
روایتیں بنالی ہیں۔ قرآن مجید میں اس پتھر کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ اگر درحقیقت
جیسا کہ روایتوں کے بنانے والوں نے بیان کیا ہے تو ممکن نہ تھا کہ باوجودیکہ قر
کعبہ بننے کا ذکر ہے اور پتھر کا ذکر نہ کیا جاتا ...... روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ:

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۳۲۲ [2] تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۸۱

ریل بہشت سے لائے تھے اور وہ اول اول دودھ کی مانند سفید تھا لیکن انسان کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔ ایک روایت کا یہ مضمون ہے کہ وہ بہشت میں کے جواہرات میں کا ایک ل بے بہا ہے، خدا نے اس کی چمک دمک لے لی ہے۔ اگر نہ لیتا تو تمام دنیا ایک سرے سے سرے سرے تک منور ہو جاتی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ قیامت کے دن اس پتھر کے دو نکھیں اور ایک زبان ہو گی جن کے ذریعہ سے وہ ان کو پہچان لے گا اور ان کے نام بتا دے گا ہوں نے اس دنیا میں اس کو بوسہ دیا ہے۔[1]

جو حدیثیں نسبت حجر اسود کے وارد ہیں کہ وہ بہشت کا پتھر ہے اور چنیں و چناں، وہ ضعیف ، سند کامل نہیں رکھتیں۔[2]

صحیح بات صرف اس قدر ہے کہ یہ پتھر جبل ابو قیس میں کا، جو مکہ کے پاس ہے، ایک پتھر ہے۔[3]

جو بات کہ محقق ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بنا ہونے سے پہلے یہ حجر اسود ایک میدان میں یلا پڑا ہوا تھا۔[4]

جب کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی ہاجرہ کو مع ضرت اسمٰعیلؑ اپنے بیٹے کے، جو ہاجرہ بیوی کے پیٹ میں سے تھے، نکال دیا اور وہ اس کوہستان ہ میں آ کر ٹھہرے تو حضرت ابراہیمؑ نے ان کی عبادت کے لئے اسی طرح جیسا کہ وہ کیا رتے تھے، ایک پتھر کھڑا کر کے مذبح بنایا ہو گا جو اب ہم مسلمانوں میں حجر اسود اور یمین الرحمٰن ے نام سے مشہور ہے۔ اس حجر اسود کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے کیونکہ وہ ایک جزو کعبہ کا ہو گیا مگر وہ ایک ایسی شے ہے جو اب تک موجود ہے...... بعد اس مذبح بنانے کے حضرت ابراہیمؑ نے وہاں کعبہ بنایا، جو اب بیت اللہ کہلاتا ہے، اور اسی کے کونے میں وہ پتھر لگا دیا۔[5]

ذبیح اللہ کا تعین

عموماً لوگوں میں مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کر

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۳۱۱ [2] خطوط سرسید، ص ۸۲ [3] خطبات احمدیہ، ص ۳۱۴ [4] ایضاً، ص ۱۲۸
[5] تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۷۷-۱۷۸

ڈالنے حکم دیا تھا۔ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے قرآن مجید میں اس امر کی
نہیں ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم تھا یا حضرت اسمٰعیل کی نسبت، اور نہ کس
اور مستند حدیث سے اس کی تفصیل پائی جاتی ہے۔ بعض مسلمان مورخوں کا قول ہے کہ
اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم تھا اور بعض کا قول ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی نسبت تھا۔[1]

ذی علم مسلمان عالموں کا صاف بیان ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم
نہ کہ حضرت اسمٰعیل کی نسبت۔[2]

چشمۂ زمزم کی اصل

زمزم کی نسبت ایسی ایسی دور از کار روایتیں مشہور ہیں جن میں سے ایک بھی
مذہب اسلام کے بموجب صحیح نہیں ہے۔ جتنا کہ یہ چشمہ پرانا ہے اور اسی قدر تقدس
تعجب خیز مبالغہ سے وہ روایتیں بنائی گئی ہیں۔[3]

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پہلی بی بی سارہ کے کہنے
دوسری بی بی ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو، جو ہوشیار اور بڑے ہو گئے تھے، گھر سے
دیا۔[4]

گھر سے نکالے جانے کے وقت ان کی عمر سولہ برس تھی۔[5]

جو ایک چھاگل پانی حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہوگا
میں متعدد جگہ سے، جہاں کہیں پانی دستیاب ہوا ہوگا، حضرت ہاجرہ نے بھر لیا ہوگا۔ لیکن
بیابانِ فارس میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی کیونکہ اس بیابان
نہایت کمیاب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ اس مقام پر پہنچیں جہاں
معظمہ ہے تو ان کے پاس باقی پانی نہیں رہا تھا، اور حضرت اسمٰعیل تشنگی کے سبب سے
اور قریب المرگ ہو گئے ہوں گے اور حضرت ہاجرہ نہایت تشویش اور اضطراب کی حالت
ادھر ادھر پانی تلاش کرنے کو دوڑتی پھرتی ہوں گی۔ یہ بیان ایسا صاف ہے جس میں
خلاف قیاس یا خلاف فطرت انسانی نہیں ہے۔ خانہ بدوش عرب پانی کے چشمہ کو، جو ا

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۸۹ [2] ایضاً، ص ۹۰ [3] ایضاً، ۳۳۵ [4] ایضاً، ص ۲۷ [5] ایضاً، ص

[ن]ہیں ملتا تھا' جھانکڑ وغیرہ ڈال کر مٹی سے چھپا دیتے تھے تاکہ ان کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ ملے۔ اور یہ رسم پانی کے کمیاب ہونے سے ان میں جاری تھی اور اب تک جاری ہے۔ یہ بات [نہ]ایت قرین قیاس ہے کہ اسی طرح عربوں نے اس چشمہ کو جو اس مقام پر تھا جہاں اب چاہ [ز]مزم واقع ہے' چھپا دیا ہوگا...... ان تمام حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ہاجرہ [م]ضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا۔[1]

عربی روایتوں میں اس واقعہ کو اس طرح پر تعبیر کیا ہے کہ ایک فرشتہ نے اس مقام پر اپنے [پ]ر زد یا پاؤں سے ایک گڑھا کر دیا جس سے پانی نکل آیا۔ یہ بیان اسی قسم کا ہے جیسا کہ مذہبی [ر]وایتوں کو ایک عظمت دینے کے لئے ہوتا ہے' مگر جو اصلی واقعہ ہے وہ اس سے صاف پایا جاتا ہے۔[2]

[ق]وم عاد کی جسمانی ہیئت

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ قوم عاد کے ہر شخص کا قد بارہ ارش لمبا تھا یعنی اس زمانہ کے [جو] لوگ ہیں اگر اپنے دونوں ہاتھوں کو سیدھا پھیلائیں تو ان کی لمبائی سے بارہ گنا زیادہ لمبا قد [قو]م عاد کا تھا۔ بعض کتابوں میں ان کے قد کے لمبان کا اس سے بھی زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور یہ [بھ]ی لکھا ہے کہ ان کی قوت کا یہ حال تھا کہ چلنے میں ان کے پاؤں زانو تک زمین میں دھنس [جا]تے تھے۔[3]

ان کے قد معمولی قد آور آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ تفسیروں میں جو یہ بات لکھی ہے کہ [چ]ھوٹے سے چھوٹا آدمی ان میں ساٹھ ذراع کا لمبا تھا اور اوسط آدمی سو ذراع کا لمبا تھا اور لمبے [ل]مبے سے لمبا چار سو ذراع کا' محض غلط ہے۔ نہ قرآن مجید سے یہ بات ثابت ہے' نہ اور کسی سند سے۔[4]

[با]غِ ارم اور عنبریں محل کی تعمیر

انہوں (قوم عاد) نے جو اس ریگستان میں کوئی محل بنایا تھا اس کی نسبت بھی بہت زیادہ [م]بالغہ کیا گیا ہے اور عاد ثانی کی اولاد کے قصہ کو اس قوم کے ساتھ جو عاد اولیٰ کی قوم ہے' خلط ملط

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۸۶ [2] ایضاً [3] ایضاً، ص ۳۵ [4] تفسیر القرآن (۴)، ص ۱۸۴

کر کے اس خیالی باغ کو جس کا نام ایشیائی مورخوں نے ''ارم'' قرار دیا ہے' اسی قوم کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس محل اور باغ کی زمین میں لعل اور یاقوت بچھے ہوئے تھے اور اس کی دیواریں سونے چاندی کی تھیں اور درخت زمرد اور یاقوت اور نیلم اور ہر قسم کے بیش بہا جواہروں سے بنائے گئے تھے اور زعفران بجائے گھاس اور عنبر بجائے مٹی کے تھا۔[1]

بعض عالموں نے غلطی پر غلطی یہ کی ہے کہ ''ارم'' کو باغ تصور کیا ہے اور لکھا ہے کہ عدن کے پاس شداد نے بنایا تھا مگر یہ محض ناواقفیت سے لکھا ہے۔ شداد کے باپ کا نام بھی عاد ہے گو وہ اس زمانہ میں نہ تھا اور نہ اس نے کوئی ایسا باغ' جیسا کہ مفسر بیان کرتے ہیں' بنایا تھا۔[2]

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان کے زمانہ خلافت میں ایک شخص اپنا اونٹ ڈھونڈتا ہوا وہاں چلا گیا اور بے شمار جواہرات وہاں سے رول کر اپنی جھولی میں بھر لایا' اور جب معاویہ ابن ابی سفیان نے اس جگہ دوبارہ جانے کا اور اس جگہ کے تلاش کرنے کا حکم دیا تو بہت سی تلاش کرنے کے بعد بھی وہ جگہ پھر نہ ملی۔ خلیفہ نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ کر لیا ہے۔ بعض کتابوں میں حضرت علی مرتضیٰؓ کی نسبت اور بعض معتبر اشخاص کی نسبت ایک جھوٹا اتہام کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ بات کہی کہ خدا تعالیٰ نے اس باغ اور محل کو' جو قوم عاد نے تعمیر کیا تھا' دنیا سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے اور قیامت کے دن وہ بھی من جملہ اور آسمانی بہشتوں کے ایک بہشت ہوگی...... اس قوم نے کوئی عمارت قابل شہرت نہیں بنائی تھی۔ ان کی عمارتیں مثل اور معمولی عمارتوں کے بڑی اور چھوٹی ہر ایک قسم کی تھیں۔[3]

سات ہزار برس کی عمر کا شخص

زمانہ جاہلیت کے عربوں نے بھی قوم عاد کا ایک قصہ گھڑ لیا ہے جس میں بیان کیا ہے کہ قحط کے دنوں میں قوم عاد نے تین شخص مکہ میں اس غرض سے بھیجے تھے کہ خدائے تعالیٰ سے مینہ برسنے کی دعا مانگیں۔ ان تینوں میں سے ایک کا نام لقمان تھا۔ وہ تو مسلمان تھا اور باقی دو کافر تھے۔ لقمان کی عمر سات گدھوں کی عمروں کے مجموعہ کے برابر عمر تھی اور اسی سبب سے لقمان بڑی

---

[1] خطبات احمدیہ' ص ۳۵ [2] تفسیر القرآن (۳) ص ۱۸۳ [3] خطبات احمدیہ' ص ۳۵

ونے میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ گدھ کی عمر ہزار برس کی ہوتی
اور اس لئے لقمان کی عمر اس وقت سات ہزار برس کی تھی۔ اسی قسم کے اور بہت سے لغو اور
ہودہ قصے عاد کی قوم کی نسبت جاہلوں نے بنا لئے ہیں۔[1]

رت یوسفؑ کی قمیض کے اوصاف

...... غم سے اور زیادہ رونے سے انسان کی آنکھوں میں، اس کی بینائی میں ضعف آ جاتا
اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں جو سفیدی ہے اس کی رنگت اصلی سفید رنگ میں اور پر رونق
رہتیں بلکہ بے رونق اور اصلی رنگ سے زیادہ سفید ہو جاتی ہیں اور تراوٹ کی بجائے خشکی آ
ہے، یہاں تک کہ آنسو نکلنے بھی موقوف ہو جاتے ہیں اور آنکھیں ڈگر ڈگر کرنے لگتی ہیں،
یہی حال حضرت یعقوب کی آنکھوں کا ہو گیا تھا...... لیکن یہ حالت دفعتہً بدل جاتی ہے
کہ وہ غم دور ہو جائے۔ دل میں طاقت اور دماغ میں قوت آ جاتی ہے، خون کی گردش تیز ہو
ہے اور ان سب باتوں سے آنکھوں پر رونق ہو جاتی ہے، ضعف بصر جاتا رہتا ہے اور اصلی
رت پھر آ جاتی ہے...... یہ سب امور طبعی ہیں جو انسان پر ایسی حالت میں گزرتے ہیں۔
وئی ضرورت نہیں کہ ہم ان طبعی واقعات کو بے ہودہ اور بے سروپا روایتوں کی بنا پر دور از کار
بنائیں اور جھوٹے قصوں کو قرآن مجید کی تفسیر میں داخل کر کے کلام الٰہی کے ساتھ بے ادبی
یں۔[2]

مفسرین کے دل میں یہ کہانی بسی ہوئی تھی کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا ہے تو
ت جبریل نے بہشت سے ایک قمیض لا کر حضرت ابراہیمؑ کو پہنا دیا تھا جس کے سبب وہ
میں نہیں جلے۔ وہ قمیض حضرت اسحٰقؑ اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کے پاس آیا۔
ت یعقوبؑ نے اس کو بطور تعویذ کے چاندی میں منڈھ کر حضرت یوسفؑ کے گلے میں لٹکا
ا۔ جب ان کو اندھے کنوئیں میں ڈالا ہے تو وہ تعویذ ان کے گلے میں رہ گیا تھا۔ وہی قمیض
ں نے بھیجا تھا۔ جب وہ نکلا تو ہوا لگ کر تمام دنیا میں بہشت کے قمیض کی خوش بو پھیل گئی۔
ں نے تو نہ جانا کہ کاہے کی بو ہے مگر حضرت یعقوبؑ نے بو کو پہچان لیا اور جان گئے کہ

---

[1] ابات احمدیہ، ص ۳۷ [2] تفسیر القرآن (۵)، ص ۱۱۴

بہشت کی یا یوسف کی قمیض ہے ..... افسوس ہے کہ ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے۔ جو اپنا کر
انہوں نے بھیجا تھا' بلاشبہ وہ ایک شاہانہ کرتا ہوگا اور صرف بطور نشانی کے بھیجا تھا' کوئی اور
بات اس کرتے میں نہ تھی بجز اس کے کہ اس سے حضرت یعقوبؑ کو پورا یقین اور ان کے
تسلی ہو جائے کہ یوسف زندہ ہے اور ایسے عالی درجہ پر خدا نے اس کو پہنچا دیا ہے۔[1]

فرعون کا خوف اور لڑکوں کا قتل

بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کا قتل کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کو کسی کرشمہ کی بنا پر قرار
جائے' اگرچہ مفسرین نے اس کی بنا بھی ایک کرشمہ پر قائم کی ہے یعنی بعضوں نے تو یہ کہا ہے
کاہنوں نے فرعون سے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کو برباد
دے گا، پس اس تاریخ میں جو کاہنوں نے مقرر کی تھی' جس قدر لڑکے پیدا ہوئے ان کو فر
نے مروا ڈالا ..... بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقد
سے ایک آگ آئی اور اس آگ نے مصر کو گھیر لیا اور تمام قبطیوں کو جلا دیا اور صرف بنی اسرا
بچ رہے۔ لوگوں نے اس کی تعبیر دی کہ اس شہر سے جہاں سے بنی اسرائیل آئے ہیں ایک شخ
آئے گا' اس کے ہاتھ سے مصر کی سلطنت برباد ہوگی۔ اس پر فرعون نے بنی اسرائیل کے مرد
کے قتل کرنے کا حکم دیا ..... قرآن سے جو بات پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ
اسرائیل کی کثرت سے فرعون اور اس کے سرداروں کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ فساد کر کے
کی سلطنت کو برباد کر دیں گے' اور اس کے انسداد کے لئے یہ تدبیر کی تھی کہ جو لڑکے پیدا ہو
تھے ان کو قتل کروا ڈالتا تھا تا کہ مرد' جن سے لڑنے کا اور فساد ہونے کا اندیشہ تھا' زیادہ نہ ہو
پائیں۔[2]

گوسالہ سامری کا بولنا

ہمارے عجائب پرست مفسروں نے اس پر لغو و بے ہودہ قصوں پر قصے باندھ د
ہیں ..... یہ قرار دیا کہ اس بچھڑے میں اس طرح کی آواز تھی جس طرح کہ سچ مچ کے اور

---

[1] تفسیر القرآن (۵)، ص ۱۱۹
[2] ایضاً (۳)، ص ۲۲۹

پیدا کئے ہوئے بچھڑے میں آواز ہوتی ہے...... ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر
ت نہیں کرتا کہ اس بچھڑے میں سچ مچ کے اور خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کی مانند آواز
بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اس میں سے
ز بھی نکلتی تھی۔ ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اڑتے ہیں'
ہیں' حرکت کرتے ہیں' بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا
ہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔[1]

بات صرف اس قدر ہے کہ مصر میں رہنے سے بنی اسرائیل کے دل میں بت پرستی کا
ں جما ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے لئے کوئی دیوتا بنایا جائے۔ حضرت موسیٰؑ سے بھی
ں نے چاہا تھا کہ ان کے لئے ایک دیوتا بنا دیں۔ انہوں نے ان کو دھمکایا۔ جب وہ پہاڑ پر
ے گئے تو حضرت ہارونؑ کا اتنا خوف ان کو نہ تھا۔ ان کے منع کرنے سے انہوں نے نہ مانا۔ مصر
ا ایک دیوتا' جس کا نام ''نیوس'' تھا اور اس کی صورت بچھڑے جیسی تھی' اسی صورت کا انہوں
بچھڑا بنایا اور بنانے والے نے اس میں ایسی ترکیب رکھی کہ اس ترکیب سے بچھڑے میں
ز نکلتی تھی اور لوگوں کو دھوکہ وفریب دینے کے لئے حضرت موسیٰؑ کے پاؤں تلے کی مٹی' حقیقتاً
رف دھوکہ دینے کو اس مٹی کو حضرت موسیٰؑ کے پاؤں تلے کی مٹی بیان کر کے' بچھڑے میں
ا دی...... ہمارے مفسرین کی جیسی عادت ہے کہ تفسیروں میں رطب ویابس صحیح وغلط روایتیں
یتے ہیں' اسی طرح سامری کی نسبت بھی روایتیں بھر دی ہیں۔[2]

ن وسلویٰ کی نعمت

''من'' ایک چیز ہے جو بطور ترنجبین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے اور
لویٰ'' بٹیر کی قسم کا جانور ہے جو اس جنگل میں جہاں بنی اسرائیل گئے تھے' بکثرت پایا جاتا
ر وہاں وہی ان کی غذا تھی۔ پس اسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ باقی عجائبات ''من'' کے
ریت میں بیان ہوئے ہیں' اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت
انکار کرنا' ان کا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے گو مفسرین نے اور انبیا کے قصے لکھنے والوں
یہودیوں کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا ہے۔[3]

یر القرآن (۳)، ص ۲۴۸-۲۴۹ ۲۔ ایضاً، ص ۲۵۰-۲۵۱ ۳۔ ایضاً (۱)، ص ۱۰۹

نزول مائدہ

ہمارے مفسروں نے ...... نزول مائدہ کی نسبت بہت سے بے سروپا قصے وکہانیا
ہیں جن میں ایک بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کے لفظوں سے ان قص
تائید ہوتی ہے اور نہ ان کی نسبت کوئی اشارہ پایا جاتا ہے ...... کافی دلیل اس بات پر یقین
کی ہے کہ نزول مائدہ ہرگز وقوع میں نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا
اسرائیل میں یہودیت شدت سے پھیلی ہوئی تھی۔ یہودیوں کی عادت تھی کہ انبیا سے ای
خواہشیں کیا کرتے تھے ...... اسی طرح حواریوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ سے کہا ...... مائ
ان کی مراد پکا پکایا کھانے سے نہ تھی بلکہ کھانے کی چیزوں کے موجود ہونے سے تھی۔[1]

خضر کی حقیقت

خضر کیا درحقیقت کوئی شخص تھے یا صرف فرضی نام ہے؟ ......[2]

...... اس کی نسبت علمائے متقدمین نے بہت اختلاف کیا ہے۔ اکثر تو کہتے ہیں کہ
پیغمبر تھے جو اب تک جیتے ہیں اور جیتے رہیں گے اور قیامت کے بوریے سمیٹیں گے مگر لو
دکھائی نہیں دیتے۔ کبھی کسی بھولے بسرے کو راہ بتا دیتے ہیں اور کبھی کسی کو علم لدنی سکھا
ہیں۔[3]

خضر کا سمندر کے بیچ میں ایک سبز وصلیہ بچھائے بیٹھا ہونا' جو بخاری کی حدیث م
قابل تسلیم نہیں ہے اور نہ یہ بات تسلیم ہو سکتی ہے کہ جس سوکھی گھاس پر وہ بیٹھتے تھے وہ
جاتی تھی۔ ان ہی قصوں کی مناسبت سے اس شخص کا نام خضر رکھ دیا ہے۔ اصل یہ ہے ک
زمانہ کے مقدس لوگوں میں ایک عام رواج تھا کہ لوگوں کو نصیحت کرنے اور ان کے دل م
کا ڈر بٹھانے اور اس کی قدرت کی شان جتانے کے لئے اس قسم کے قصے بنا لیتے ت
بزرگوں کے واقعی اور سچے حالات میں ایسی باتیں ملا دیتے تھے جن سے خدا کی قدرت
ظاہر ہوتی تھی اور وہ لوگوں کے دلوں پر زیادہ موثر ہوتے تھے ...... اسی طرح یہودیوں

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۳۹-۲۵۰ [2] ایضاً (۸)، ص ۱۶۱ [3] ایضاً (۷)، ص ۶۴

عالموں اور واعظوں نے حضرت موسیٰ کے شہر سے نکلنے اور مدین تک پہنچنے کے سفر میں جو واقعات پیش آئے اس میں بھی اعجوبہ باتیں ملا دیں اور اس سفر میں ایک فرضی شخص خضر کا ملنا شامل کیا جس کو ایک نہایت ہی بزرگ شخص اور مقدس' خدا رسیدہ' صاحب کشف و کرامات قرار دیا۔ وہ قصہ یہودیوں میں مشہور تھا۔ اسی قصہ کو' بطور قصہ ہائے یہود' صحابہ و تابعین نے بیان کیا ہوگا اور اخیر راویوں نے اس خیال سے کہ ان لوگوں نے آں حضرت صلعم سے سنا ہوگا' ان قصوں کو حدیثوں میں شامل کر دیا اور مفسروں نے اپنی تفسیروں میں داخل کیا۔ مگر قرآن مجید میں جہاں تک اس قصہ کا بیان ہے وہ سیدھا اور صاف ہے اور ان باتوں میں سے' جو ان روایتوں اور تفسیروں میں بیان ہوئی ہیں' ایک حرف بھی قرآن میں شامل نہیں ہے۔ آج تک علما یہ بھی نہیں بتا سکے کہ خضر کون تھے اور کس کے بیٹے تھے؟...... ایسی حالت میں' اور خصوصاً جب کہ بعضوں نے ان کو فرشتہ قرار دیا ہو جو آدمی کی صورت بن جاتے تھے' کیونکر ایک واقعی شخص' اور نہ صرف شخص بلکہ نبی و رسول' قرار دیا جا سکتا ہے اور کچھ شبہ نہیں رہتا کہ یہ پرانے قصوں میں کا ایک فرضی نام ہے اور اس کو حضرت موسیٰ کے اصلی واقعات کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔[1]

ہاروت و ماروت کی شخصیت

ہاروت اور ماروت دونوں تاریخی شخص ہیں یعنی ان کا وجود تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں شخص شام کے رہنے والے تھے...... تمام قصے جو مفسرین نے ان کی نسبت اپنی تفسیروں میں بھر لئے ہیں' ان کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ جتنی روایتیں ان کی نسبت مذکور ہیں وہ سب مصنوعی اور جھوٹی ہیں...... یہ دونوں فرشتے نہیں' بلکہ آدمی تھے۔[2]

......اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک نہایت صالح تھے اور ان کی نیکی یا اعمال کے سبب اس زمانہ کے لوگ بطور مدح ان کو فرشتہ کہتے تھے...... یہ سمجھنا کہ درحقیقت وہ فرشتے تھے اور درحقیقت کوئی چیز خدا نے ان پر نازل کی تھی' صریح غلطی ہے۔[3]

---

[1] تفسیر القرآن (۷)، ص ۷۲-۷۳ [2] ایضاً (۱)، ص ۱۵۸-۱۵۹ [3] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۶۷

اصحابِ کہف کی محیر العقول تفصیلات

اصحاب کہف تاریخی شخص ہیں، فرضی قرار دیئے ہوئے نہیں ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو سیدھے سادے واقعی حالات ان پر گزرے تھے ان میں بہت لغو اور بے ہودہ اور خلاف قیاس باتیں اور عجائبات شامل کر لئے گئے ہیں۔ اور یہ ایک معمولی بات ہے کہ نیک اور بزرگ لوگوں پر جو ظلم اور سختی ظالموں کے ہاتھ سے گزر جاتی ہے، بعد کو ان کی نسبت بہت سی زائد اور عجیب باتیں بڑھا دی جاتی ہیں، اسی طرح اصحاب کہف پر جو حالات اور واقعات گزرے ان کو بطور تعجب انگیز کہانی کے بنالیا ہے اور بے سرو پا اور محض بے ہودہ روایتیں مشہور ہوگئی ہیں۔[1]

قرآن مجید میں جس قدر اس قصہ کا بیان آیا ہے وہ بالکل سیدھا اور صاف ہے بلکہ خدا نے اس قصہ کو اسی مقصد سے بیان کیا ہے کہ جو غلط باتیں اور عجائبات اس قصہ کے ساتھ مشہور تھے ان کی غلطی ظاہر ہو یا ان کی تکذیب کی جائے اور بتا دیا جائے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مفسرین نے، جن کے کان ان ہی پرانی افواہی روایتوں سے بھرے ہوئے تھے اور عیسائی بھی اور ان کے سوا عرب اور ایشیا کے لوگ بھی اس قصہ کو عجائبات یا کرامت اور معجزات کے طور پر بیان کرتے تھے، قرآن مجید کی آیتوں کی بھی وہی تفسیر کی جس سے خدا خود انکار کرتا تھا۔[2]

یہ قصہ کچھ بہت پرانا قصہ نہیں، آنحضرت صلعم کے زمانہ سے تھوڑے زمانہ پہلے کا ہے۔[3] اصحاب کہف عیسائی اور حضرت عیسیٰ کی امت میں تھے۔ تمام کتابوں اور مختلف روایتوں سے یہی امر ثابت ہوتا ہے۔ اور خود ان کا واقعہ کہ ایک ظالم اور بت پرست بادشاہ کے خوف سے، جو عیسائیوں کو قتل کرتا تھا، جان اور ایمان بچا کر بھاگے تھے ان کے عیسائی ہونے کا کافی ثبوت ہے۔[4]

اس ظالم بادشاہ نے ان لوگوں کو، جو تعداد میں اس وقت چھ تھے، بلایا اور مذہب عیسوی چھوڑنے اور بت پرستی کرنے کو کہا مگر ان سب نے انکار کیا۔ اس پر بادشاہ نے اُن کو مہلت دی اور اس مہلت میں وہ شہر سے بھاگے اور ایک چرواہا مع کتے کے ان کے ساتھ ہولیا اور وہ سب

---

[1] ترقیم، ص ۱۲   [2] ایضاً، ص ۲۱   [3] ایضاً، ص ۲۷   [4] ایضاً، ص ۱۰

پہاڑ کی کھوہ میں، جو شہر افسوس سے کچھ فاصلہ پر تھی، جا کر چھپ رہے۔[۱]

اکثر مورخین اور اہل تفاسیر نے لکھا ہے کہ وہ لوگ پہاڑ کی کھوہ میں جا کر سو رہے اور زمانہ تین سو یا تین سو نو برس، سونے کے بعد جب اٹھے تو انہوں نے ایک شخص کو کھانا خریدنے کو میں بھیجا...... جو محض غلط ہے اور صرف بنایا ہوا قصہ ہے۔ ان پر پہاڑ کی کھوہ میں سوتے نے کے خیال سے یہ قصہ گھڑ لیا گیا ہے مگر اصلیت اس کی، جیسے کہ محققانہ نظر سے پائی جاتی صرف اس قدر ہے کہ وہ لوگ رات کے وقت شہر سے بھاگے تھے...... صبح ہوتے وقت وہ پہاڑ کی کھوہ پر پہنچے...... وہ کھوہ میں گئے۔ رات کے جاگے رستہ چلے تھکے ہوئے تھے۔ کھوہ جہاں بالکل اندھیرا تھا، سو رہے۔ کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ دو تین پہر سونے کے بعد وہ اٹھے آپس میں پوچھنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوئے۔ کسی نے کہا دن بھر، کسی نے کہا کچھ کم، کیونکہ کھوہ اندھیرے میں وہ دن کا اندازہ ٹھیک ٹھیک نہیں کر سکتے تھے۔ جب وہ اٹھے تو انہوں نے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو کھانا لانے کو بھیجا۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ دو تین روز تک...... اسی طرح خرید کر لاتا رہا۔ جب وہ بادشاہ، جو اُن کو ت دے کر شہر سے باہر چلا گیا تھا، پھر شہر میں آیا...... تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ شہر سے گئے ہیں۔ اس نے ان کی تلاش شروع کی اور پہاڑ کی کھوہ میں ان کا پتہ لگا، اور اس نے کی کھوہ کا منہ بند کروا دیا تاکہ وہ اسی میں بھوکے پیاسے مر رہیں...... اس میں کچھ شک نہیں کہ پہاڑ کی کھوہ کا منہ بند ہونے کے بعد وہ وہیں بند ہو گئے اور وہیں مر کر رہ گئے، اگرچہ بعض خوں اور مفسروں نے لکھا ہے کہ کھوہ میں پڑے سوتے ہیں یعنی مرے نہیں ہیں۔[۳]

ایک زمانہ دراز کے بعد، خواہ وہ زمانہ دو سو برس کا ہو یا ڈھائی سو برس کا یا تین سو برس کا یا سونو برس کا، کسی شخص نے اس کھوہ کے منہ کو کھولا۔ جیسا کہ اکثر روایتوں میں بیان ہوا ہے میں بھی شک نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے پاس، جو کھوہ میں گئے تھے، اس زمانہ کے سکہ کے پے موجود تھے اور جس شخص نے اس کا منہ کھولا تھا اس نے وہ روپے پائے ہوں گے اور جب ر میں لے گیا لوگوں نے چرچا کیا ہوگا کہ اس نے خزانہ پایا ہے۔ حاکم تک اس کو پکڑ کر لے

---

[۱] قیم، ص ۱۳ [۲] ایضاً، ص ۱۴-۱۵ [۳] ایضاً، ص ۱۵

گئے ہوں گے اور اس نے تمام قصہ پہاڑ کی کھوہ میں لاشوں کے ہونے کا اور وہاں سے
ملنے کا بیان کیا ہوگا۔ اس پر وہاں کے حاکم اور شہر کے لوگ ان کے دیکھنے کو آئے اور جانا
ان لوگوں کی لاشیں ہیں جو دقیوس قیصر کے ظلم سے بھاگے تھے۔ راویوں اور لوگوں نے اس
واقعہ کو اس طرح سے بیان لیا کہ اصحاب کہف کئی سو برس بعد سونے کے اٹھے یا مردہ سے
ہو گئے اور ان ہی میں کا ایک شخص روپیہ لے کر بازار میں آیا اور چرچا ہوا اور سب لوگ پہ
کھوہ پر گئے۔ پھر کسی نے کہا "وہ زندہ تھے، ایک آدھ بات کہہ کر مر گئے" کسی نے کہا کہ مسلم
کسی نقصان کے لاشیں تھیں مگر ان میں ارواح نہ تھی۔ ایسے واقعات میں اس قسم کی افواہیں
کرتی ہیں اور رفتہ رفتہ روایتیں بن جاتی ہیں اور کتابوں میں لکھی جاتی ہیں، اور مذہبی لگاؤ
لوگ اس کو مقدس سمجھتے ہیں اور معجزہ اور کرامات قرار دیتے ہیں۔[1]

اصل یہ ہے کہ جب لاشیں ایسے مقام پر ہوتی ہیں جہاں ہوا کا صدمہ نہیں پہنچتا اور لا
اسی طرح رکھے رکھے راکھ ہو جاتی ہیں تو وہ سوراخ میں سے ایسے ہی معلوم ہوتی ہیں کہ
پورے مجسم اجسام بلا کسی نقص کے رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح لوگوں نے ان کو دیکھا او
کہ پوری مجسم بلا کسی نقصان کے لاشیں رکھی ہیں یا وہ لوگ سو رہے ہیں۔[2]

حاصل یہ ہے کہ اصحاب کہف میں کوئی بات تعجب کرنے کے لائق نہیں ہے۔ ان پر
واقعہ خلاف عادت، جس سے تعجب ہو جیسا کہ لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے، نہیں گزرا۔ وہ مثل
انسانوں کے انسان تھے اور جیسے واقعات انسانوں پر گزرتے ہیں ویسے ہی ان پر بھی گزر
تھے۔ کوئی امر خلاف عادت، جو تعجب انگیز ہو، نہیں ہوا۔[3]

واقعہ اصحاب الفیل کی توضیح

یہ واقعہ بھی ایک بہت بڑے واقعات میں گنا جاتا ہے۔ اس کا واقعہ عظیم متصور ہونا
وجہ سے ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور نہ اس وجہ سے
درحقیقت ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ مثل اس کے کبھی نہ ہوا ہو بلکہ اس کی عظمت صرف اہل
مفسروں اور جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کی بدولت ہے جنہوں نے سیدھے سیدھے

---

[1] ترقیم، ص ۲۰ — [2] ایضاً، ص ۱۸ — [3] ایضاً، ص ۳۱

کو ایک عجیب گھڑت اور الف لیلہ کے قصوں سے عجیب تر قصہ کر کے بیان کیا ہے۔[1]

مفسرین کی عادت ہے کہ اصل بات کو بڑھا کر کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس اصلی واقعہ کو بھی کہانی کی صورت پر بنالیا ہے اور اپنی تفسیروں میں اس طرح لکھا ہے کہ جب ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں سمیت کعبہ کے پاس آیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک قسم کے پرند جانوروں کو حکم دیا کہ مسور یا چنے کے دانہ کے برابر ایک کنکری چونچ میں اور ایک ایک دونوں پنجوں میں لے کر جاؤ اور ابرہہ کے لشکر پر چھوڑ دو۔ ان پرندوں نے ایسا ہی کیا اور کنکری جس کے سر پر پڑی پار نکل گئی، سارا لشکر برباد ہو گیا۔ اور اس قصہ کے لئے کچھ بے اصل روایتیں بھی گھڑلی ہیں اور لفظی مناسبت سے تمام اس کے لوازمات از خود خیال کر لئے ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح پر یہ قصہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید سے صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر پر ایک آفت پڑی اور وہ برباد ہو گیا۔ اس آفت کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے مگر قرآن مجید کی سیاق عبارت سے اور تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آفت وبائی چیچک کی بیماری تھی جو ابرہہ کے لشکر میں دفعتہً زمانہ محاصرہ مکہ میں پھیلی اور بہت سے آدمی اور جانور چیچک سے مر گئے اور سارا لشکر تباہ ہو گیا۔[2]

قرآن مجید میں جس آفت کا ابرہہ پر نازل ہونا مذکور ہوا ہے اگرچہ اس کا نام نہیں لیا گیا مگر اس کے الفاظ اور اس کی تشبیہیں مرض چیچک سے ایسی مناسب ہیں کہ اس سے صاف مرض چیچک کی وبا کا ابرہہ کے لشکر میں واقع ہونا پایا جاتا ہے۔[3]

چاہِ زمزم کی کھدائی

جس طرح کہ عرب کے چشمے چند مدت تک جاری رہتے تھے اور پھر خشک ہو جاتے تھے اسی طرح یہ چشمہ بھی کسی مدت کے بعد خشک ہو گیا اور کسی کو اس طرف خیال بھی نہیں رہا اور سینکڑوں برس اس پر گزر گئے۔ مگر عام الفیل کے بعد عبدالمطلب جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ جہاں وہ چشمہ تھا وہاں کنواں کھود کر پانی نکالا جائے، چنانچہ انہوں نے کھودنا شروع کیا۔ اس پر بعض لوگ مانع ہوئے اور فساد پر آمادہ ہوئے۔ مگر کسی نہ کسی طرح وہ فساد رفع ہوا اور

[1] خطباتِ احمدیہ، ص ۳۳۹ [2] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۷۷ [3] مقالاتِ سرسید (۲)، ص ۱۴۵

عبدالمطلب اپنے مقصد پر کامیاب ہوئے۔ جو قصے کتابوں میں اس کنوئیں کی نسبت اور
عبدالمطلب کو اس خاص مقام دریافت ہونے کی نسبت لکھے ہیں ان میں سے کسی کی کچھ صحت
نہیں ہے۔ کچھ عجیب نہیں ہے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہو کہ کنواں کھودتا ہوں اور اس
سبب سے کنواں کھودنے کا خیال پیدا ہوا ہو...... تمام عجائب اور غرائب روایتیں جو اس پانی کے
قبل قیامت نہ سوکھنے کی ہیں، وہ سب موضوع ہیں جن کی کچھ بھی اصلیت اسلام میں نہیں ہے۔[1]

ولادت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب روایتیں

آں حضرت کی ولادت کی نسبت بہت سی عجیب روایتیں مشہور ہیں کہ ولادت کی رات کو
کسریٰ کے محل میں زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگورے گر پڑے۔ فارس کا مقدس آتش کدہ
جس میں سال ہا سال سے برابر آگ جلتی چلی آتی تھی، دفعۃً بجھ گیا۔ وہاں کے موبدوں نے
عجیب عجیب خوابیں دیکھیں اور چشمہ ساوہ دفعۃً خشک ہو گیا۔ مگر ان روایتوں کی معتبری کی قابل
اعتماد سندیں نہیں ہیں اور نہ مذہبی روایتیں سمجھی جا سکتی ہیں...... ان واقعات کو جو بعد کو وقوع میں
آئے، شاعروں نے اپنے شاعرانہ خیالات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے
منسوب کیا کہ گویا ان کا پیدا ہونا ہی فارس کے آتش کدوں کا بجھنا اور کسریٰ کے محل میں زلزلہ
پڑنا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شاعرانہ خیال بطور روایت کے مروج ہونے لگے اور عین روز ولادت ہی
سے منسوب کر دئے گئے۔ پس ان روایتوں کو مذہبی روایتیں تصور کرنا ان لوگوں کی غلط فہمی ہے
جو مسلمانوں کی مذہبی روایتوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔[2]

حضرت آمنہ کا ایک خوف ناک اور نامعلوم آواز کو سن کر ڈر جانا یا ایک سفید مرغ کا دفعۃً
نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کے
اضطراب کو تسکین کا ہونا یا حضرت آمنہ کے لئے ایک خوش گوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم
ہاتھ سے ظاہر ہونا یا ملائکہ کی آوازیں آنی یا بغیر اس کے کہ کوئی شخص دکھائی دیتا ہو پاؤں سے
پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے
لئے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا، بہشت کے پرندوں کا چہچہانا، بہشت کی خوشبوؤں کا

[1] خطبات احمدیہ، ص ۴۳۵
[2] ایضاً، ص ۴۳۰

مہلناً یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں ہر مسلمان، جس کو ذرا سا بھی علم ہوگا، سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے گرم جوش شاعرانہ خیالات ہیں جو انہوں نے اپنے مضامین کی تزئین اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق کے لئے بیان کی ہیں۔[۱]

شہابِ ثاقب اور شیاطین

...... کہتے ہیں کہ آں حضرت صلعم کے مبعوث ہونے سے پہلے جن اور شیطان آسمان دنیا تک جاتے تھے اور چپکے سے کان لگا کر ملاء اعلیٰ میں جو باتیں فرشتے کرتے تھے، چوری سے سن لیتے تھے اور اس چوری سے وہ جان جاتے تھے کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور کاہنوں اور جادوگروں اور نجومیوں وغیرہ کو، جو اُن کی پوجا کرتے تھے، غیب کی خبر دیتے تھے۔ جب آں حضرت صلعم مبعوث ہوئے تو شیطانوں اور جنّوں کا اوپر جانا اور چوری سے ملاء اعلیٰ کی باتیں سننا بند ہو گیا اور آسمان میں بہ نسبت سابق کے چوکی پہرہ زیادہ بڑھ گیا۔ جگہ جگہ چوکیدار بیٹھ گئے اور آگ کے شعلے بھی بڑھا دئے، یہاں تک کہ کوئی جگہ خالی نہیں رہی۔ اب جو شیطان یا جن آسمان پر باتیں سننے جانا چاہتا ہے اس پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے اور رات کو ہم جو ستارے ٹوٹتے دیکھتے ہیں یہ وہی شعلہ ہائے آتشیں ہیں جو شیطانوں اور جنّوں کو مارے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں غلط اور لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں، مذہب اسلام اور خدائے پاک کا کلام ان دور از کار قصوں سے پاک ہے۔[۲]

نزولِ وحی کے وقت اضطرار کی کیفیت

نزول وحی کے وقت اضطرار اور غشی کی روایتیں...... نامعتبر اور بے سند ہیں۔ ان روایتوں میں خود راویوں کے خیالات اور توہمات ہیں۔[۳]

بدر کی لڑائی میں فرشتوں کی آمد

بدر کی لڑائی میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔[۴]

---

۱ خطبات احمدیہ، ص ۴۳۵ ۲ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۷۳ ۳ خطبات احمدیہ، ص ۴۳۵
۴ تفسیر القرآن (۴)، ص ۹

یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے کے سبب سے ہوئی تھی اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کے لئے اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہیے' اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی' روایتوں کو فرشتوں کے آنے پر سند لانا کافی نہیں ہے۔ اول تو وہ روایتیں ہی معتبر و قابل استناد نہیں ہیں' دوسرے خود ان کے مضمون ایسے بے سر و پا و خیالی ہیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ہو سکتا' خصوصاً اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے۔[1]

اگر ہم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ہی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ہیں تو بھی قرآن مجید سے ان کا فی الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔[2]

قرآن مجید کا سیاق کلام ہی یہ ہے کہ اس میں ایسے مواقع ہیں جو خوف و خطر کے ہوتے ہیں' انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و تسکین پیدا کرنا ہوتا ہے...... پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ جنگ جو مجسم و متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا' نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے بلکہ صرف مسلمانوں کے دلوں کو ان کے قوی جنگ کو صبر و خوشخبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا نے پورا کیا اور قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر فتح دی۔[3]

مجھے یقین ہے کہ کوئی فرشتہ لڑنے کو سپاہی بن کر یا گھوڑے پر چڑھ کر نہیں آیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ قرآن مجید سے بھی ان جنگ جو فرشتوں کا اترنا ثابت نہیں ہے مگر تمام مسلمانوں کا اعتقاد اس کے برخلاف ہے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ درحقیقت فرشتوں کا رسالہ لڑنے کو اترا تھا۔ وہ نادانی سے کہتے ہیں کہ فرشتوں کا لڑائی کے لئے اترنا منصوص ہے اور اس سے انکار قرآن کا انکار کرنا ہے' مگر ان کا یہ خیال محض غلط ہے۔[4]

فرشتوں سے ان کی مدد کرنے سے ان کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا' شجاعت' جرات

---

[1] تفسیر القرآن (۴)، ص ۱۲ [2] ایضاً ص ۱۱ [3] ایضاً ص ۱۴-۱۵ [4] ایضاً (۲) ص

...لال کو قائم رکھنا مراد تھا' نہ خیالی فرشتوں کو سپاہی بنا کر اور ڈھال' تلوار' تیر کمان دے کر اور سفید گھوڑوں پر سوار کر کے بھیجنا۔[۱]

...صدر کا وقوعہ

قرآن مجید کی رو سے ہم کو شرح صدر پر' جس کو آخر کار لوگ شق صدر کہنے لگے' اور نفس ...اج کی صحت و صداقت پر بغیر کسی شبہ کے ایمان لانا چاہیے۔ بس جو امر کہ بحث طلب ہے ...س پر ایک مدت تک علمائے اسلام کی توجہ مبذول رہی ہے اس بات سے علاقہ رکھتا ہے کہ ...ح صدر یا شق صدر کی اصل حقیقت اور معراج کی ماہیت کیا تھی۔[۲]

روایتیں جو ہشامی اور واقدی میں بیان ہوئی ہیں یا وہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی ...مذکور ہیں' صحت سے بہت دور ہیں۔ محققین علمائے اسلام ان کو محض نا قابل اعتبار سمجھتے ہیں ...بے ہودہ افسانے' جو محض جہلا کے خوش کرنے کے قابل ہیں' خیال کرتے ہیں۔[۳]

شق صدر کے متعلق روایتیں ایسی مختلف ہیں کہ ان کی باہم تطبیق نہیں ہو سکتی اور اس لئے ...ب کی سب نامعتبر ہیں۔ مصنف مواہب لدنیہ نے سب سے زیادہ نادانی کی ہے کہ ان ...ب روایتوں کو دیکھ کر' بعوض اس کے کہ ان کو نامعتبر ٹھہراتا' یہ تسلیم کیا ہے کہ واقعہ شق صدر پانچ ...ہ واقع ہوا تھا...... یہ تمام روایتیں ایسی ہیں جن پر تمام ذی علم اور تعلیم یافتہ مسلمان ذرا بھی ...نہیں کرتے اور یہ روایتیں محققین علمائے اسلام کے نزدیک طفلانہ افسانوں سے زیادہ کچھ ...ہیں رکھتیں۔[۴]

شق صدر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شب معراج کے خواب کا ایک جزو تھا' نہ یہ کہ ...یقت وہ جسمانی طور پر واقع ہوا تھا۔[۵]

ہماری تحقیق میں واقعہ معراج کا' ایک خواب تھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا ...اسی خواب میں یہ بھی دیکھنا کہ جبریل نے آپ کا سینہ چیرا اور اس کو آب زمزم سے دھویا' ...ا انکار نہیں ہے۔[۶]

---

۱ ...سیر القرآن (۴)، ص ۱۴ ۲ خطبات احمدیہ، ص ۳۹۸ ۳ ایضاً، ص ۴۰۰
۴ ...یضاً، ص ۴۰۲ ۵ ایضاً، ص ۴۴۱ ۶ تفسیر القرآن (۶)، ص ۱۳۹

حضورؐ کے انتقال سے منسوب روایات

وفات کے واقعہ میں جو عجیب روایتیں ہیں اور جن میں حضرت خضر کا تشریف لانا بیان ہوا وہ سب بے سند و غیر ثابت ہیں۔اتنی بات سچ ہے' جیسا کہ ایسے مواقع میں ہوا کرتا ہے سب لوگ خلافت کی فکر میں پڑ گئے مگر جن کو خاص ذاتی تعلق آں حضرتؐ سے تھا انہوں نے آپ کی تجہیز و تکفین کی۔[1]

عذابِ الٰہی

عذابِ الٰہی کی ماہیت

واقعات ارضی و سماوی'..... جن کو قرآن مجید میں کسی قوم کی معصیت کے سبب سے اس واقعہ کا بطور عذاب کے اس قوم پر نازل ہونا بیان ہوا ہے' غور طلب ہے۔آندھی اور طوفان پہاڑوں کی آتش فشانی' ان سے ملکوں کا اور قوموں کا برباد ہونا' زمین کا دھنس جانا' قحط کا پڑنا کسی قسم کے حشرات کا زمین میں' پانی میں' ہوا میں پیدا ہو جانا' کسی قسم کی وباؤں کا آنا اور قوموں کا ہلاک ہونا سب امور طبعی ہیں جو اُن کے اسباب جمع ہو جانے پر موافق قانون قدرت کے واقع ہوتے رہتے ہیں۔انسانوں کے گنہ گار ہونے یا نہ ہونے سے فی الواقع اس کو کچھ تعلق نہیں ہے۔اگرچہ توریت میں اور دیگر صحف انبیا میں اس قسم کے ارضی و سماوی واقعات کا سبب انسانوں کے گناہ قرار دئے ہیں جو مثل ایک پوشیدہ بھید کے سمجھ سے خارج ہے..... مگر قرآن مجید میں بھی ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بلاشبہ تعجب سے خالی نہیں۔[2]

خدا تعالٰی ان دنیاوی آفات اور واقعات کو جو قانون قدرت یعنی لا آف نیچر (Law of Nature) کے مطابق واقع ہوتے ہیں' لوگوں کے گناہوں اور ان کے اعمال کی طرف منسوب کیا کرتا ہے' گو کہ ان کے گناہ اور اعمال بد اُن آفات کے آنے کا اصلی سبب نہ ہوں مگر اس سے بطور تنبیہ کے گناہوں کا بد سمجھنا ان کے ذہن میں منقش ہو جاتا ہے۔اسی طرح گناہوں

---

[1] تصانیف احمدیہ حصہ (۱)' جلد (۱)' ص ۳۲

[2] تفسیر القرآن (۳)' ص ۱۹۰

ِ اعمال بد کی کثرت سے دنیاوی آفات کے آنے کی توقع کی جاتی ہے۔[1]

پس قرآن مجید کے اس قسم کے بیانات کو جن میں حوادث ارضی و سماوی کو انسان کے
ناہوں سے منسوب کیا ہے، یہ سمجھنا کہ وہ ایک حقیقت اشیاء علیٰ ماہی علیہ کا بیان ہے، ان سمجھنے
لوں کی غلطی ہے، نہ قرآن مجید کی۔[2]

وفانِ نوحؑ کی اہمیت و وسعت

حضرت نوحؑ لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے اور خدائے واحد کی پرستش کرنے کی ہدایت
رتے تھے اور لوگ نہیں مانتے تھے۔ حضرت نوحؑ ان پر خدا کا عذاب نازل ہونے کی پیش
وئی کرتے تھے۔ تمام قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے ہیں وہ عذاب ان ہی اسباب سے
اقع ہوئے ہیں جن کا واقع ہونا امور طبعی سے متعلق ہے۔ پس ملکی حالات کے خیال سے ضرور
ضرت نوحؑ کے دل میں خدا نے ڈالا ہوگا کہ ان لوگوں کی نافرمانی، بدکاری و گنہ گاری سے ایک
ن خدا ان کو ڈبو دے گا...... حضرت نوحؑ نے ان لوگوں کی امداد سے جو اُن کو مانتے تھے اور ان
ایمان لائے تھے، وہ کشتی تیار کر لی۔ طوفان کا آنا، بذریعہ ان اسباب کے جو طوفان آنے سے
علق ہیں، خدا نے مقدر کیا تھا چنانچہ بے انتہا مینہ کے برسنے اور زمین سے پانی کے چشمے کھل
نے اور دریاؤں و ندیوں کے ابل پڑنے سے اس ملک میں طوفان آیا۔ حضرت نوحؑ اور ان
ے ساتھی کشتی پر بیٹھ کر بچ گئے اور تمام ملک کے لوگ، جس میں طوفان آیا تھا، ڈوب کر مر گئے۔
س قسم کے طبعی واقعوں کو خدا تعالیٰ ہمیشہ بندوں کے گناہوں اور ان کی نافرمانی سے منسوب کرتا
ہے۔[3]

کوئی شخص جو نیچرل سائنس سے واقف ہے، ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ طوفان ساری دنیا
ں آیا تھا اور اونچے اونچے پہاڑ، جو دنیا میں ہیں، ان سے بھی پانی اونچا ہو گیا تھا۔ اور ہمارے
زدیک قرآن مجید سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہے کہ تمام دنیا میں طوفان آیا تھا۔ پس طوفان
یک محدود قطعہ زمین میں تھا جو فرات اور دجلہ کے درمیان اور اس کے گرد و نواح کی نشیبی زمین
ں سمندروں کے کنارے تک واقع ہے، جہاں حضرت نوحؑ رہتے تھے۔[4]

---

[1] تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۲۸ [2] ایضاً (۳)، ص ۱۹۲ [3] ایضاً (۵)، ص ۱۳-۱۴ [4] مقالات سرسید (۴)، ص ۱۴۵

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے علما نے صرف یہودیوں کی پیروی کر کے طوفان کا عام ہونا قرآن مجید سے نکالنا چاہا تھا ورنہ ہمارے قرآن مجید سے عام ہونا طوفان کا نہیں پایا جاتا۔[1]

قومِ ثمود پر آفت

حضرت صالحؑ کے مخالفوں کے مارے جانے کی نسبت ایک بے ہودہ روایت آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت صالحؑ کے مخالفوں نے جب ان کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ ان پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گئے جہاں سے حضرت صالحؑ آیا جایا کرتے تھے' اس غرض سے کہ کوئی عمدہ کمین گاہ تلاش کر کے اختیار کریں۔ خدا تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو زمین پر سے بہت اونچا اٹھا لیا' اور جہاں سے وہ پہاڑ اٹھا تھا وہاں ایک غار ہو گیا۔ حضرت صالحؑ کے مخالفوں نے اس غار کو اپنی کمین گاہ کے لئے پسند کیا اور جب کہ وہ اس غار کے اندر جا کر چھپے تو خدائے تعالیٰ نے اوپر سے ان کے سروں پر اس پہاڑ کو چھوڑ دیا اور سب کے سب ایک لمحہ میں کچل کر مر گئے۔[2]

جو آفت کہ قوم ثمود پر آئی وہ شدید بھونچال تھا...... یہ واقعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کو معجزہ یا خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت تصور کیا جائے۔[3]

قومِ لوط کا اندھاپن

جس طرح خدا تعالیٰ ان تمام واقعات کو جو قانون قدرت کے مطابق ہوتے ہیں انسانوں کے گناہوں کی طرف نسبت کیا کرتا ہے...... اسی طرح اس قدرتی واقعہ کو بھی سدوم کے لوگوں کے گناہوں سے منسوب کیا ہے۔ مفسرین نے جو لغو و بے ہودہ باتیں اپنی تفسیروں میں لکھی ہیں کہ حضرت جبریل اس قطعہ زمین کو اپنے پروں پر اُٹھا کر آسمان تک لے گئے اور پہلے آسمان کے اس قدر قریب پہنچے کہ آسمان کے فرشتوں نے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کے اذان دینے کی آواز سنی' یہ سب محض غلط اور موضوع کہانیاں ہیں جن کی مذہب اسلام میں کچھ بھی اصلیت نہیں ہے...... اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں سدوم و عموراہ وغیرہ شہر آباد تھے وہاں آتشیں پہاڑ تھے اور نفطہ یا گندھک کی کانیں کثرت سے تھیں...... قرآن مجید سے اس

---

1. تبیین الکلام (۲)، ص ۳۱۲   2. خطبات احمدیہ، ص ۳۹   3. تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۰۱

دثہ کا واقعہ ہونا اس طرح پر معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس شام کو جب کہ قوم لوطؑ نے جا کر حضرت
طؑ کا گھر گھیرا، وہ آتش خیز پہاڑ یا نفطہ یا گندھک کی کانیں جلنی شروع ہوئیں اور کچھ شبہ نہیں
سکتا کہ ان کا دھواں تمام شہر میں گھٹ گیا ہوگا اور قوم لوطؑ، جو حضرت لوطؑ کا گھر گھیرے ہوئے
ی، شہر میں دھواں گھٹ جانے کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔ اندھیرے کے سبب ان کو کچھ نہ
ھلائی دیتا ہوگا اور دھوئیں کے سبب ان کی آنکھیں بے کار ہو گئی ہوں گی...... مفسرین نے......
مرقرار دیا ہے کہ ان فرشتوں نے جو حضرت لوطؑ کے ہاں آئے ہوئے تھے، بطور اعجاز کے ان
واندھا کر دیا اور ان کو حضرت لوطؑ کے مکان کا دروازہ، جس کو وہ توڑ کر اندر جانا چاہتے تھے،
یں ملا۔ لیکن جو روایت کہ انہوں نے بیان کی ہے اس کی کوئی معتبر سند نہیں ہے۔[1]

نی اسرائیل پر عذاب کی مختلف کیفیتیں

قحط...... طوفان و جراد و قمل و ضفادع و دم، یہ تمام امور ایسے ہیں جو ہمیشہ دنیا میں موافق
نونِ قدرت واقع ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی واقع ہوئے تھے۔
ے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بھی قانون فطرت کے تابع ہے جس پر
یا علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں...... ان واقعات ارضی وسماوی کو بھی خدا تعالیٰ نے فرعون اور
ا کی قوم کے گناہوں سے منسوب کیا ہے۔[2]

قحط کوئی نئی بات نہیں تھی۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں بھی سخت قحط پڑا تھا، حضرت موسیٰؑ
ے زمانہ میں بھی قحط ہوا جو حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں مذکور ہے۔[3]

موسیٰؑ کے عہد میں طوفان کا واقعہ ایک معمولی واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ جو بزرگی اس
ا کی تھی وہ صرف یہی تھی کہ اس زمانہ میں واقع ہوا جب کہ حضرت موسیٰؑ وہاں تشریف لے گئے
ے۔[4]

جراد و قمل و ضفادع یعنی ٹڈیوں، پسوؤں یا اسی قسم کے کسی جانوروں اور مینڈکوں کا کثرت
ے پیدا ہو جانا، خصوصاً طوفان اور دریائے نیل کے چڑھاؤ کے اترنے کے بعد، ایک ایسی بات
ہے جو قدرتی طور پر واقع ہوتی ہے۔ حشرات الارض دفعتہً اس کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں

[1] فسیر القرآن (۵)، ص ۵۵-۵۷ [2] ایضاً (۳)، ص ۲۳۱ [3] ایضاً [4] ایضاً

جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ پس حضرت موسیٰؑ کے عہد میں ان حشرات الارض کا پیدا ہو جانا جس قدر کثرت سے وہ پیدا ہو گئے ہوں اور کیسی ہی سخت مصیبت ان کے سبب سے مصریوں پر پڑی ہو' کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں ہے جس کو ایک لحہ کے لئے بھی واقعہ مافوق الفطرت تصور کیا جائے۔[1]

دم کا لفظ البتہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس بات کو کہ تمام دریا اور حوض اور تمام پانی جو برتنوں میں تھا خون ہو گیا' غیر قابل یقین خیال کر کے یہ لکھا کہ فرعون اور اس کی تمام قوم کو نکسیر بہنے یعنی ناک سے خون جاری ہونے کی بیماری ہو گئی تھی۔ گو کہ کسی وبا کا پھیل جانا' خصوصاً قحط وطوفان کے بعد' کوئی امر بعید از عقل نہیں ہے لیکن اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریائے نیل کا پانی اگرچہ عموماً نیلے رنگ کا رہتا ہے مگر کبھی طغیانی کے زمانہ میں اس کا رنگ سرخ لال اینٹ کے گہرے رنگ کی مانند ہو جاتا ہے...... اور جب کبھی نباتی مادہ کثرت سے آ جاتا ہے تو سبز ہو جاتا ہے...... پس اسی قسم کے واقعات کے سبب سے اس کا پانی سرخ ہو گیا ہوگا جس کو دم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض اوقات پانی میں نہایت باریک کیڑے سرخ رنگ کے اس قدر کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ تمام پانی کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے...... یہی حالت دریائے نیل کی بھی ہو گئی ہوگی۔ اور جب کہ ثابت ہوا ہے کہ اس کا پانی بھی کبھی سرخ ہو جاتا ہے تو اس کی ایسی حالت ہو جانے پر زیادہ یقین ہو جاتا ہے۔ ان کیڑوں کا بہت کثرت سے پانی میں جمع ہو جانا بلاشبہ لوگوں کو اس کے استعمال سے باز رکھتا ہوگا اور وہ پانی ناقابل استعمال ہو جاتا ہوگا۔ فرعون کے زمانہ میں بھی دریائے نیل سے گھروں میں اور کنوؤں اور حوضوں میں نلوں کے ذریعے پانی لے گئے تھے۔ پس جہاں جہاں اس کا پانی جاتا ہوگا سب جگہ یہی حال ہو گیا ہوگا۔ اس پانی کو لوگوں نے بلا خیال برتنوں میں بھر لیا ہوگا اور تھوڑی دیر بعد دیکھا ہوگا کہ وہ سرخ مثل خون کے ہے۔ اونچے مقاموں میں' جہاں دریائے نیل کا پانی نہ جاتا ہوگا' وہاں یہ کیفیت نہ ہوئی ہوگی' اور ممکن ہے کہ بنی اسرائیل اونچی زمین پر رہتے ہوں جہاں نیل کا پانی نہ جاتا ہو یا ان کے گھروں میں پانی جانے کے نل نہ ہوں اور ان کے گھروں میں یہ کیفیت نہ ہوئی ہو۔[2]

---

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۳۱

[2] ایضاً، ص ۲۳۱-۲۳۳

پہاڑ کا سروں پر اُٹھنا

بنی اسرائیل، جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے، طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے سایہ کے تلے تھے اور طور بسبب آتش نشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا...... مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب وغریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر (خدا ان پر رحمت کرے) عجائب دور از کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اس کی عمدگی سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے تفسیروں میں لغو و بے ہودہ عجائبات بھر دی ہیں۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا ان کے سر پر اٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو، نہیں تو اسی پہاڑ کے نیچے کچل دیتا ہوں اور بعضوں نے کہا کہ نہیں، بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اکھاڑ کر ہوا میں اڑا لایا تھا اور پانچ میل کا چوڑا اور پانچ میل کا لمبا تھا۔ اتنی بڑائی اس کی اس لئے تھی کہ کل لشکر بنی اسرائیل کا اس کے تلے ایک ہی دفعہ میں کچل جائے۔ یہ تمام خرافاتیں لغو بے ہودہ ہیں اور خدائے پاک کا کلام پاک ایسی بے ہودہ باتوں سے پاک ہے۔[1]

گروہ یہودیوں کا بندر ہو جانا

اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علماء مفسرین نے عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں اور لکھا کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل و خاصیت میں بھی بندر ہو گئے تھے۔ بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ بندر جو اَب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اچھلتے پھرتے ہیں، ان ہی بندروں کی نسل میں سے ہیں مگر یہ تمام باتیں لغو و خرافات ہیں۔ خدائے پاک کے کلام کا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا اور اس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا مگر ایک گروہ یہودیوں کا، جو دریا کے کنارہ پر رہتا تھا، فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا۔ ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا۔ جب نہ مانا تو ان کو قوم سے منقطع، برادری سے خارج، کھانے پینے سے الگ، میل جول

---

[1] تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۱۶-۱۱۷

سے علیحدہ کر دیا۔ اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے اور اسی لئے ان کی حالت بندروں کی سی ہوگئی تھی جس کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ ''کونو قردۃ خاسئین'' یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل وخوار و رسوا رہو جس کے سبب اس زمانے کے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ آنے والے ان کی ذلت و رسوائی کا حال سن کر عبرت پکڑیں۔ یہ کہنا کہ وہ لوگ سچ مچ کے بندر ہو گئے تھے۔ بجز ''اہل الجنۃ'' کے اور کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا، اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی ان کے سچ مچ کے بندر ہو جانے سے انکار کیا ہے۔[1]

آثارِ قیامت اور اس کا قیام

حضرت عیسیٰؑ، امام مہدی اور دجال کی آمد

ہزاروں لوگ اب بھی بعض بزرگوں کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ سینکڑوں برس سے پوشیدہ زندہ ہیں اور وقت مقرر پر تشریف لائیں گے۔ یہودی چند بزرگوں کو زندہ جانتے ہیں۔ مسلمان وعیسائی حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کے اور پھر دنیا میں آنے کا یقین کرتے ہیں۔[2]

مسلمان یقین کرتے ہیں کہ قیامت کے قریب، حضرت عیسیٰؑ کے دوسری مرتبہ دنیا میں آنے سے پہلے، ایک امام زمین پر سچے مسلمانوں کو کافروں پر فتحیاب کرنے کے واسطے پیدا ہوں گے۔[3]

شیعوں نے اس سے بڑھ کر کام کیا۔ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ مہدی پیدا ہوئے۔ جب کہ دو ڈھائی برس کے ہوئے تو فرشتے ان کو اٹھا لے گئے اور ایک غار میں چھپا رکھا ہے۔ اب سینکڑوں برس گزر گئے مگر وہ اس غار میں زندہ موجود ہیں اور چھپے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جب دنیا اخیر ہونے کو ہوگی تو وہ نکلیں گے اور دنیا کو عدل اور انصاف سے بھر دیں گے اور اخیر زمانہ کے

---

[1] تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۱۷ [2] ترقیم، ص ۵۰ [3] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۹

امام اور مہدی ہوں گے۔[۱]

ان غلط قصوں میں سے جو مسلمانوں کے ہاں مشہور ہیں' ایک قصہ امام مہدی آخرالزماں کے پیدا ہونے کا ہے۔ اس قصہ کی بہت سی حدیثیں کتب احادیث میں بھی مذکور ہیں مگر کچھ شبہ نہیں کہ سب جھوٹی اور مصنوعی ہیں۔ جب کہ ایک محقق' کیا باعتبار واقعات تاریخی کے اور کیا باعتبار ان کے راویوں کے' ان پر غور کرتا ہے تو ان کا غلط اور نامعتبر اور وضعی ہونا آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ ان حدیثوں کے بنانے کی کیا ضرورت پڑی تھی...... مہدی آخرالزماں کی بشارت کوئی اصلی بشارت نہ تھی بلکہ اس زمانے کے لوگوں کی صرف ایک حکمت عملی اور خلافت ہاتھ آ جانے کی تدبیروں میں سے ایک تدبیر تھی اور ان سے کسی ایسے مہدی کی جو مسلمانوں نے تصور کر رکھا ہے اور جس کا قیامت کے قریب ہونا خیال کیا جاتا ہے' بشارت مقصود نہیں تھی۔[۲]

ہمارے نزدیک تو نہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر سے اترنے والے ہیں' نہ مہدی موعود پیدا یا ظاہر ہونے والے ہیں۔[۳]

مہدی کے آنے کی کوئی پیش گوئی مذہب اسلام میں ہے ہی نہیں' بلکہ وہ سب ایسی ہی جھوٹی روایتیں ہیں جیسے کہ دجال اور مسیحؑ کے آنے کی۔[۴]

یاجوج ماجوج کی ماہیت

علمائے اسلام نے یاجوج و ماجوج کے نکلنے کو' جو اُن کے نزدیک سد سکندری کے پیچھے ہیں اور روز دیوار کو چاٹ چاٹ کر اس میں چھید کرنا چاہتے ہیں اور قیامت کے قریب اس میں چھید کر لیں گے اور نکل پڑیں گے' آثار قیامت میں داخل کیا ہے۔[۵]

بعض مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ یاجوج و ماجوج نہایت قلیل الجثہ اور صغیر القامۃ ہیں یعنی صرف بالشت بھر کا ان کا قد ہے یعنی بالشتیے ہیں' اور بعضوں نے کہا کہ نہایت قوی الجثہ اور طویل القامت ہیں۔ ان کے ناخن اور دانت ڈاڑھ درندہ جانوروں کے مانند ہیں۔ وہ آدمیوں

---

[۱] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۳۲ [۲] ایضاً، ص ۴۰۷-۴۰۸ [۳] آخری مضامین، ص ۱۰۴

[۴] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۳۲ [۵] تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۵۱

کو مار کر ان کا کچا گوشت کھا جاتے تھے اور کھیتی پکنے کے موسم میں نکل کر تمام کھیتوں کو چٹ کر جاتے تھے۔ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان کے کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک کو بچھا کر اور ایک کو اوڑھ کر سو رہتے ہیں۔ مگر یہ سب کہانیاں جھوٹ اور محض بے اصل ہیں۔ وہ لوگ تاتاری ترک ہیں۔[1]

مفسرین نے محض بے سند اور افواہی کہانی آمیز روایتوں سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج اس دیوار کے توڑنے کے درپے ہیں۔ آں حضرت صلعم کے زمانہ میں روپیہ برابر سوراخ کر چکے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ آسمان پر سے اتریں گے اس وقت وہ اس کو توڑ کر نکلیں گے...... اور جب وہ نکلیں گے تو تمام دنیا کو لڑائی سے عاجز کر دیں گے' آسمان پر تیر چلائیں گے' وہ لہو بھرے آئیں گے۔ آخر کو حضرت عیسیٰؑ کی بددعا سے سب مر جائیں گے۔ یہ محض بے اصل کہانیاں ہیں۔[2]

ہمارے نزدیک...... یاجوج و ماجوج تاتاری ترکوں کی ایک قوم تھی' اور اب بھی ہے' جو چین کے کنارہ پر آباد تھی جن کے فساد اور لوٹ مار روکنے کو چین کے ایک بادشاہ نے ایک دیوار بنائی تھی جو اب بھی ٹوٹی پھوٹی موجود اور عجائبات دنیا میں شمار ہوتی ہے۔ اور قوم یاجوج ماجوج نہ کہیں قید ہے اور نہ کہیں بند ہے۔[3]

اب اس زمانہ میں تمام تاتار پر' جو یاجوج و ماجوج کی قوم ہے' چینیوں کی عمل داری ہے' جو چینی ترکستان کے نام سے موسوم ہے۔ یاجوج و ماجوج یعنی تاتاری تمام دنیا میں پڑے پھرتے ہیں' نہ کسی کے کان بڑے ہیں اور نہ کسی کا گوشت کھاتے ہیں' خاصے بھلے چنگے آدمی ہیں۔[4]

قرب قیامت کے یاجوج و ماجوج کا نکلنا عیسائیوں اور یہودیوں کا اعتقاد ہے' قرآن مجید سے اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔[5]

واقعہ قیامت

واقعہ قیامت ایک ایسا واقعہ ہے جو امور طبعی کے مطابق اس دنیا پر واقع ہوگا اور ضرور واقع

۱۔ ازالۃ الغین، ص ۱۲ ۲۔ ایضاً، ص ۲۵ ۳۔ تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۵۱
۴۔ ازالۃ الغین، ص ۲۵ ۵۔ تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۵۳

ہوگا مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب واقع ہوگا۔[1]

جو واقعات کائنات پر ایک دن گزرنے والے ہیں..... وہ اپنے وقت پر ہوں گے اور جو کچھ ان میں ہونا ہے وہ ہوگا اور اس زمانہ کے انسان اور وحوش وطیور پر جو کچھ گزرنا ہے گزرے گا اور اس وقت جو حال روحوں کا اور ملائکہ کا ہونا ہے وہ ہوگا مگر جو لوگ اس سے پہلے مرچکے ہیں ان کے لئے قیامت اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ مرے۔[2]

نفخ صور کا استعارہ

تمام علمائے اسلام صور کو ایک شے موجود فی الخارج اور اس کے لئے پھونکنے والے فرشتے یقین کرتے ہیں اور عموماً مسلمانوں کا اعتقاد یہی ہے۔[3]

یہودیوں نے اپنے خیال میں خدا تعالیٰ کے پاس بھی فرشتوں کی فوج کا ہونا اور اس میں درجہ بدرجہ سرداروں کا ہونا تسلیم کا تھا اور اسی خیال سے فوج میں کام لینے کو فرشتوں کے پاس بھی صور یا قرنا کا ہونا خیال کیا اور صور پھونکنے والے فرشتے قرار دیے جن میں سب کا سردار اسرافیل فرشتہ ہے..... ہمارے ہاں کے علما نے حسب عادت اپنے اس امر میں یہودیوں کی پیروی کی ہے اور نفخ صور کے لغوی معنی لئے ہیں اور جب انہوں نے لغوی معنی لئے تو ضرور ہوا کہ صور کو بشکل معینہ موجود اور اس کے بجانے کے لئے فرشتے قرار دیں۔ بعض بزرگوں نے یہاں تک یہودیوں کی پیروی ہے کہ جس طرح توریت میں لکھا ہے کہ خدا نے موسیٰؑ کو چاندی کی دو صوریں بنانے کا حکم دیا تھا، انہوں نے بھی صور کا جوڑا قرار دیا ہے کہ ایک کے بجانے سے ایک طرح کی اور دونوں کو ساتھ بجانے سے دوسری طرح کی آواز نکلے گی' اور اس پر حاشیہ یہ چڑھایا کہ صور میں بقدر تعداد ارواحوں کے چھید ہیں' جیسے بانسلی میں ہوتے ہیں، اور جب مردوں کو زندہ کرنے کے لئے صور پھونکی جائے گی تو ارواحیں صور کے چھیدوں میں سے نکل پڑیں گی۔[4]

قرآن مجید میں جس طرح تنزہ ذات باری کا اور اس کے کاموں کا بیان ہے وہ اس قسم کے خیالات کا کلیتہً مانع ہے۔ نفخ صور صرف استعارہ ہے بعث وحشر کا اور تبدل حالت کا۔ جس

---

[1] تفسیر القرآن (۳) ص ۱۳۹ [2] ایضاً ص ۱۴۲ [3] ایضاً ص ۵۵ [4] ایضاً ص ۵۴-۵۵

طرح لشکر میں صور بجنے سے سب مجتمع ہو جاتے ہیں اور لڑنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں اور گروہ
گروہ آموجود ہوتے ہیں اسی طرح بعث وحشر میں ارادۃ اللہ سے، جس طرح کہ اس نے قانون
قدرت میں مقرر کیا ہوگا، وقت موعود پر سب لوگ اٹھیں گے اور جمع ہو جائیں گے اس حالت
صور سے استعارہ کیا گیا ہے۔ پس...... یہ بات کہ فی الواقع کوئی صور بمعنی متعارف موجود
موجود ہوگی اور فی الواقع وہ مثل صور متعارفہ کے پھونکنے کے پھونکی جائے گی اور فی الواقع اس
فرشتے لئے ہوں گے اور وہ اس کو پھونکیں گے، ثابت نہیں۔[1]

عالم آخرت اور سزا و جزا

واقعات مابعد الموت

حالات معاد یا واقعات مابعد الموت اس قسم کے ہیں جن سے انسان بالکل ناواقف ہے
اور ان کی حقیقت واقعی کا عموماً انسان کو سمجھانا نہایت دشوار ہے بلکہ قریب ناممکن کے ہے اور اس
لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایسی تمثیلوں سے ان کو بیان کیا جائے کہ انسان کے دل
پر اس کا کچھ خیال ہو۔[2]

مرنے کے بعد جی اٹھنا اور قیامت کا ہونا اور حساب کا لیا جانا اور دوزخ اور بہشت کا ہونا
اور جو کچھ کہ اس میں عذاب و تنعم سے مذکور ہوا ہے، سب حق ہے۔ جن الفاظوں سے کہ دوزخ
بہشت کے عذاب اور تنعم کا بیان ہوا ہے وہ صرف بطور مثال کے ہے ورنہ وہاں کے تنعم اور
عذاب سے اور دنیا کے تنعم اور عذاب سے بجز ایک سا نام ہونے کے اور کچھ مناسبت نہیں
ہے۔[3]

عذابِ قبر

اگر عذاب قبر میں گنہ گاروں کی نسبت سانپوں کا چمٹنا اور کاٹنا بیان کیا جائے تو اس کا
مطلب نہیں ہوتا کہ درحقیقت سچ مچ کے یہ سانپ، جن کو ہم دنیا میں دیکھتے ہیں، مردے کو چمٹ

---

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۵۵ [2] ایضاً (۷)، ص ۴۵ [3] تبیین الکلام (۱)، ص ۶

جاتے ہیں بلکہ جو کیفیت کہ گناہوں سے روح کو حاصل ہوتی ہے اس کا حال انسانوں میں اس رنج و تکلیف و مایوسی کی مثال سے پیدا کیا جاتا ہے جو دنیا میں سانپوں کے کاٹنے سے انسان کی ہوتی ہے۔ عام لوگ اور کٹ ملا اس کو واقعی سانپ سمجھتے ہیں۔[1]

پل صراط کا وجود

ایک گروہ علما نے یہ خیال کیا کہ دوزخ کی پشت پر جو پل صراط کھنچا ہوا ہے اس کے اوپر سے سب لوگ گزریں گے۔ جو کافر ہیں وہ دوزخ میں گر پڑیں گے اور جو مسلمان ہیں وہ صحیح و سالم اس سے گزر جائیں گے۔ مگر یہ روایتیں ایسی ہیں جن کا کچھ نشان قرآن کے الفاظ میں نہیں پایا جاتا۔[2]

صراط آخرت حق ہے اور ہر شخص کو اس کا طے کرنا ضروری ہے مگر اس کے اوصاف کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی باڑ سے زیادہ تیز ہے اور دوزخ کے اوپر تنا ہوا ہے، نہ قرآن مجید میں مذکور ہیں اور نہ کسی حدیث قابل الوثوق سے پائے جاتے ہیں...... اس حالت کا جس کو خدا تعالیٰ نے صراط سے تعبیر کیا ہے، ہر شخص کو اس کا طے کرنا یا یوں کہو کہ ہر شخص پر اس حالت کا گزرنا لازمی ہے...... صراط سے کوئی حقیقی اور ظاہری مجسم شے مراد نہیں ہے...... صراط آخرت اس حالت کی تعبیر ہے جو آخرت میں گزرے گی۔ جو لوگ اس دنیا میں صراط مستقیم پر چلنے والے ہیں صراط آخرت کو بھی کالبرق الخاطف طے کر جائیں گے۔ جو اس دنیا میں صراط مستقیم سے ڈگمگا جانے والے ہیں وہ صراط آخرت پر بھی ڈگمگا جائیں گے اور جہنم میں گر پڑیں گے۔[3]

میزان اور اعمال نامے

عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور اس پر بہت سی بے بنیاد حدیثیں بھی بنالی ہیں کہ قیامت کے دن بندوں کے اعمال تولنے کے لئے ایک ترازو ہوگی جس کا ایک پلڑا بہشت پر اور ایک پلڑا دوزخ پر ہوگا اور اتنی بڑی ہوگی کہ تمام آسمان و زمین، اور جو کچھ کہ ان میں ہے، سب ایک دفعہ ایک پلڑے میں سما سکیں گے اور اس کی لسان یعنی ڈنڈی پر کی چوٹی جبریل پکڑے ہوئے

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۶۵ [2] تفسیر القرآن (۷)، ص ۱۴۷ [3] النظر (باب ششم)، ص ۶-۸

ہوں گے۔ اچھے اعمال خوب صورت اور برے اعمال بدصورت بن کر آئیں گے اور تو
جائیں گے یا نامہ اعمال، جن کو نیکی و بدی کے فرشتے لکھتے رہتے ہیں، تولے جائیں گے۔[1]

ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کے اعمال کسی چیز پر لکھے جاتے ہیں اور وہ
قیامت کے دن ترازو میں رکھ کر تولی جائے گی بلکہ ہم اس کو بطور مثال کے سمجھتے ہیں جس
مقصود اس بات کا بتانا ہے کہ جو کچھ انسان نے اپنی زندگی میں اچھا یا برا کیا ہے اس میں سے
بھی کھویا نہیں جاتا بلکہ قیامت کے دن بے کم و کاست سب موجود ہوگا اور اس پر سزا اور جزا
مرتب ہوگی۔[2]

اعمال ناموں کا لکھا جانا اور ان کا تولا جانا اور نیک بندوں کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ
کا دیا جانا اور بدلوگوں کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ کا دیا جانا یا پیٹھ کے پیچھے سے دیا جانا
اعمال ناموں کا کھلنا یا منتشر ہونا، یہ سب تمثیلیں ہیں اور حقیقت صرف اس قدر ہے کہ نور ایمان
قیامت کے دن ایمان والوں کے ساتھ ہوگا اور ان کی پاک روحیں اعلانیہ ان نیک افعال کے
نتیجوں کو ظاہر کریں گی جو کہ انہوں نے دنیا میں کئے تھے اور بدکاروں کی روحیں ان بداعمالیوں
کے نتیجوں کو ظاہر کریں گی جو دنیا میں ان سے ظاہر ہوئی تھیں۔[3]

شفاعت کا تصور

مسلمانوں میں ایک عام خیال ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام قیامت کے دن اپنی امت
کے گنہ گاروں کی شفاعت کر کے ان کو بخشوالیں گے۔ پھر اس خیال کو بہت وسعت ہوگئی ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ پیر اپنے مریدوں کی اور نیک بندے اپنے دوستوں اور معتقدوں کی اور حافظ
اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی شفاعت کر کے ان کو بخشوالیں گے اور ایک ایک کی شفاعت
سے معلوم نہیں کتنے کتنے گنہ گار بخشے جائیں گے۔[4]

آں حضرت صلعم بلاشبہ شفیع امت ہیں کیونکہ آپ نے وہ راہ بتائی ہے جس پر چلنے
سے نجات ہوتی ہے مگر یہ سمجھنا کہ قیامت میں گناہ بخشوالیں گے، یہ تو بالکل عیسائیوں کے
مسئلہ کے مطابق ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ عیسیٰ مسیح " تمام امت کے گناہوں کے بدلے میں

---

[1] تفسیر القرآن (۳)، ص ۱۰۲ [2] ایضاً (۷)، ص ۴۵ [3] ایضاً، ص ۵۵ [4] ایضاً، ص ۱۳۶

ندیہ ہو گئے۔[1]

قیامت میں اللہ آپ انصاف کرے گا۔ پھر جب تک اللہ ہی فضل نہ کرے وہاں نہ پیر کی حمایت چلے گی نہ فقیر کی۔ وہ ایسا برا وقت ہوگا کہ کوئی کسی کی سدھ نہ لے گا' اپنی نفسانفسی میں گرفتار ہوں گے' نہ پیر کو مرید کی خبر رہے گی اور نہ مرید کو پیر کی۔ وہاں یہ نہیں پوچھا جانے کا کہ تو قادریہ خاندان میں مرید ہے یا نقشبندیہ میں' یا چشتیہ خاندان کا مرید ہے یا سہروردیہ کا۔ وہاں صرف یہ بات پوچھی جائے گی کہ کہو کیا لایا' نیکی یا بدی؟ متابعت رسول اللہ کی کی تھی یا نہیں؟ پھر اللہ ہی کے فضل سے پیر کا بھی چھٹکارا ہے اور مرید کا بھی۔[2]

جنت ودوزخ کی حقیقت

انبیا نے ان راحتوں اور لذتوں یا رنج اور تکلیفوں کو جو انسان کے خیال میں ایسی ہیں جو اُن سے زیادہ نہیں ہوسکتیں' بطور جزا و سزا ان افعال کے بیان کیا ہے اور غرض ان سے بعینہٖ وہی اشیا نہیں ہیں۔[3]

تمام انبیا نے دنیا ہی کی محبوب وموذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے...... آں حضرت صلعم نے سزا و جزا کا ان دنیاوی تمثیلوں میں بیان کیا جس پر اس ملک کے لوگ سزا و جزا کے محبوب وموذی ہونے کا قیاس کر سکتے تھے' نہ یہ کہ اس سے وہی حقیقت مراد تھی جو اُن لفظوں کے لغوی معنی تھے۔ اگر آں حضرت صلعم یورپ کے کسی ٹھنڈے ملک میں پیدا ہوتے تو ضرور بجائے ٹھنڈی نہروں کے گرم پانی کی نہریں اور بجائے موتی کے محلوں کے آتش خانہ والے محل بیان فرماتے...... جس قدر علمائے ربانی گزرے ہیں وہ سب اسی بات کے قائل ہیں۔ قل اعوذیئے مُلّا نے بلکہ کٹ مُلّا ہمیشہ ان کے برخلاف رہے ہیں مگر جو حقیقت ہے وہ کسی کے مخالف یا موافق ہونے سے تبدیل نہیں ہوسکتی۔[4]

چونکہ روحانی حالتوں کو یعنی گنہ گاروں کی ارواحوں کی تکلیفوں کا اور نیک آدمیوں کی ارواحوں کی راحت اور خوشی کا بیان کرنا اور تصویر کھینچ دینا بجز اس کے اور کسی طرح ہو نہیں سکتا تھا

---

[1] تصانیف احمدیہ، حصہ (۱)، جلد (۱)، ص ۲۱ [2] کلمۃ الحق مشمولہ تصانیف احمدیہ، ص ۸۷

[3] تفسیر القرآن (۱)، ص ۳۷ [4] خطبات احمدیہ، ص ۱۵۲

کہ اس کو ایسی چیزوں اور حالتوں کے پیرایہ میں تشبیہاً بیان کیا جائے جن کو انسان اپنی اسی زندگی میں اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کا حال بہشت و دوزخ کے ... سے اور خوشی وایذا و تکلیف اٹھانے کے مختلف طریقوں اور سامانوں سے بیان کیا گیا ہے۔[1]

یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے، اس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ... قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی وساقنیں نہایت خوب صورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونا میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونا میں کچھ، ایسا بے ہودہ پن ہے جس ... تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔[2]

ایک کوڑ مغز ملاّ یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پئیں گے، میوے کھائیں گے، دودھ و شہد کی ندیوں میں نہائیں گے اور جو دل چاہے گا وہ مزے اُڑائیں گے، اور اس لغو و بے ہودہ خیال سے ... رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے۔[3]

اگر حقیقت بہشت کی یہی باغ اور نہریں اور موتی کے اور چاندی سونے کی اینٹوں کے مکان اور دودھ و شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوبصورت عورتیں اور لونڈے ہوں تو یہ تو قرآن کی آیت اور خدا کے فرمودہ کے بالکل مخالف ہے۔[4]

پس یہ مسئلہ کہ بہشت اور دوزخ دونوں بالفعل مخلوق وموجود ہیں، قرآن سے ثابت نہیں۔[5]

۱۔ خطبات احمدیہ، ص ۱۹۵ ۲۔ تفسیر القرآن (۱)، ص ۳۸ ۳۔ ایضاً، ص ۴۰ ۴۔ ایضاً، ص ۳۶
۵۔ ایضاً

مسائل توحید و نجات

کلمہ طیبہ پر یقین

جو شخص کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تصدیق کرتا ہے اس کے کسی قول سے انکار شہادت رسول یا انکار قرآن یا تکذیب رسول قرار دینا نہایت جہالت و محض نادانی ہے۔[۱]

جو شخص لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر دل سے یقین رکھتا ہے اس کا کوئی فعل مع یقین مذکور کے اس کو کافر نہیں کر سکتا۔[۲]

سچا مسئلہ اسلام کا صرف یہ ہے "**من قال لا الہ الا اللہ فدخل الجنۃ**"، **محمد رسول اللہ** اس کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ پس اسلام اسی قدر ہے اور اسی کی تعلیم اور اسی پر یقین نجات کے لئے کافی ہے۔[۳]

کسی پیغمبر کی راہ پر چلنا

جو لوگ کہ پیغمبروں کی راہ پر ہیں وہ ضرور نجات پائیں گے خواہ وہ پیغمبر چین کا ہو یا ماچین کا، عرب کا ہو یا فلسطین کا، امریکہ کا ہو یا افریقہ کا، ہندوستان کا ہو یا فارستان کا، مہذب لوگوں کا ہو یا وحشیوں کا۔[۴]

شرک فی النبوۃ

جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کی تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اس میں شرکت نہیں۔ پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اس کی تابع داری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو میں شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔[۵]

۱۔ النظر (باب ہشتم)، ص ۴۵ ۲۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۳۹ ۳۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۴۔ مقالات سرسید (۴)، ص ۲۷۰ ۵۔ سفرنامہ پنجاب، ص ۲۰۲

نبیوں کے منکروں پر محمدی ہونے کا اطلاق

موحدین نجات پاتے ہیں اور مشرکین ہمیشہ دوزخ میں رہتے ہیں اور یہ کہ یہ بہت بڑی بحث ہے کہ موحدین کا اطلاق کن کے اوپر ہوتا ہے جو آخر کو نجات پاتے ہیں۔[۱]

اسلام کے اصلی اصولوں کے موافق' نہ ان اصولوں کے جن کو علما نے قرار دیا ہے' وہ شخص جو نہ کسی نبی کو مانتا ہو' نہ کسی اوتار کو' نہ کسی کتاب الہامی کو اور نہ کسی حکم کو جو مذاہب میں فرض یا واجب سے تعبیر کئے گئے ہیں اور صرف خدائے واحد پر یقین رکھتا ہو' کون ہے؟ ہندو ہے؟ نہیں۔ زرتشی ہے؟ نہیں۔ موسائی ہے؟ نہیں۔ عیسائی ہے؟ نہیں۔ محمدی ہے؟ نہیں۔ پھر کون ہے؟ مسلمان — گوہم نے ایسے شخص کے محمدی ہونے سے انکار کیا مگر اس کا محمدی ہونا ایسا ہی لازم ہے جیسے کہ اس کا مسلمان ہونا کیونکہ ان ہی کی بدولت وہ مسلمان کہلایا ہے۔ پس وہ بھی درحقیقت محمدی ہے' پر ناشکرا محمدی جیسے ہمارے زمانے میں بعض فرقے ہیں جو غالباً توحید ذات باری پر بکمالہ یقین رکھتے ہیں' اگر کہو کہ وہ کافر ہیں تو غلط ہے کیونکہ کافر تو نجات نہیں پانے کا مگر موحد سے تو خدا نے نجات کا وعدہ کیا ہے۔[۲]

لامذہبی اور اسلام میں یکسانیت

اسلام ایک سیدھا سادا بے کھسر وسیع مذہب ہے کہ لامذہبی بھی' جو لوگوں نے اپنے خیال میں سمجھ رکھی ہے' درحقیقت اسلام ہی کا ایک نام ہے۔ عدم محض کا تو وجود نہیں ہے پس لامذہب بھی کوئی مذہب رکھتا ہوگا اور وہی اسلام ہے۔[۳]

منکرین خدا کا اہل جنت ہونا

جن لوگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خدا کے وجود کے بھی قائل نہیں ہیں میں تو ان کو بھی مسلمان جانتا ہوں۔ اول تو یہ کہنا کہ وہ خدا کے وجود کے قائل نہیں ہیں' غلط محض ہے۔ خدا کے وجود پر یقین کرنا انسان کا امر طبعی ہے' کوئی دل اس سے خالی نہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا کے وجود کا انکار ان پر تہمت ہے۔ ان کا قول یہ نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی

۱۔ مقالات سرسید (۱)، ص ۲۱۴ ۲۔ ایضاً (۳)، ص ۱۷ ۳۔ ایضاً

دلیل اس کے ثبوت کی نہیں ہے۔ پس یہ انکار انکار وجود نہیں ہے بلکہ انکار علم دلیل سے ہے' اور بلحاظ امر طبعی ان کا دل وجود باری کا مصدق ہے اور شرک سے بری ہیں۔ پھر اہل جنت ہونے میں کیا باقی رہا؟[1]

باعث نجات ——— صرف توحید

اصل بات یہ ہے کہ توحید ذات باری پر یقین کرنا اسلام ہے اور باعث نجات۔ نہ ہمارا یہ مدعا ہے کہ لوگ انبیا سے انکار کریں' نہ ہمارا یہ منشا ہے کہ لوگ کتب الہامی کو نہ مانیں' نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ لوگ پابندی احکام شریعت کو چھوڑ دیں بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ تمام موحد مسلم و ناجی ہیں۔ پھر جو کوئی چاہے اپنے خیالات فاسد سے ہمارے اس قول کے اور کچھ معنی قرار دے لے۔[2]

مسئلہ جبر و اختیار اور نجات

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو افعال انسان سے سرزد ہوتے ہیں اس کے اعضاء کی ترکیب ہی ایسی ہوتی ہے جس سے ان افعال کا اس سے سرزد ہونا ضروری ہوتا ہے۔[3]

وہ قویٰ جو خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کیے ہیں ان میں وہ قویٰ بھی ہیں جو انسان کو کسی فعل کے ارتکاب کے محرک ہوتے ہیں اور وہ قوت بھی ہے جو اس فعل کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ ان تمام قویٰ کے استعمال پر انسان مختار ہے۔[4]

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ "نہ عابد کی نجات عبادت پر ہے اور نہ فاسق کی درکات اس کے فسق پر" بلکہ انسان کی نجات صرف اس پر ہے کہ جو قویٰ خدا تعالیٰ نے اس میں رکھے ہیں اور جس قدر رکھے ہیں ان سب کو بقدر اپنی طاقت کے کام میں لاتا رہے...... اب اگر ہماری بناوٹ ایسی ہے جس میں قوائے بہیمیہ ہم پر غالب ہیں تو ضرور وہ گناہ ہم سے ہوگا۔ پس اگر ہم نے اس قوت کو جو اس کی برائی ہم کو بتاتی ہے' بے کار نہیں چھوڑا تو ہم پر کچھ گناہ نہیں ہے کیونکہ ہم نے پورا پورا فرض ادا کیا ہے اور اگر ہم نے اس نور قلب کو بے کار چھوڑ دیا ہے تو ہم خود اپنے اختیار سے گنہ گار اور مستوجب عذاب ہوئے ہیں۔[5]

---

[1] مقالات سرسید (۳)، ص ۱۸ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۳۶
[4] ایضاً ص ۵۳۳ [5] ایضاً ص ۲۳۶-۲۳۷

مسائل نماز

جمع بین الصلاتین

میرے نزدیک جمع بین الصلاتین جائز ہے۔[۱]

اس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ پانچ نمازیں ہر ایک مسلمان پر فرض ہیں...... اگرچہ اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ یہ پانچوں نمازیں پانچ وقت میں' جیسا کہ اہل سنت و جماعت کے ہاں ہے' پڑھی جائیں مگر مذہب اسلام میں کچھ سختی نہیں ہے کیونکہ ان پانچوں نمازوں کے لئے صرف تین وقت مقرر ہیں...... پس دوپہر کے بعد سے سورج کے غروب ہونے تک آٹھ رکعتوں کا ایک ساتھ دو سلاموں سے پڑھ لینا اور سورج کے غروب ہونے سے آدھی رات تک سات رکعتوں کا ایک ساتھ دو سلاموں سے پڑھ لینا' جس کو فقہا ''جمع بین الصلاتین'' کہتے ہیں' کچھ مشکل نہیں ہے۔[۲]

وضو کی بعض شرائط

اس میں کچھ شک نہیں کہ پاؤں کا دھونا اولیٰ اور افضل ہے لیکن قرآن مجید کے مطابق صرف ان پر مسح کر لینا کافی ہے اور ہمارے نزدیک انگریزی جوتا' جو ٹخنہ تک ہوتا ہے' یا موزہ پہنے ہوئے ہوں اور بعض محدثین کے نزدیک اگر جراب پہنے ہوئے ہوں تو اس پر مسح کرنا جائز ہے اور جب کہ جمع بین الصلاتین کی جائے تو صرف دو دفعہ وضو کرنا کافی ہوتا ہے' ایک صبح کی نماز کے لئے اور ایک قبل از غروب آفتاب جس سے قبل غروب آفتاب اور بعد غروب آفتاب کی چاروں نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں۔[۳]

ہمارا مقصد یہ ہے کہ نماز کو کسی نہ کسی طرح پر پڑھ لینا چاہیے۔ نماز کا ادا کرنا' جیسے کہ اس کا حق ہے' ان بزرگوں کا کام ہے جو نماز سے زیادہ کسی چیز کو مزے دار نہیں سمجھتے مگر ہم لوگوں کو ضرور ہے لپڑ سپڑ جس طرح ہو سکے دو ٹکریں لگا لیں۔[۴]

۱۔ خطوط سرسید' ص ۳۲۸ ۲۔ تفسیر القرآن (۸)' ص ۲۵۴-۲۵۵ ۳۔ ایضاً' ص ۲۵۵
۴۔ ایضاً' ص ۲۵۶

جوتا پہن کر نماز پڑھنا

جوتا پہن کر نماز پڑھنی سنت ہے اور اس پر نجس ہونے کا گمان کرنا وسواس میں داخل ہے۔ صرف اتنا دیکھ لینا چاہیے کہ کوئی نجاست ظاہری اس میں لگی ہوئی نہ ہو اور اگر ہو تو اس کو سخت چیز سے یا زمین سے رگڑ ڈالے اور پہن کر نماز پڑھ لے۔[1]

اس زمانہ میں اور بالخصوص ہندوستان میں مسلمانوں نے اس بات کو اپنی غلطی سے معیوب سمجھا ہے۔[2]

سمت قبلہ کی اہمیت

نماز کے لئے کسی طرف منہ کرنا اور سمت قبلہ ٹھہرانا اسلام کے اصلی اور لازمی احکام سے نہیں ہے۔[3]

یہ سمجھنا کہ کعبہ کی سمت خدا کی عبادت کے لئے مخصوص ہے، محض غلطی ہے اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف۔ وہ سمت عبادت کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک تمیز اور تفرقہ کے لئے مخصوص ہے۔[4]

مسلمانوں کے مذہب کے مطابق کوئی خصوصیت یا وقعت بیت المقدس یا بیت الحرام کو قبلہ ہونے کے لئے نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ صرف ابتداءً واسطے تفریق درمیان منافقین اور مومنین کے ٹھہرایا گیا اور انتہاءً بطور مسلمانوں کی ایک نشانی کے قرار پایا۔[5]

چونکہ یہ حکم بطور ایک نشان اور تمیز ان لوگوں کے قرار دیا گیا ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے اس لئے اس کا بھی بجالانا مثل احکام اصلی کے ضرور ہوگا اور قصداً ترک نہ کیا جائے گا۔ ہاں ان لوگوں پر تعجب ہوگا جو غلبہ اوہام سے سمت قبلہ کے لئے دوپہر میں باہر نکل کر سورج کو دیکھتے پھرتے ہیں کہ کس طرف سے نکلا تھا اور کس طرف ڈوبے گا اور اپنی جیبوں اور تسبیحوں میں قطب نما یا قبلہ نما رکھے یا لٹکائے پھرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ٹھیک ہماری ناک کعبہ کے

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۳۰ [2] ایضاً، ص ۲۳۲
[3] تفسیر القرآن (۸)، ص ۲۰۵ [4] ایضاً (۱)، ص ۱۷۶ [5] ایضاً، ص ۱۹۰

سامنے ہو جائے اور اسی میں ایک بڑا ثواب اور ٹھیک ٹھاک نماز کا ادا کرنا سمجھتے ہیں۔[1]

آں حضرت صلعم نے بعد نبوت قریب تیرہ برس کے مکہ میں تشریف رکھی...... لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے کہ ایسی حالتوں میں جب کہ آں حضرت صلعم کعبہ سے بعید ہوں تو انہوں نے نماز یا عبادت ادا کرنے میں کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کرنا بطور ایک امر لازمی کے، جس سے ثبوت سمت قبلہ کا ہو، اختیار فرمایا ہو بلکہ ہر طرح قرینہ و قیاس اس بات کا مقتضی ہے کہ جب تک آں حضرت صلعم نے مکہ میں تشریف رکھی، کوئی سمت قبلہ اختیار نہیں کی۔[2]

ترکِ صلوٰۃ

میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔[3]

نماز میں صرف ترجمہ پڑھنے کا مسئلہ

نماز میں قرآن مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔[4]

مسائل رمضان

روزہ کے عوض فدیہ کی شرط

جن لوگوں کو کیا باعتبار طبیعت و طاقت، خواہ باعتبار عمر، خواہ باعتبار ملک، خواہ باعتبار موسم روزے میں زیادہ تعب و مشکل پیش آتی ہے اور بدقت و بہ تعب روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بعوض روزہ کے فدیہ دے سکتے ہیں۔ وسع اور طاقت دو لفظ ہیں۔ طاقت کے لفظ کے مفہوم میں کسی کام کے بدقت و بدشواری انجام دے سکنا داخل ہے برخلاف وسع کے۔ اسی وجہ سے علما نے صرف شیخ فانی کو روزہ سے بری کیا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ صرف شیخ فانی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جس کا ایسا حال ہو وہ اس حکم میں داخل ہے۔[5]

۱۔ تفسیر القرآن (۱)، ص ۱۹۴ ۲۔ ایضاً، ص ۱۸۸ ۳۔ مخطوط سرسید، ص ۱۰۹ ۴۔ مکتوبات سرسید، ص ۲۹۹
۵۔ مکتوبات سرسید، ص ۳۱۵

شب قدر کا تعین

اس بات میں بحث ہے کہ شب قدر ایک دفعہ ہو چکی یا ہر رمضان میں پھر پھر کر آتی ہے۔ اہل سنت و جماعت و شیعہ امامیہ کا یہی عقیدہ ہے کہ ہر سال پھر پھر کر آتی ہے اور سنی و شیعہ امامیہ دونوں اس کی تلاش میں راتوں کو جاگتے اوراد و وظائف پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ ہم بھی بہت راتوں جاگے ہیں مگر ہماری بدبختی سے ہم کو تو نہیں ملی۔ قسطلانی شرح صحیح بخاری میں امام فاکہانی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ شب قدر صرف ایک ہی برس جناب رسول خدا صلعم کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ ہم اتنا اور اس پر زیادہ کرتے ہیں کہ "جب قرآن مجید نازل ہوا تھا" اور ہم بھی امام فاکہانی کی تحقیق کو صحیح و درست سمجھتے ہیں۔ ہم شب اخیر رمضان کو شب قدر سمجھتے ہیں جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔[1]

ارکانِ حج

حج میں قربانی کی اصل

حج میں قربانی کی کوئی مذہبی اصل قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی۔ مکہ ایک بیابان غیر ذی زرع تھا۔ اس قدر لوگوں کے جمع ہونے سے خوراک کا میسر آنا مشکل تھا اس لئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لے جاتے تھے جو بدن اور قلائد کے نام سے مشہور تھے اور جو نہ لے جاتے تھے وہ مکہ میں خریدتے تھے۔ ان کو ذبح کر کے خود بھی کھاتے تھے اور لوگوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حج میں صرف یہی اصل قربانی کی قرآن مجید سے پائی جاتی ہے...... اس زمانہ میں جو حج کے دنوں میں حاجت سے زیادہ قربانی کی رسم ہے اور لاکھوں جانور ذبح کر کے جنگل میں ڈالتے ہیں جن کو گیدڑ اور کوے بھی نہیں کھاتے اس کا کچھ بھی نشان مذہب اسلام میں

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۸۰

نہیں ہے۔[1]

حج کی قربانیاں درحقیقت مذہبی قربانیاں نہیں ہیں، نہ ان کی فرضیت قرآن مجید سے یا نص صریح سے پائی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے علمائے مجتہدین نے کتب فقہ میں کسی قربانی کو فرض قرار نہیں دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کوشش کی ہے تو واجب لکھا ہے اور ہم کو اس میں بھی کلام ہے۔[2]

احرام کا لباس

احرام کے وقت تہ بند باندھنے اور بغیر قطع کیا ہوا کپڑا پہننے کا بھی قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا رواج زمانہ جاہلیت سے برابر چلا آتا تھا اور اسلام میں بھی قائم رہا...... محمدؐ رسول اللہ نے شروع سویلزیشن (Civilization)* کے زمانہ میں بھی اسی وحشیانہ صورت اور وحشیانہ لباس کو ہمارے بڈھے دادا کی عبادت کی یادگاری میں قائم رکھا۔[3]

طوافِ کعبہ کی گزشتہ تاریخ

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں...... اگر اس زمانہ کے حالات اور اس زمانہ کی وحشی قوموں کی عبادت پر خیال کریں تو بجز اس کے اور کچھ نہیں پایا جاتا کہ وہ لوگ آپس میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور کودتے اور اچھلتے تھے اور وہ سارا حلقہ کا حلقہ اسی طرح چکر کھاتا جاتا تھا اور اسی جوش و خروش میں کھڑے ہو جاتے تھے اور سر ٹیک دیتے تھے اور اس کا نام پکارتے جاتے تھے یا اس کی تعریف کے گیت گاتے تھے جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اسی نماز کا نشان اسلام میں بھی طریقہ ابراہیمی پر موجود ہے جس کا نام مذہب اسلام میں طواف کعبہ قرار پایا ہے۔[4]

ابراہیمؑ اور اس کی اولاد کا یہ طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لئے مذبح ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر کے بناتے تھے۔ کبھی اس کے ساتھ کوئی مکان بھی بنا دیتے اور کبھی پتھر کھڑا کرنے کے

---

* تہذیب

[1] تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۵۵-۲۵۷ [2] ایضاً (۲)، ص ۹۴ [3] ایضاً (۱)، ص ۲۴۶-۲۴۷

[4] ایضاً، ص ۱۸۶

بعد بناتے تھے اور اس کو بیت اللہ کہتے تھے۔ بالکل یہی حالت کعبہ کی اور حجر اسود کی ہے جو ایک بن گھڑا لمبا پتھر ہے۔ پہلے صرف حجر اسود کھڑا کیا تھا، پھر جب وہاں کعبہ بنایا تو اس کے کونہ میں اس کو لگا دیا۔[1]

یہ پتھر جو کعبہ کے کونہ میں لگایا گیا تھا اس سے مقصود اس پتھر کی پرستش نہ تھی بلکہ صرف اس لئے لگایا گیا تھا کہ کعبہ کا طواف...... شروع ہونے اور ختم ہونے کی نشانی ہو...... مقتدر باللہ ابو الفضل جعفر ابن معتضد کے عہد میں، جو ۲۹۵ھ میں خلیفہ ہوا تھا، قرامطہ حجر اسود کو کعبہ سے اکھاڑ کر لے گئے تھے، مدت بعد پھر لا کر رکھ دیا۔[2]

مکہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے...... اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا طریقہ یہی تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے اور اسماعیلؑ کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہیئت کو اب تک قائم رکھا ہے۔[3]

ارکانِ حج اور بت پرستی میں فرق

اس مقام پر خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا فرق ہے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے اور اس کو اور حجر اسود کو بوسہ دینے اور قربان گاہوں کے بنانے اور ان کی تعظیم کرنے اور حضرت یعقوبؑ کے پتھر کھڑا کرنے اور اس پر تیل ڈالنے اور نماز میں بیت المقدس یا کعبہ کی طرف سجدہ کرنے، غرض کہ اشیائے مجسم کی تعظیم اور حرمت کرنے میں اور بت پرستوں کی ان رسوم میں جو کہ وہ اپنے بتوں کی نسبت عمل میں لاتے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کو ہر شخص حقارت اور غصہ کی نظر سے دیکھتا تھا اور اب بھی دیکھتا ہے؟ بلاشبہ ان دونوں کاموں میں بڑا فرق ہے مگر جو امر کہ لوگوں کو ان دونوں کاموں میں صاف صاف تمیز کرنے سے روکتا ہے وہ لفظ "بت پرستی" ہے جس سے یہ مراد سمجھی جاتی ہے کہ آدمی کسی مجسم اور مصنوعی شے کی تعظیم اور پرستش کرنے میں گنہ گار ہوتے ہیں۔[4]

حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی قربان گاہیں، جن میں کہ حجر اسود بھی شامل ہے، اور حضرت یعقوبؑ کا کھڑا کیا ہوا پتھر اور خانہ کعبہ اور بیت المقدس، یہ سب چیزیں کسی مشہور و معروف

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۳۱۰ [2] ایضاً ص ۳۱۳ [3] ایضاً، ص ۳۱۶ [4] ایضاً، ص ۱۳۹

اشخاص کی یادگار کے طور نہیں بنائی گئی تھیں اور نہ وہ کسی فرشتہ یا عظیم الشان قدرتی شے کے نام پر قائم کی گئی تھیں بلکہ بالتخصیص قادر مطلق کے نام پر‘ جو تمام چیزوں کا خالق ہے‘ اور اسی کی پرستش کی غرض سے بنائی گئی تھیں۔ جملہ رسوم اور تکلفات‘ جو ان مقاموں پر برتے جاتے تھے‘ صرف خدا تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے مختلف طریقے تھے اور خدا تعالیٰ کی بندگی‘ گو کسی طور بجالائی جائے جس کو خدا تعالیٰ نے منظور اور مقبول کرلیا ہو‘ ہرگز گناہ یا شرک یا بت پرستی نہیں ہوسکتی۔ تمام آدمیوں کا میدان عرفات میں جمع ہونا‘ جہاں کہ نہ حضرت ابراہیمؑ کا حجر اسود ہے نہ حضرت یعقوبؑ کا سنگ قربان گاہ اور نہ حضرت اسماعیلؑ کا معبد بلکہ محض ایک وسیع میدان ہے‘ ان لوگوں کا ایک ساتھ شامل ہو کر خدا کا نام لے کر پکارنا اور اپنے گناہوں کی معافی چاہنا خاص خدا کی عبادت ہے جس کا نام مسلمانوں نے حج رکھا ہے اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ اس طرح پر عبادت کرنے کے بانی ہوئے تھے۔ پس کون شبہ کرسکتا ہے کہ حج اس واجب الوجود لاشریک لہٗ کی خاص الخاص عبادت ہے۔[1]

ارکانِ حج اور دیگر عبادات کا اصل مقصود

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس پتھر کے بنے ہوئے چوکھونٹے گھر میں ایک ایسی متعدی برکت ہے کہ جہاں سات دفعہ اس کے گرد پھرے اور بہشت میں چلے گئے‘ یہ ان کی خام خیالی ہے۔ کوئی چیز سوائے خدا کے مقدس نہیں ہے۔ اسی کا نام مقدس ہے اور اسی کا نام مقدس رہے گا‘ اس چوکھونٹے گھر کے گرد پھرنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کے گرد تو اونٹ اور گدھے بھی پھرتے ہیں۔ وہ تو کبھی حاجی نہ ہوئے‘ پھر دو پاؤں کے جانور کو اس کے گرد پھر لینے سے ہم کیونکر حاجی جانیں! ہاں‘ جو حقیقتاً حج کرے وہ حاجی ہے۔[2]

ہم نہیں چاہتے کہ کوئی حاجی کہلانے کے لئے حاجی بنے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ حج کا جو اثر دل میں ہونا چاہیے اس کو حاصل کرے۔ اندھے والا حاجی بننے سے تو اسلام کو کچھ عزت نہیں ہو سکتی۔ ان کے لئے تو یہی کہنا بس ہے کہ ''رحمت بر اخلاق حجاج باد''۔ نماز سے اگر صرف ماتھے پر گٹا ڈال لینا مقصود ہے تو وہ تو پوری روسیاسی ہے۔ نماز سے نیاز پیدا کرنا چاہیے‘ دل پر اس کا اثر

---

[1] خطبات احمدیہ‘ ص ۱۴۰

[2] تفسیر القرآن (۱)‘ ص ۲۵۱

بٹھانا چاہیے۔ اگر طہارت کو صرف ہاتھ پاؤں دھونے پر منحصر سمجھا تو اسلام کی کچھ پیروی نہیں کی۔ ظاہری طہارت تو باطنی طہارت کا اشارہ کرتی ہے' پھر اگر باطنی طہارت حاصل نہیں ہوئی تو یہ ظاہری طہارت نجاست سے بدتر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کے جو روحانی نتیجے ہیں وہ مسلمانوں کو حاصل ہوں ورنہ بکرے کی سی ڈاڑھی اور بکرے کی طرح وظیفوں کی جگالی اور بلی کی سی طہارت اور مکری کے سے فریب سے کچھ فائدہ نہیں۔[1]

ہماری رائے یہ ہے کہ تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ صرف زبان سے مسلمان کہنے اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور بیچ کے گریبان کا کرتا اور گول عمامہ پہننے اور صرف نماز پڑھ کر دل خوش کر لینے اور صرف دن بھر کا فاقہ کر کے شام کو لذیذ چیزوں اور نفیس شربتوں سے افطار کرنے ہی کو اسلام نہ سمجھیں بلکہ اس کے ساتھ ان تمام نیکیوں پر بھی خیال کریں جو اسلام کے نتیجے ہیں' اور جب تک کہ انسان کے افعال اور خواہش اور معاملات اور اخلاق اور تمدن اور معاشرت میں ان کا ظہور نہیں ہوتا اس وقت تک ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسلام نے ان میں کچھ اثر کیا ہے ع

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے[2]

بدعات

ولی' بدعت اور کرامت

ہمارے زمانہ میں بدعت کا ایسا زور ہوا ہے کہ سنت کے نام سے لوگ بھاگتے ہیں۔ اگر سنت کا نام لو تو وہابی اور معتزلی کہلاؤ اور اگر بدعت پر بدعت کرتے جاؤ تو اللہ کے ولی بن جاؤ۔ اب تو یوں ٹھہر گیا ہے کہ جو سنت پر چلے وہ وہابی اور جو بدعت کرے وہ ولی۔[3]

آدمی کو لازم ہے کہ حضرتؐ ہی کی سنت پر چلنے اور شریعت ہی کی اطاعت کرنے پر سعی کرے اور جو حضرتؐ کی شریعت اور حضرتؐ ہی کی سنت پر چلتا ہو اسی کو پیر اور ولی اور ابدال [illegible]

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۶۰۴
[2] ایضاً، ص ۶۷۲
[3] راہِ سنت مشمولہ تصانیف احمدیہ [illegible]

غوث اور قطب جانے اور جو حضرتؐ کی شریعت سے باہر ہو اس کو شیطان سے بدتر جانے گو
زمین میں تیرتا ہو اور آسمان پر اُڑتا ہو۔[1]

کرشمے اور کرامات پر مت جاؤ بلکہ جو شخص سنت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
تابع ہو اسی کو ولی اور غوث اور قطب اور ابدال سمجھو گو اس سے ایک بھی کرامت نہ ہو کیونکہ
کرامت ہونا ولی ہونے کی نشانی نہیں بلکہ رسول اللہؐ کی سنت اور شریعت کا تابع ہونا ولی
ہونے کی علامت ہے۔[2]

چند بدعتوں کا ذکر

تعویذ طومار، گنڈے پلیتے کرنے اور کسی گنڈے کے سبب انڈا مرغی کا کھلانا اور کسی پلیتے
کے باعث ہرن کا گوشت کھلانا چڑھانا یہ بھی بدعت ہے۔[3]

راگ کی محفل کرنی اور قوالوں سے خالی معرفت کی غزلیں گوانی یا ڈھولکی سارنگی، تال تنبورہ
بھی بجوانا اور حال قال کی مجلس نام رکھنا اور مرثیہ خوانی اور کتاب خوانی کرنی، ماتم کرنا، تعزیے
بنانے، شدے نکالنے، لوگوں کو جمع کر کے قبروں پر جانا اور ان پر بیٹھ بیٹھ کر مراقبے کرنا اور اس
بات کو اللہ کی رضامندی کا باعث سمجھنا، قبروں پر جا کر مردوں سے مدد مانگنی، قبروں کو چومنا
آستانوں کا بوسہ لینا، گال رگڑنے، قبروں پر پھولوں کی چادر ڈالنی، غلاف چڑھانے، قبروں کو
غسل دینا اور اس کا پانی آب زمزم کی طرح پینا بانٹنا، اور لحد بنانے کو ثواب سمجھنا، قبروں پر روشنی
کرنی اور میلہ جمع کرنا اور عرس نام رکھنا، ناچ کرنا اور بسنت کا بہانہ بنا لینا، اگر کوئی مسلمان منع
کرنے تو امیر خسرو سے منکر جاننا اور ترت وہابی کہہ دینا، مردے کے لئے نماز ہول کا پڑھنا،
دفنانے کے بعد اذان کا دینا اور اسی طرح کی ہزاروں باتیں جو خلاف سنت رائج ہو گئی ہیں اور
ان کو ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے، یہ سب کی سب باتیں ٹھیٹ بدعت ہیں۔[4]

مجلس مولود

جشن مولود اگر بطور یادگار اس دن کے ہو جس میں ایک بڑا شخص پیدا ہوا جس نے تمام

---

1. کلمۃ الحق مشمولہ تصانیف احمدیہ، ص ۸۰ 2. ایضاً، ص ۸۱ 3. راہِ سنت مشمولہ تصانیف احمدیہ، ص ۱۰۷
4. ایضاً، ص ۱۰۹

دنیا کو سچائی سے روشن کیا...... تو اس جشن عظیم کا ہر سال ہونا نہایت عمدہ بات ہے، اس لئے کہ پرانی تاریخ کی یادگاریوں کو زندہ رکھنا افضل ترین بنی نوع انسان کے دائمی احسانوں کا اعتراف کرنا ہے...... چار آدمیوں کا بیٹھ کر اور نعتیہ چند اشعار پڑھ کر رو لینا بے فائدہ کام ہے بلکہ بعوض اس کے جشن عظیم الشان کیا جائے، شہر آراستہ ہوں، روشنیاں کی جائیں اور خوشیاں منائی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو شان و شوکت و حشمت اس نبی پاکؐ کے پیروؤں کی دکھلائی جائے...... اور اگر اس سے صرف ثواب کی گٹھڑیاں باندھنی مقصود ہوں اور اسی مقصد سے یہ مجلس بطور ایک مذہبی رسم کے کی جائے تو تو کل بدعۃ ضلالہ ہی ہے۔[1]

مُردوں کی فاتحہ اور کھانا

ایک کے فعل کا، خواہ وہ اس قسم سے ہو جس کو عبادت بدنی کہتے ہیں اور خواہ اس قسم سے ہو جس کو عبادت مالی کہتے ہیں، دوسرے پر خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ کچھ اثر نہیں ہوتا۔[2]

عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی، بجز اس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لئے کسی کے سپرد کر جائے، نیابت کا قائل نہیں ہوں۔[3]

قرآن و فاتحہ پڑھ کر ثواب بخشنا یا مُلّانوں کو بغرض ایصال ثواب کھانا کھلانا بالکل لاحاصل محض اور بہمہ وجوہ ہندوؤں کے اس فعل کے مشابہ ہے جو اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچانے کے لئے باہمنوں سے کتھا اور منتر پڑھواتے ہیں اور باہمنوں کو جماتے ہیں اور گیا و پراگ میں جا کر پنڈ دان کرتے ہیں۔[4]

بدعتی روزے

جتنے روزے کہ فرض اور سنت ہیں وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں۔ ہاں، بدعتیوں نے جو لغیر اللہ روزے نکالے ہیں جیسے سوا پہر کا روزہ، علی مشکل کشا کا اور تین دن کا طے کا روزہ اور مثل اس کے، ان کو بدعت اور خلاف نیچر جانتا ہوں۔[5]

---

[1] تصانیف احمدیہ، حصہ (۱)، جلد (۱)، ص ۲۰-۲۱ [2] ایضاً، ص ۲۰ [3] سیرت فریدیہ، ص [illegible]

[4] تصانیف احمدیہ، حصہ (۱)، جلد (۱)، ص ۲۰ [5] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۴۰

پیری مریدی

ہمارے زمانہ میں پیری مریدی کا ایسا ایک جھگڑا لگا ہے جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکے میں پڑے ہیں۔ جہاں ایک نئی صورت کا آدمی دیکھا کوئی تو اس کو قطب کہتا ہے اور کوئی ابدال اور کوئی ولی اور کوئی غوث، اور پھر وہ کیسی ہی باتیں کرتا ہو اس پر کچھ خیال نہیں کرتے۔ اگر کوئی کہے کہ میاں، یہ تو شرع کے خلاف باتیں کرتا ہے تو یوں جواب دیتے ہیں کہ "اجی، تم نہیں جانتے۔ طریقت کا اور ہی راستہ ہے، فقیروں کی باتیں ہی جدا ہیں۔ شریعت تو ظاہر کے لئے ہے، یہ ولی اللہ کے ہیں جو کریں سو بجا ہے" [1]

یہ بات کہ ہم فلانے سلسلہ میں مرید ہوئے، اس کی کچھ اصل نہیں کیونکہ یہ بیعت تو دراصل توبہ ہے۔ پھر یہ کہنا کہ ہم نے فلانے خاندان میں توبہ کی یا فلانے سلسلہ میں توبہ کی، اس کے کچھ معنی نہیں۔ ہمارے زمانہ میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ مرید ہو کر پیر کو اپنا حمایتی جانتے ہیں اور شجرہ لے کر اس کو معافی کا پروانہ سمجھتے ہیں اور یوں جانتے ہیں کہ ہمارے پیر ہمارے نزع کے وقت بھی کام آئیں گے اور قبر میں بھی حمایت کو دوڑیں گے اور اڑے کام نکالیں گے۔ یہ سمجھنا بالکل گمراہی ہے۔ قبر میں اپنے اعمال کے سوا کچھ کام نہیں آتا، شجرہ لے جانے سے کیا فائدہ؟ اپنا نامہ اعمال درست کرنا چاہیے جو قبر میں بھی کام آئے اور قیامت میں بھی۔ [2]

باطل تعظیمی عقائد

غلاف کعبہ کے ٹکڑوں کی برکت

کعبہ کے خادم پرانے غلاف کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بطور تبرک کے تقسیم کرتے ہیں اور حاجی ان ٹکڑوں کو نہایت شوق سے لاتے ہیں اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے دوستوں کو دیتے ہیں۔ اکثر مسلمان جن کے پاس یہ ٹکڑے ہوتے ہیں اپنے ساتھ کفن میں رکھ کر قبر میں لے جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس کی برکت سے عذاب سے بچیں گے، مگر

---

[1] کلمۃ الحق مشمولہ تصانیف احمدیہ، ص ۸۷ [2] ایضاً ص ۸۶

مسلمانوں کے یہ سب اوہام وخیالات ہیں۔ مذہب اسلام ایسی باتوں سے جو کچے سوت سے بھی زیادہ بودی ہیں، پاک وصاف ہے۔ مذہب اسلام سے نہ یہ بات پائی جاتی ہے کہ غلاف کعبہ کچھ متبرک ہو جاتا ہے، نہ یہ پایا یا تا ہے کہ اس کے قبر میں ساتھ لے جانے سے، بجز اس کے کہ وہ بھی مثل جسم وکفن کے خاک ہو جائے، اور کچھ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔[1]

آبِ زمزم کے فضائل

زمزم کا کنواں اس وجہ سے کہ ہمارے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا ہے جس میں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پانی پیا ہے، بلاشبہ قابل ادب اور عزت کے ہے لیکن اس کے پانی کے فضائل میں جو روایتیں ہیں وہ سب بے سند اور ضعیف ہیں اور اکثر موضوع۔ حاجی جو زمزم کا پانی چھوٹی چھوٹی زمزمیوں میں بھر کر بطور تبرک کے ہندوؤں کی مانند دور دور لے جاتے ہیں اور سب لوگ بطور تبرک کے اس کو رکھتے ہیں اور اس پانی کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور بغرض اظہار ادب کھڑے ہو کر پیتے ہیں، اس کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ جیسے اور کنوؤں کا پانی ہے وہ بھی ویسا ہی کنوئیں کا پانی ہے۔ مزہ میں میٹھا نہیں ہے بلکہ ململا تا ہے۔ جس وقت کھنچیں اگر اسی وقت پی لیں تو شاید پینے کے قابل ہو، الا رکھا رہنے سے زیادہ ململا ہو جاتا ہے۔[2]

سجدہ اور طوافِ قبور

بت کو سجدہ کرنا، سیتلا کے تھان کو سجدہ کرنا، مدار صاحب کی چھڑیوں کو پوجنا، اولیاء اللہ کی قبروں کو سجدہ کرنا، ان کا طواف کرنا سب برابر ہیں۔ ہزاروں مسلمان یہ باتیں کرتے ہیں...... مسجود میں جب تک اللہ ہونے کا یقین نہ ہو اس وقت تک ان کے سجدہ سے آدمی کافر نہیں ہوتا، ہاں، بلاشبہ نہایت سخت گناہ کبیرہ ہے۔[3]

---

[1] خطبات احمدیہ، ص ۳۳۱   [2] ایضاً، ص ۳۳۶   [3] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۳۰

اوہام

دم تعویذ اور جادو ٹونا

اس زمانہ میں ہماری سوسائٹی کا حال دیکھو' کس قدر لوگ فقیروں کے اور مشائخوں کے پیچھے اسی کرامت کے اعتقاد کے سبب خراب ہیں۔ حماقت سے دعائیں منگواتے پھرتے ہیں' مرے ہوئے بزرگوں کی قبروں پر ان کے صاحب کرامات ہونے کے اعتقاد سے چلے باندھتے ہیں' منتیں مانتے ہیں' بیماروں کو لے جاتے ہیں' چوکھٹ پر ڈال دیتے ہیں' درخت سے باندھ دیتے ہیں' کیا کیا کچھ ذلت وخواری ہے جو نہیں بھگتتے۔ شریفوں کے بچوں کے گلوں میں' جوانوں کے بازوؤں پر اسی اعتقاد کے سبب تعویذوں کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں۔ امراض کے لئے' مرادیں حاصل ہونے کے لئے عمل پڑھے جاتے ہیں۔ ہمارے شہر میں ایک بڑے خاندانی بزرگ تھے' اپنی بواسیر کی بیماری پر اپنے پیر سے دم ڈلوانے جاتے تھے۔ ہمارے ایک دوست ہیں' وہ نماز کے بعد کچھ پڑھتے ہیں اور اپنی پھونک اپنی ہی مٹی میں بند کرتے ہیں اور آگے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر چند کہتے ہیں کہ یہ تو ''بمشت پیمر دن'' کی مثل ہے مگر وہی اعتقاد معجزہ وکرامت کا اس لغو حرکت کا باعث ہے۔ فقیر کی دعا سے مرد کا عورت اور عورت کا مرد ہو جانا یقین کرتے ہیں۔ اس قماش کے وہ لوگ ہیں جو سحر پر یقین رکھتے ہیں۔ صرف اتنا فرق جانتے ہیں کہ اعمال پاک اور سحر ناپاک ہے مگر دونوں کا نتیجہ واحد ہے۔ ہندوستانی عدالتوں میں سحر کے مقدمات دائر ہوتے ہیں۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص مدعا علیہ نے سحر سے میرے بیٹے کو بیٹی بنا دیا ہے۔ اچھے اچھے مقدس آدمی گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے اس حاضر ہذا کو' جو اب بیٹی ہے' بیٹا دیکھا تھا۔ یہ تمام برائیاں مذہبی اور تمدنی' جو مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں' ان کا سبب وہی کرامت ومعجزہ پر اعتقاد کا ہونا ہے۔[1]

---

[1] مقالات سرسید (۱)، ص ۱۲۵

قرآنی عملیات

لوگ قرآن مجید کی آیتوں کو بطور عمل کے پڑھتے ہیں اور کسی میں وسعت رزق کی اور کسی میں کشود کار کی اور کسی میں شفاء امراض کی تاثیر سمجھتے ہیں..... قرآن مجید کی کسی آیت یا سورت میں اس قسم کی تاثیر نہیں ہے۔ نہ قرآن کوئی عملیات کی کتاب ہے، نہ ان کاموں کے لئے نازل ہوا ہے۔[1]

سحر

''جادو برحق ہے اور کرنے والا کافر ہے'' اس مثل کے دوسرے جملہ سے تو ہم کو بحث نہیں، ہاں پہلے جملہ سے بحث ہے۔ کیا سچ مچ یہ بات برحق ہے کہ جادو برحق ہے؟[2]

اس مثل کے پہلے جملے میں غلطی ہے۔ صحیح مثل یوں ہونی چاہیے کہ ''جادو غلط اور جھوٹ اور فریب ہے مگر کرنے والا کافر ہے''۔[3]

مسلمانوں کو بھی بدبختی سے جادو کے برحق ہونے کا یقین رہا ہے اور اکثر علما نے قرآن مجید کی آیتوں اور بعض حدیثوں کے غلط معنی سمجھ کر یہ بات قرار دی کہ قرآن مجید سے اور حدیثوں سے جادو کا برحق ہونا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ یہ خیال محض غلط تھا..... قرآن مجید کی جن آیتوں سے سحر کا برحق ہونا سمجھا جاتا ہے وہ صحیح نہیں بلکہ وہ آیتیں سحر کے برحق ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔[4]

اہل سنت و جماعت کا تو (جن کا ہم بھی دم بھرتے ہیں) یہ اعتقاد ہے کہ جادو برحق ہے..... وہ سنی مسلمان جن کو لوگ معتزلی کہتے ہیں، وہ تو جادو کے منکر ہیں اور پیغمبر خدا صلعم پر جادو ہونے سے تو نہایت سخت انکار کرتے ہیں۔[5]

اگلے زمانے میں اگرچہ لوگوں کو سحر کا یقین تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ جادو سے آدمی گدھا اور گدھا آدمی بن سکتا ہے مگر اسی زمانے میں جو لوگ زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے جادو کے برحق ہونے سے انکار کیا۔ من جملہ ان کے ایک حضرت امام ابوحنیفہ ہیں جنھوں نے فرمایا کہ سحر کی

1. تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۲: ۲
2. ایضاً، ص ۳۴۷
3. النظر (باب سوم)، ص ۱۱
4. مقالات سر سید (۴)، ص ۳۰۱-۳۰۲
5. تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۴۸-۳۴۹

کچھ اصلیت نہیں ہے۔ اور معتزلہ کل سحر کے برحق ہونے کے قائل نہیں ہیں اور شافعیوں میں سے ابو جعفر اور حنفیوں میں سے ابوبکر رازی اور ظاہریوں میں سے ابن حزم بھی سحر کے برحق ہونے کو نہیں مانتے۔[1]

سحر کا لفظ جہاں قرآن میں آیا ہے وہ صرف عرب جاہلیت کے خیال کے موافق آیا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس طرح پر عرب جاہلیت سحر کو سمجھتے تھے درحقیقت اسی طرح پر اس کا وجود تھا یا خدا تعالیٰ نے اس کا واقعی ہونا بتایا ہے یا عرب جاہلیت کے خیالات کی تصدیق کی ہے۔ ... سحر، جس طرح کہ لوگ اس پر یقین کرتے ہیں اور عرف عام میں جس طرح پر وہ سمجھا جاتا ہے، اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور نہ قرآن مجید سے اس کی تصدیق پائی جاتی ہے۔[2]

زمانہ نزول قرآن مجید میں ایسے لوگ موجود تھے جو ساحر کہلاتے تھے اور وہ ایسے افعال بھی کرتے تھے جن کو وہ سحر سمجھتے تھے۔ پس قرآن مجید میں سحر و ساحر کا ذکر ہونے سے ایسے اشخاص اور ان کے افعال کا وجود ثابت ہوتا ہے، نہ کہ سحر کے برحق ہونے کا۔[3]

نفس انسانی میں ایک ایسی قوت برقی اور مقناطیسی موجود ہے جو خود اس پر اور اس کے خیال پر اور دوسروں پر اور دوسروں کے خیال پر اثر کرتی ہے...... اس قوت کا ایسا قوی اثر ہے کہ معمول کی تمام طاقت اور تمام ارادہ اور خیال بالکل عامل کے تابع ہو جاتا ہے...... جو قصہ موسیٰ و سحرہ فرعون کا قرآن میں مذکور ہے وہ اسی قوت انسانی کا ظہور ہے، نہ وقوع کسی امر خلاف قانون قدرت کا۔[4]

پس کچھ شبہ نہیں کہ قرآن کی رو سے جادو باطل ہے۔[5]

نجوم

نجوم کے قواعد، جو نسبت اشخاص کے ہیں، سب جھوٹے ہیں۔ کسی مسلمان کو باعتبار مذہب و عقائد و عقل کے اور کسی غیر مسلمان کو باعتبار عقل کے ان پر متوجہ ہونا اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔[6]

۱۔ مقالات سرسید (۴)، ص ۳۰۴ ۲۔ تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۱۳ ۳۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۵۳
۴۔ ایضاً، ص ۳۵۴-۳۵۵ ۵۔ ایضاً، ص ۳۶۸ ۶۔ مکتوبات سرسید، ص ۶۸۴

بزرگوں کے تصورات

عالم غیب اور مکاشفہ

علمائے اسلام وصوفیاء کرام عالم غیب کے ایسے حالات اور واقعات تفصیلی بیان کرتے ہیں جن کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے اور نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے یہ حالات معلوم ہوئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مکاشفہ سے یہ سب حالات کھلتے ہیں۔ ہم کو تو مکاشفہ نہیں ہے کہ یہ حالات کھلیں۔ خدا ہم کو بھی مکاشفہ مرحمت فرمائے تاکہ ہم کو بھی یہ حالات معلوم ہوں۔ اب تک تو ہم یہی جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے یا سمجھتے یا جانتے یا دیکھتے ہیں وہ ان ہی کے خیالات ہیں جن کو خود ان کے متخیلہ نے پیدا کیا ہے۔[1]

انسان کے نفس میں ایسی قوتیں مخفی ہیں جن کو اس زمانہ میں قوت مقناطیسی سے تعبیر کیا جاتا ہے جس سے مختلف طرح کے عجائبات ظہور میں آتے ہیں۔ وہ قوت دوسرے انسان کے نفس پر اثر کرتی ہے اور خود اپنے نفس پر موثر ہوتی ہے۔ جب کہ انسان تمام دیگر تعلقات سے اپنے تئیں منقطع کر کے ایک جانب متوجہ ہوتا ہے تو اس کو ایسا استغراق ہو جاتا ہے کہ سوائے اس کے اس کے تمام دیگر موجودات اور خیالات اس سے محو ہو جاتے ہیں اور بجز اسی ایک خیال کے اور کچھ اس کے خیال میں نہیں رہتا۔ خواب میں وہ اسی خیال کے متعلق بہت سے امور دیکھتے ہیں۔[2]

انسان جو کچھ اپنے خیالات میں پکا لیتا ہے اسی کا نام مکاشفہ ہے اور یہ حالتیں جو صوفیا کرام نے بیان کی ہیں، سب خیال ہی خیال ہیں اور خیال کے سوا کچھ نہیں۔[3]

جس طرح سونے کی حالت میں تعلقات ظاہری منقطع ہو جاتے ہیں اور جس میں انسان کو انہماک ہے وہی خیالات مجسم صورت میں انسان کو دکھائی دیتے ہیں، وہی حالت انسان پر بیداری میں، حالت استغراق اور انہماک میں طاری ہوتی ہے اور بیداری میں بھی اسی طرح سب چیزیں اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے جیسے کہ حالت خواب میں دیکھتا ہے۔ وہ بن آواز دیتے

---

[1] مقالات سرسید (۳)، ص ۱۸۵ [2] ایضاً (۱)، ص ۱۴۱ [3] آخری مضامین، ص ۸۹

والے کے سنتا ہے، بغیر کسی موجود فی الخارج کے موجود فی الخارج دیکھتا ہے، بغیر موجود ہونے کسی بات کہنے والے کے ایک وجود موجود کو متکلم پاتا ہے...... اولیاء اللہ پر بھی یہ حالت طاری ہوتی ہے اور اس حالت میں جو انکشاف ان کو ہوتا ہے اس کو مشاہدہ اور مکاشفہ اور الہام اور نفث فی الروع سے تعبیر کرتے ہیں۔[1]

دیدارِ باری تعالیٰ

خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہو سکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں، اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ بے چوں و بے چگوں ہے، کسی حیز و صورت میں آنے کے قابل ہی نہیں ہے پھر وہ کیونکر دنیا میں یا عقبیٰ میں دکھائی دے سکتا ہے! بہت سے عابد و زاہد دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے ان آنکھوں سے دنیا ہی میں خدا کو دیکھا ہے۔ بہت سے کہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا دکھایا کچھ نہیں بلکہ خود ان ہی کا خیال یا ایقان ہے جو انہوں نے دیکھا ہوگا۔ عقبیٰ میں بھی اگر خدا کا دیکھنا تسلیم کیا جائے تو وہ بھی خدا کا دیکھنا نہ ہوگا بلکہ خود ان ہی کا ایقان ان کو دکھائی دے گا، نہ خدائے بے چوں و بے چگوں و بے مثل و بے نموں۔[2]

روحوں سے ملاقات

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انسان میں ایسی قوت مقناطیسی ہے کہ دوسرے انسان یا انسانوں کے خیال پر موثر ہوتی ہے اور وہ ان کو ایسے امور دکھلا سکتے ہیں جن کا حقیقتاً کچھ وجود نہیں ہے مگر وہ ان کو موجود سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور کبھی اشیا موجودہ کو ایک منقلب صورت پر دکھلا دیتے ہیں، جیسے کہ سحرہ فرعون نے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپوں کی صورت میں لوگوں کو دکھلا دیا تھا۔ پس اگر کسی نے ایک دھندلی سی شبیہ دکھلا دی اور دیکھنے والوں نے خیال بھی کیا کہ فلاں شخص یا فلاں عورت کی روح ہے اور اس سے باتیں بھی کر لیں تو اس بات کا یقین کیونکر ہو کہ درحقیقت وہ ان شخصوں کی روح تھی یا صرف قوت مقناطیسی کے سبب سے اس شخص نے لوگوں کے خیال

---

[1] مقالات سرسید (۱)، ص ۱۴۲-۱۴۳ [2] تفسیر القرآن (۳)، ص ۲۵۳

میں ایسا اثر ڈالا تھا کہ ان کو خیال میں ایک دھندلی سی صورت دکھائی دی اور انہوں نے تصور کر لیا کہ یہ فلاں شخص کی روح ہے۔[۱]

ہم اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ خواب میں ہم نے ایک بزرگ کو دیکھا جو مرے ہوئے تھے اور ان بزرگ* نے ہم سے ایک بات کہی' مگر جب ہم اُٹھے تو ہم بھول گئے کہ کیا کہا تھا۔ جو بزرگ کہ ان کے سجادہ نشین تھے ان سے ہم نے عرض کیا اور چاہا کہ وہ بتائیں کہ کیا بات انہوں نے کہی تھی۔ اس وقت تو انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا مگر دو تین دن بعد ایک رقعہ لکھ بھیجا کہ یہ بات تم سے کہی تھی۔ میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ یہ بات آپ کو کیونکر معلوم ہوئی؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان بزرگ کی روح سے پوچھ لیا — اور میں ایسے شبہے میں پڑ گیا کہ شاید ان بزرگ نے خواب میں مجھ سے یہی بات کہی تھی۔[۲]

خوابوں کی تعبیر

خواب کی کیفیت

ہمارے نزدیک بجز ان قویٰ کے جو نفس انسانی میں مخلوق ہیں' اور کوئی قوت خوابوں کے دیکھنے میں موثر نہیں ہے۔[۳]

بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں آدمی باتیں سوچتا ہے اور اپنے دل میں قرار دیتا ہے کہ یہ ہوگا اور وہی ہوتا ہے، یا کسی شخص کو یاد کرتا ہے اور وہ شخص آجاتا ہے' اور بہت دفعہ اس کے مطابق نہیں ہوتا۔ پس اس کی بیداری کے خیال کے مطابق واقعہ کا ہونا ایک امر اتفاقی ہوتا ہے۔ اسی طرح خواب میں بھی جو باتیں وہ دیکھتا ہے اور وہ وہی ہوتی ہیں جو اس کے دماغ اور خیال میں جمی ہوئی ہوتی ہیں۔ پس کبھی ان کے مطابق بھی کوئی واقعہ اسی طرح واقع ہوتا ہے جس طرح کہ بیداری کی حالت میں خیالات کے مطابق واقع ہو جاتا ہے۔ ہاں' اس

---

* سرسید نے اپنے خوابوں کا تذکرہ میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ان مرحوم بزرگ کا نام شاہ غلام علی اور ان کے سجادہ نشین کا نام شاہ احمد سعید بتایا ہے۔ (بحوالہ حیاتِ جاوید' ضمیمہ نمبر ۳' ص ۱۱)

[۱] مقالات سرسید (۴)، ص ۴۹ [۲] ایضاً ص ۵۰ [۳] تفسیر القرآن (۵)، ص ۸۱

میں شبہ نہیں کہ انبیا اور صلحا کے خواب بسبب اس کے کہ ان کے نفس کو تجرد فطری و خلقی یا اکتسابی حاصل ہوتا ہے' ان کے خواب بالکل سچے اور اصلی اور مطابق ان کی حالت نفس کے ہوتے ہیں اور ان سے ان کے نفس کا تقدس اور متبرک ہونا ثابت ہوتا ہے۔[1]

حضرت یوسفؑ کا خواب

حضرت یوسف علیہ السلام...... نے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ان کے سوا گیارہ بھائی اور تھے اور ماں اور باپ تھے۔ باپ اور ماں کا تقدس اور عظم و شان اور قدر و منزلت ان کے دل میں منقش تھی۔ بھائیوں کو بھی وہ اپنے باپ کی ذریات جانتے تھے مگر اس سبب سے کہ ان کے باپ ان کو سب سے زیادہ چاہتے تھے اور خود ان کے باپ و ماں اور ان کے سبب سے ان کے بھائی ان کی تابع داری بسبب چاؤ و محبت کے کرتے تھے اور اس لئے ان کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ماں باپ اور بھائی سب میرے تابع و فرماں بردار اور میری منزلت و قدر کرنے والے ہیں۔ یہ کیفیت جو ان کے دماغ میں منقش تھی اس کو متخیلہ نے سورج اور چاند اور ستاروں کی شکل میں' جن کو وہ ہمیشہ دیکھتے تھے اور ان کا تفاوت درجات بھی ان کے خیال میں متمکن تھا' متمثل کیا اور انہوں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھ کو سجدہ کرتے ہیں۔ پس ان کی تعبیر حالت موجودہ میں یہ تھی کہ ماں' باپ اور بھائی سب ان کے فرمانبردار ہیں...... اس واقعہ کے ایک مدت بعد حضرت یوسف علیہ اسلام کے ماں' باپ' بھائیوں کا مصر میں جانا اور موافق داب سلطنت کے آداب بجالانا...... ایک امر اتفاقی تھا کیونکہ یہ بات قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بھی' جو نبی تھے اس خواب سے یہ سمجھے تھے کہ حضرت یوسفؑ ایسی منزلت میں پہنچیں گے کہ ماں' باپ اور بھائی جا کر ان کو سجدہ کریں گے۔[2]

حضرت یوسفؑ کے ساتھی قیدیوں کے خواب

دوسرا اور تیسرا خواب ان دو جوانوں کا ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید خانہ

---

[1] تفسیر القرآن (۵)، ص ۸۵ [2] ایضاً، ص ۸۱-۸۲

میں تھے۔ ان میں سے ایک نے دیکھا کہ میں شراب چھان رہا ہوں۔ دوسرے نے دیکھا کہ اس کے سر پر روٹی ہے اور پرند اس کو کھا رہے ہیں۔ یہ دونوں شخص کسی جرم کے متہم ہو کر قید ہوئے تھے۔ پہلا شخص، جو غالباً ساقی تھا، درحقیقت بے گناہ تھا اور اس کے دل کو یقین تھا کہ وہ بے گناہ قرار پاکر چھوٹ جائے گا۔ وہی خیال اس کا سوتے میں شراب تیار کرنے سے، جو اس کا کام تھا، متمثل ہو کر خواب میں دکھلائی دیا۔ دوسرا شخص، جو غالباً باورچی خانہ سے متعلق تھا، درحقیقت مجرم تھا اور اس کے دل میں یقین تھا کہ وہ سولی پر چڑھایا جائے گا اور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ وہی خیال اس کا سوتے میں روٹی سر پر رکھ کر لے جانے سے، جو اس کا کام تھا، اور پرندوں کا روٹی کھانے سے متمثل ہو کر خواب میں دکھائی دیا۔ حضرت یوسف علیہ اسلام اس مناسبت طبعی کو، جو اِن دونوں خوابوں میں تھی، سمجھے اور اس کے مطابق دونوں کو تعبیر دی اور مطابق واقعہ کے ہوئی۔[1]

عزیزِ مصر کا خواب

چوتھا خواب وہ ہے جو خود بادشاہ نے دیکھا کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیں ہیں اور اور سوکھی...... قدیم مصریوں نے دریائے نیل کے چڑھاؤ کے، جس پر اچھی فصل کا یا قحط کا ہونا منحصر تھا، متعدد جگہ اور متعدد طرح سے پیمانے بنا رکھے تھے اور ان کو بہت زیادہ اچھی فصل ہونے یا قحط ہونے کا خیال اور ہمیشہ اس کا چرچا رہتا تھا...... غالباً اس زمانہ میں مصر کی نسبت اور قحط پڑنے کی نسبت چرچے ہوتے ہوں گے اور بادشاہ مصر کو اس کا بہت خیال رہتا ہوگا۔ وہی خیال پیداوار کے زمانہ کا موٹی تازی گائیوں اور ہری ہری بالوں سے اور قحط کے زمانہ کا دبلی گائیوں اور سوکھی بالوں سے متمثل ہو کر فرعون کو خواب میں دکھائی دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی حالت کے مناسب تعبیر دی جو مطابق واقعہ کے ہوئی۔[2]

---

[1] تفسیر القرآن (۵)، ص ۸۴

[2] ایضاً، ص ۸۳-۸۴

شیعوں کے ناپسندیدہ مسائل

متعہ

متعہ کے یہ معنی ہیں کہ ایک مرد ایک عورت سے میعاد معین کے لئے، مثلاً ایک شب کے لئے بعوض مال معین کے، مثلاً دس روپے کی اجرت ٹھہرا لے اور اس سے اس میعاد تک مباشرت کرے جیسا کہ اس زمانہ میں بے حیا عورتوں سے بے حیا مردوں کا عام دستور ہے۔ علما کا اتفاق ہے کہ ابتدائے اسلام میں متعہ جائز تھا اور اس باب میں، کہ وہ بدستور جائز ہے یا ممنوع یا منسوخ ہو گیا ہے، اختلاف ہے۔ گروہ کثیر امت کا یہ قول ہے کہ...... یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے مگر جن آیتوں سے اس کے نسخ کا استدلال کرتے ہیں وہ استدلال میری دانست میں نہایت ضعیف ہے۔ اور گروہ قلیل امت کا یہ قول ہے کہ حکم جواز متعہ بدستور بحال و غیر منسوخ ہے۔[1]

شیعہ حضرت علی مرتضیٰؓ سے جواز متعہ کی بہت سی روایتیں بیان کرتے ہیں مگر اہل سنت و جماعت کے ہاں حضرت علی مرتضیٰؓ سے کوئی معتبر روایت جواز متعہ پر منقول نہیں ہے...... جس قدر حدیثیں جواز متعہ پر بیان ہوئی ہیں اور جس قدر کہ اس کی منسوخی یا بحالی کی نسبت منقول ہیں ان میں سے ایک بھی لائق التفات اور قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔[2]

شیعہ کی پشت پناہ تو جناب علی مرتضیٰؓ ہی ہیں، انہوں نے سچ جھوٹ جو چاہا اب المظلوم علیہا السلام پر تہمت دھر دی...... ہم روایات متعلق متعہ کو صحیح تسلیم نہیں کرتے...... ہماری تحقیق یہ ہے کہ متعہ کا طریقہ اسلام نے پیدا نہیں کیا بلکہ وہ قدیم سے جاری تھا۔ اسلام نے اس کو منع کیا گو کہ ابتدائے زمانہ اسلام میں بھی جاری رہا ہو۔ بہت سے رواج زمانہ جاہلیت کے ایسے تھے جو زمانہ ابتدائے اسلام میں رائج تھے، بعد کو ممنوع ہوئے۔ متعہ بھی اس میں ہے۔[3]

متعہ کے غیر ممنوع ہونے پر متعدد صحابہ بلکہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو بھی خیال نہ تھا۔[4]

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۱۱۶-۱۱۸ [2] ایضاً، ص ۱۱۸-۱۱۹ [3] ایضاً، ص ۱۲۰-۱۲۱

[4] ابطال غلامی، ص ۱۵۸

تبرا وتقیہ

دل ایک ایسی چیز ہے کہ جب اس میں عداوت کی' گوکہ وہ یزید ہی سے ہو' اور نفاق کی' گو وہ کسی حالت میں ہو' جڑ بندھتی ہے تو اس کی نیکی و صفائی گندی و گدلی ہو جاتی ہے۔ اس لئے جیسے کہ میں شیعوں کے مسئلہ حب اہل بیت کو پسند کرتا ہوں ویسا ہی ان کے مسئلہ تبرا و تقیہ کو ناپسند کرتا ہوں اور دلی نیکی اور صفائی اور سچائی کے بالکل برخلاف جانتا ہوں۔[۱]

تبرا' جس کا رواج ان شیعوں میں ہو گیا ہے جو نامہذب ہیں' نہایت خراب چیز ہے اور انسان کے دل میں ایک بدی اور بداخلاقی اور بدطینتی پیدا کرنے والا ہے۔[۲]

متفرق مسائل

اہل کتاب کا ذبیحہ

جو احکام حلال و حرام کے ہمارے مذہب میں ہیں' اہل کتاب ان کے مکلف نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ پس جب کہ اہل کتاب کا ذبیحہ خدا تعالیٰ نے ہم کو حلال کر دیا ہے تو اس میں یہ شرط کسی طرح نہیں لگ سکتی کہ جس طرح ذبح کا حکم مسلمانوں کے لئے ہے اسی طرح وہ بھی ذبح کیا کریں۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اہل کتاب حضرت مسیحؑ کا نام لے کر ذبح کریں تو بھی اس کا کھانا درست ہے۔[۳]

...... میں نے یہ بات لکھی اور اس پر عمل بھی کیا کہ عیسائیوں کے ہاتھ کے مارے ہوئے جانور کو جس طرح پر کہ ان کے علما کے نزدیک مارنا درست ہو اور گو وہ طریقہ کیسا ہی ہمارے مذہب کے طریق ذبح سے مختلف یا متناقض ہو اور اگر بموجب ہمارے اصول مذہب کے اس پر ذبیحہ کا اطلاق ہی نہ ہو سکتا ہو' کھانا شرعاً درست ہے۔[۴]

اگر اہل کتاب کسی جانور کی گردن توڑ کر مار ڈالنا یا سر پھاڑ کر مار ڈالنا زکوٰۃ سمجھتے ہوں تو بھی اس کا کھانا درست ہے۔[۵]

---

۱ تحفہ حسن مشمولہ تصانیف احمدیہ' ص ۲۴ ۲ ایضاً' ص ۷۵ ۳ احکام طعام' ص ۱۷
۴ مسافران لندن' ص ۱۶۱ ۵ احکام طعام' ص ۱۷

علمائے عربی ترکستان نے بلاکسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے۔ تمام ترک جن کے خاک بو ہونے کی بھی ہم کولیاقت نہیں ہے' سب بے تامل اس کو کھاتے ہیں۔[1]

ہم نے انگریزوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا یا گردن مروڑی ہوئی مرغی و کبوتر کھایا۔ یہ امر اضطراری نہ تھا بلکہ اختیاری تھا۔ پس ہمارے مسلمان بھائی متعصب (نہیں نہیں' اہل تقویٰ و ورع) اگر اس کو ناجائز سمجھتے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ اس کو نہ کھائیں۔[2]

عیسائی مذہب کے بموجب' جیسا کہ ان کے رہبان اور قسیس قبل نزول قرآن مجید سے سمجھتے آتے تھے' طیور مختنقہ حرام نہیں ہیں اور اس کے دلائل عیسائی مذہب کی کتب دینیہ میں مندرج ہیں۔ پس جب کہ عیسائی وہ فعل مطابق اپنے مذہب کے کرتے ہیں تو باستدلال وطعام الذین اوتو الکتاب حل لکم ہمارے لئے حلال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے میرا یہ اجتہاد کافی ہے' دوسرا شخص خواہ اس کو صحیح سمجھے یا نہ سمجھے۔[3]

عیسائیوں کے ساتھ دوستی

قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہوسکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔[4]

اجماع امت کا وجوب

صحیح مسئلہ اسلام کا یہ ہے کہ جس طرح ایک آدمی کا خطا میں پڑنا ممکن ہے اسی طرح ایک گروہ کا' بلکہ ایک زمانہ کے لوگوں کا' خطا میں پڑنا ممکن ہے۔ پس اجماع امت ہر ایک شخص پر' جو اس اجماع کو غلط یا غلط بنیاد پر سمجھتا ہو' واجب العمل نہیں ہے۔[5]

مرزا غلام احمد قادیانی کا الہامی دعویٰ

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں؟ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے' بہتر' ہم کو اس سے کیا فائدہ؟ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے' نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک رہے۔ اگر نہیں ہوتا اور صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے؟ وہ جو ہوں سو ہوں' اپنے لئے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ آدمی نیک

1. خطوط سرسید، ص ۱۰۵ 2. مسافران لندن، ص ۱۶۱ 3. تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۳۰
4. مکتوبات سرسید، ص ۲۱ 5. ابطال غلامی، ص ۱۵۶

بخت اور نمازی پرہیز گار ہیں۔ یہی امر ان کی بزرگداشت کو کافی ہے۔ جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے؟ ان کی تصانیف میں نے دیکھیں، وہ اسی قسم کی ہیں جیسا ان کا الہام یعنی نہ دین کے کام کی، نہ دنیا کے کام کی۔[1]

ہر شخص یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعویٰ کر سکتی ہے، مگر اس کا نتیجہ کیا؟ کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ یا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ نادان ہیں وہ جو اُن سے جھگڑا کرتے ہیں۔[2]

حضرت مرزا صاحب کی نسبت زیادہ کدو کاوش کرنی بے فائدہ ہے۔ ایک بزرگ زاہد نیک بخت آدمی ہیں۔ جو کچھ خیالات ان کو ہو گئے ہوں، ہو گئے ہوں۔ بہت سے نیک آدمی ہیں جن کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو چکے ہیں۔ ہم کو ان سے نہ کچھ فائدہ ہے، نہ کچھ نقصان۔ ان کی عزت اور ان کا ادب کرنا بسبب ان کی بزرگی اور نیکی کے لازم ہے۔ ان کے خیالات کی صداقت و غیر صداقت سے بحث محض بے فائدہ ہے۔ ہمارے مفید صرف ہمارے اعمال ہیں، ان کے اچھے ہونے پر کوشش چاہیے۔[3] ★

بیعت کا اصل مقصد

بیعت کی رسوم ظاہری لغو اور ہیچ کارہ ہیں، صرف ارادت رہبر مقصود ہے۔[4]

بیعت مسنونہ...... دو شخصوں سے یا متعدد اشخاص سے کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔[5]

★ سرسید نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لئے مرزا غلام احمد قادیانی سے بھی چندہ کی درخواست کی تھی۔ اس ضمن میں حکیم نور الدین، جو بعد میں مرزا صاحب کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ اول ہوئے، اور سرسید کے درمیان مراسلت ہوئی۔ حکیم صاحب کے نام سرسید کے خط کا ایک دلچسپ اقتباس ملاحظہ فرمایئے "آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مامور من اللہ انسان دوسرے کی بات مان لینے میں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ تعجب ہے کہ آپ نے مجھ کو مامور من اللہ نہیں سمجھا۔ حضرت! جو شخص جو کچھ کرتا ہے وہ اس کام کے لئے مامور من اللہ ہوتا ہے۔ پس مامور من اللہ کو مامور من اللہ کی عرض قبول کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ حضرت مہدی زماں، مسیح الوقت، امام مامور من اللہ میری درخواست کو ہرگز رد نہ فرمائیں گے۔" (مکتوبات سرسید، جلد دوم، ص ۳۲۶)

[1] خطوط سرسید، ص ۳۳۴ [2] مکتوبات سرسید، ص ۶۸۷ [3] خطوط سرسید، ص ۳۴۲

[4] ایضاً، ص ۳۳۰ [5] ایضاً

بغیر عربی متن کے ترجمہ قرآن کی طباعت

اس طرح پر کہ صرف اردو بغیر متن قرآن کے چھاپا ہو...... میں اس کو نہایت گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔[۱]

حدیث تشبہ

یہ حدیث روایتاً اور درایتاً دونوں طرح پر مردود ہے۔[۲]

سابقہ شریعتوں کے چند احکام

لفظ ''ابن اللہ''

باپ کے معنی ناصح یا صلاح کار کے ہیں اور مشرقی ملکوں میں اسی مراد سے مستعمل تھا اور ایک کام کی بنیاد ڈالنے والے پر بھی بولا جاتا تھا' مثلاً کہتے ہیں کہ شیطان جھوٹ کا باپ ہے۔ اور اسی طرح بیٹے کا استعمال اس چیز پر بھی جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور ان پر بھی جو ایمان لائے' آیا ہے۔ پس ہم مسلمانوں کے نزدیک تمام کتب عہد عتیق و عہد جدید میں ایسے مقاموں میں اسی طرح پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ عربی محاورہ کے بموجب اگر اس کو تعبیر کریں گے تو یوں کہیں گے ''اب'' یعنی باپ بمعنی رب یعنی پروردگار کے' اور ''ابن'' یعنی بیٹا بمعنی ''العبد المقبول'' یعنی بندہ برگزیدہ کے استعمال کیا جاتا ہے' اور یہ استعمال ٹھیک کتب عہد جدید اور عہد عتیق کے مطابق ہوتا ہے۔[۳]

باپ اور بیٹے کا استعمال ان معنوں میں نہیں آیا جن معنوں میں کہ علماء مسیحی ان الفاظ سے صرف حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت مراد لیتے ہیں...... خدا کا تقدس اور خدا کی پاکی جو خود حضرت مسیحؑ نے انجیل میں فرمائی اور تمام نبی فرماتے آئے وہ خود اس بات کی مقتضی ہے کہ "خدا اپنی رحمت اور شفقت سے کسی کا باپ ہو یا اس کی بندگی اور فرماں برداری سے کوئی اس کا پیارا بیٹا ہو۔ مگر دراصل وہ یکہ ہے' نہ کوئی اس کا بیٹا اور نہ وہ کسی کا باپ۔[۴]

ہم مسلمان یقین کرتے ہیں کہ سب (حواریوں) کی تعلیم یہی تھی کہ ایک خدا کی پرستش کرو اور عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یعنی روح اللہ اور کلمۃ اللہ اور رسول اللہ جانو اور اس پر

۱۔ مکتوبات سرسید، ص ۷۰۰ ۲۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۴۲ ۳۔ تبیین الکلام (۳)، ص ۸۰
۴۔ ایضاً، ص ۸۲

ایمان لاؤ عیسائی بھی ابن اللہ کے لفظ سے اس کے لغوی حقیقی معنی مراد نہیں لیتے جو عموماً اس لفظ سے سمجھتے جاتے ہیں، بلکہ حاصل ان کے عقائد کا یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور وہ باپ ہے اور اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔[۱]

جانوروں اور ان کا خون و چربی

حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں تمام چرند و پرند مع خون و چربی کے حلال تھے۔ حضرت نوحؑ کی شریعت میں خون جانوروں کا حرام ہوا۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں خون اور چربی اور سوّر اور بعض اقسام کے اور جانور حرام ہوئے اور پہلے حکم دوسرے حکموں سے منسوخ ہو گئے۔[۲]

شراب

شراب کی حرمت جب تک نہ ہوئی تھی، تمام انبیاء سابقین اور اکثر صحابہ اس کے مرتکب ہوئے۔[۳]

ختنہ

ختنہ ہونا نہ انجیل کے بموجب فرض مذہبی ہے، نہ ہم مسلمانوں کے مذہب میں فرض ہے۔[۴]

رشتہ داروں سے نکاح

ایک زمانہ میں حقیقی بہن سے نکاح منع نہ تھا اور بعض نبی انبیاء سابقین میں سے اس کے مرتکب ہوئے۔ اسی طرح حقیقی دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا منع نہ تھا، متعدد انبیا اس فعل کے مرتکب ہوئے۔[۵]

یعقوبؑ کی شریعت میں بہت سی چیزیں حلال تھیں جو موسیٰؑ کی شریعت میں حرام ہوئیں، مثلاً یعقوبؑ کی شریعت میں دو بہنوں سے ان کی زندگی میں نکاح کرنا درست تھا جیسے کہ

---

۱ تبیین الکلام (۳)، ص ۴-۵ ۲ ایضاً، ص ۱۱۰ ۳ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۱۹
۴ تبیین الکلام (۳)، ص ۷۷ ۵ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۱۹

حضرت یعقوبؑ نے خود لیاہ اور راحیل دختران لابان سے نکاح کیا۔ مگر موسیٰؑ کی شریعت میں دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح حرام ہوا۔ پس بلا شبہ موسیٰؑ کی شریعت میں بہو سسر پر حرام ہے مگر یہ ثابت نہیں کہ یعقوبؑ کی شریعت میں بھی بہو سسر پر حرام تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبؑ کی شریعت میں خاندان کی بیوہ عورت اسی خاندان میں رہتی تھی اور اپنے دیور کا حق ہوتی تھی اور اگر بیوہ کا سسر بیوہ کے دیور کو نہ دیتا تھا تو وہ بیوہ خود سسرے کو پہنچتی تھی۔[1]

حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں سوتیلی بہن سے نکاح درست تھا، حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہوا...... پہلی شریعتوں میں پھوپھی سے نکاح درست تھا، حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں منسوخ ہوا۔[2]

غلامی

موسیٰ صلوٰۃ اللہ علیہ نے اس کو جائز ہی رکھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی نسبت ایک حرف بھی نہیں کہا۔[3]

---

۱ تبیین الکلام (۳)، ص ۳۰ ۲ ایضاً، ص ۱۱۱ ۳ مقالات سرسید (۴)، ص ۳۶۲

تہذیبی وتمدنی خیالات

عادات واطوار

امورِ معاشرت اور مذہب

دنیا میں دو قسم کے امور ہیں' ایک روحانی دوسرے جسمانی یا یوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔[1]

انسانوں کی بدبختی کی جڑ دنیاوی مسائل کو دینی مسائل میں' جو نا قابل تغیر وتبدیل ہیں' شامل کر لینا ہے۔[2]

لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان امور معاشرت کو جو عمدہ ہوں بطور مذہبی مسائل کے مذہب میں شامل کر لینا ان کے دوامی استحکام اور دوامی عمل درآمد کا باعث ہوتا ہے۔[3]

دنیاوی امور کا قرآن مجید میں ذکر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ دنیاوی معاملات بھی مذہب میں داخل ہیں۔[4]

رسوم وعادات کے بیان میں مذہبی بحث

ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کئے ایک قدم بھی تہذیب وشائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے۔ جس بات کو کہو کہ چھوڑ' فوراً جواب ملے گا کہ مذہباً ثواب ہے۔ اور جس بات کو کہو کہ سیکھو' اسی وقت کوئی بولے گا کہ مذہباً منع ہے۔[5]

ان کا کوئی قول' کوئی فعل' کوئی یقین' روحانی ہو یا جسمانی' دینی ہو یا دنیاوی' مذہب سے

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۴۸ [2] مقالات سرسید (۵)، ص ۵ [3] ایضاً، ص ۶ [4] ایضاً، ص ۹
[5] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۹۲

خالی نہیں۔ ان کے ہاں دنیاوی معاشرت اور مذہبی معاملات میں کچھ تفریق و جدائی نہیں ہے۔
کوئی امر حسن معاشرت یا تہذیب کا فرض کرلو جو محض دنیاوی ہو اس پر ضرور بالضرور احکام شرع
مذہبی میں سے کوئی نہ کوئی حکم جاری ہوگا یعنی فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح، حلال، حرام
مکروہ، کفر، بدعت۔ پس مسلمانوں کی خراب حالت معاشرت کی ترقی بغیر اس کے کہ مذہبی بحث
درمیان میں آئے، کیونکر ہو سکتی ہے! جس قوم کی حالت ایسی ہو کہ وہ سچ کو بھی، اگر ان کے مسلّم
عقیدہ کے خلاف ہو، سچ کہنا کفر سمجھتے ہوں تو اس کی خراب حالت معاشرت کے درست کرنے
کس طرح مذہبی بحث سے بچا جائے؟[1]

پس ہم مجبور ہیں کہ تہذیب و شائستگی اور حسن معاشرت سکھانے میں ہم کو مذہبی بحث کرنی
پڑتی ہے۔[2]

مذہبی بحث کا ایک عجیب سلسلہ ہے کہ ایک چھوٹی سی بات پر بحث کرنے سے بڑے
بڑے مسائل اور اصول مذہب بحث میں آ جاتے ہیں اور اس لئے لاچار کبھی ہم کو فقہ سے بحث
کرنی پڑتی ہے اور کبھی اصول فقہ سے، اور کبھی حدیث سے بحث کرنی ہوتی ہے اور کبھی اصول
حدیث سے، اور کبھی تفسیر سے بحث کرنی پڑتی ہے اور کبھی اصول تفسیر سے۔[3]

ڈاڑھی منڈانا

ڈاڑھی...... بشرطیکہ وحشیانہ پن سے نہ رکھی جائے، تہذیب کے برخلاف نہیں ہے چنانچہ
ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں اشخاص، جو نہایت مہذب قوم کے ہیں، ڈاڑھی رکھتے ہیں اور ہمارے
ملک کے بھی خوبصورت گورے رنگ کے چہروں پر، بشرطیکہ گورا رنگ ہو، کالی ڈاڑھی نہایت
خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی ہے (ہاں، جب سفید ہو جائے تو منڈانے کے قابل ہو جاتی ہے
بشرطیکہ منہ کی جھریاں اور گالوں کے گڑھے اور منہ کا پوپلا پن صورت کو بدنما نہ کر دے)۔ اس
کے سوا منہ کی رونق اور شجاعت و بہادری و رعب اس سے پایا جاتا ہے۔ پس اس کا رکھنا یا منڈانا
ہماری بحث سے خارج ہے اور ہم اس پر بحث نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہم قطعاً ان مسائل سے جو

۱۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۳۰ جون ۱۸۷۶ء)، ص ۴۰۵ ۲۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۹۲
۳۔ ایضاً، ص ۴۹۳

کو مانع تہذیب نہیں سمجھتے، بحث نہیں کرتے۔ اگر ڈاڑھی منڈانی ناجائز ہو تو اس سے ہمارا کچھ حرج نہیں، اگر جائز ہو تو ہمارا کچھ حرج نہیں لیکن اگر ڈاڑھی کو ایک ٹٹی بنایا جائے جس کی اوجھل شکار کھیلا جائے تو اس سے منڈانا ہی بہتر ہے۔[1]

ڈاڑھی کا اطلاق جیسا کل ڈاڑھی پر ہے ویسا ہی جزو ڈاڑھی پر ہے۔ اگر ڈاڑھی کا منڈانا ناجائز ہے تو اس کے جزو کا بھی ناجائز ہے۔ اگر کوئی شخص ایک طرف کی ڈاڑھی منڈائے اور ایک طرف کی رہنے دے یا بیچ میں سے منڈائے اور دونوں طرف گل مچھے رہنے دے، وہ بھی ایسی ہی ناجائز ہوگی جیسے کہ کل ڈاڑھی کا منڈانا۔ آپ حضرات مقدسین کو دیکھتے ہوں گے کہ ہر جمعہ کی صبح کو اشراق کی نماز کے بعد نائی حاضر ہوتا ہے اور اصلاح مبارک بناتا ہے۔ اصلاح میں کیا ہوتا ہے کہ گالوں پر سے ڈاڑھی مونڈی جاتی ہے اور ایک قوسی خط میں قریب مدور کے کی جاتی ہے۔ ہونٹ اور ٹھوڑی کے بیچ میں ایک بچکانی بنائی جاتی ہے اور دونوں طرف سے مونڈی جاتی ہے۔ پھر حلقوم مبارک سے لے کر ٹھوڑی اور جبڑے کے قریب تک مونڈی جاتی ہے۔ بعض مقدسوں کو اپنے پھولے پھالے مجرب گالوں کے کھولنے کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ ریش مبارک صرف بطور ایک جھالر کے رہ جاتی ہے۔ پس کیا یہ ڈاڑھی منڈانا نہیں ہے؟[2]

پردۂ نسواں

ہمارے بعض عزیز، جن کو ہم لحمک لحمی کہہ سکتے ہیں اور بعض ہمارے مخدوم، جن کو ہم فخر قوم کہہ سکتے ہیں، پردہ کے مخالف ہیں مگر ہم کو گو لوگ نئے فیشن کا سمجھیں مگر ہم تو اسی پرانے دقیانوسی، اگر فیشن کے نہیں تو، دقیانوسی مزاج کے تو ضرور ہیں اور اس لئے ہم اپنے مخدوموں کی رائے کے مخالف ہیں اور عورتوں کا پردہ، جو مسلمانوں میں رائج ہے، اس کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں۔ اس بات پر بحث کرنی کہ قرآن مجید سے پردہ مروجہ عورات اہل اسلام ثابت ہوتا ہے یا نہیں، محض فضول ہے کیونکہ اگر مسلمان مرد اپنے افعال و عادات میں پابند شریعت اور تابع احکام قرآنی ہوتے تو اس وقت عورتوں کے پردہ کی بابت اس بات کی گفتگو کرنی کہ قرآن مجید سے مروجہ پردہ ثابت ہے یا نہیں، زیبا ہوتی۔ مگر جب ہمارے مردوں کی نسبت قرآن مجید کے کسی امر کے

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۹۴ [2] ایضاً، ص ۳۹۵

اتباع کی نسبت بحث نہیں کی جاتی تو عورتوں کے پردہ کی نسبت یہ بحث کرنی کہ قرآن مجید سے ثابت ہے یا نہیں، کیسی نازیبا معلوم ہوتی ہے۔[۱]

میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرف دار ہوں' اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے' نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہونچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ منہ کو پردے میں داخل کیا ہے۔[۲] ★

طریقہ تناول طعام

ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی یہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں' مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابوں اور رکابیوں اور غوریوں اور طشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار مربہ کی چیالیاں سیتلا کے پوجاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اس دسترخوان کو کوئی تو فیرنی کلمہ شہادت کی انگلی سے اور کوئی دست بخیر چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے' کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا

★ سرسید کے یہ خیالات ایک مکتوب کی صورت میں سراج الدین احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ کے نام عبدالحلیم شرر کے اس تبصرہ کے جواب میں ہیں جو انہوں نے اپنے رسالہ "مہذب" لکھنؤ کے شمارہ اوّل مورخہ یکم اگست ۱۸۹۰ء میں اس موضوع پر سرسید کے خیالات کی نسبت کیا۔ انہوں نے لکھا تھا "افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاقی ریفارمر سرسید احمد خان بہادر کی تحقیق کے مطابق پردہ شاید ستر عورت کا نام ہے کیونکہ ان کے اس آخر زمانے کے اجتہاد میں منہ اور ہاتھ پردے میں نہیں شامل ہیں' مگر میں کیا کروں کہ عام مسلمانوں کی طرح میرا خیال بھی اس کی تقلید سے انکار کرتا ہے"۔ عبدالحلیم شرر نے سرسید کا مذکورہ بالا جواب سرمور گزٹ سے نقل کر کے شائع کیا تھا۔

پردہ کے بارے میں سرسید کا اپنی رائے پر عمل کا جو عالم تھا اس کے متعلق نواب محسن الملک بیان کرتے ہیں: "میں نے تو ان کا یہ حال دیکھا کہ مدت العمر کبھی وہ اس بات کے بھی روادار نہیں ہوئے کہ ان کی بہو محمود بیگم کسی بڑے سے بڑے جلیل القدر انگریز کی میم صاحبہ سے بھی مل سکیں' خواہ ان کے دوستوں کی خاتونیں ہوں یا سید محمود کی۔" (مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک' ص ۵۱۳)

[۱] آخری مضامین' ص ۱ [۲] مہذب لکھنؤ (یکم ستمبر ۱۸۹۰ء)' ص ۲

کر کھا رہا ہے' کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجہ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے' کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ لگا سڑپا اور یہ کہہ کر ''واللہ' بڑی تیز ہے'' اوہ اوہ کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چھوڑی ہوئی ہنڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں سے نکالی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصے میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا' کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر زبان صاف کرنا شروع کیا ہے اور اور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ ان ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کریہہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی کے ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھود کر کے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاشے کی طرح اس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پرواہ ہے' نعوذ باللہ منہا۔ جو غچلی پن ہندوستان کے مسلمانوں میں کھانے کی مجلس میں ہوتا ہے کسی ملک کے کھانے کی مجلس میں نہیں ہوتا۔ پس نہایت شرم اور افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنی ضد و نفسانیت سے اس غچلے پن میں پڑے رہیں اور اس کی درستی و تہذیب پر متوجہ نہ ہوں۔[1]

اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارا طریق اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں' جب وہ ہم کو کھاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو ان کو قے آتی ہے۔[2]

بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں' منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عفیف

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲) ص ۸۱ [2] ایضاً ص ۵۴

آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔[۱]

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کرکے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے ''واہ، یوں نہیں یوں ہے''۔ وہ کہتا ہے ''واہ، تم کیا جانو''۔ وہ بولتا ہے ''تم کیا جانو''۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں، لپاڈکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کرکے چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر، اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔[۲]

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آ جاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔ انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس میں پھیکی ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔[۳]

۱۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۱۰ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً، ص ۱۱۱

فضول رسمیں

......رسموں میں جو لوگ بے جا یا بجا روپیہ خرچ کرتے ہیں اس سے قوم کی بھلائی کے کاموں میں مضرت پہنچتی ہے۔ سب سے زیادہ مضرت رساں وہ رسمیں ہیں جو شادیوں میں خلاف حکم خدا' خلاف حکم رسولؐ، خلاف سنت صحابہؓ، خلاف طریقہ ائمہ طاہرین کرتے ہیں اور ہزاروں روپیہ اپنا' اور اگر اپنے پاس نہیں ہے تو قرض لے کر' خرچ کرتے ہیں۔ جو لوگ غریب ہیں وہ تو تباہ ہو جاتے ہیں اور جو متمول ہیں ان کا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے...... مسلمانوں میں قدیم رسم چلی آتی ہے کہ ایسی رسموں میں تمام رشتہ داروں کو جمع کرتے ہیں' دور دور سے ان کو بلاتے ہیں' ان کی مہمان داری میں' ان کی تواضع و مدارات میں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ رشتہ دار بھی رسم کے پابند تکلیف گوارا کر کے خرچ برداشت کر کے آتے ہیں اور ہر ایک کا اس رسم کی پابندی میں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ میں نے اس قدیم رسم کو بالکل ترک کر دیا ہے۔[1]

ایک اور رسم ہے۔ اگرچہ ہماری دلی میں اور دلی کے لوگوں میں وہ رسم نہیں ہے مگر اور شہروں اور قصبات میں رائج ہے یعنی رسم نیوتہ کی۔ اس کو بالکل بند کرنا چاہیے۔ اگرچہ لوگ اس میں بہت فائدے بیان کرتے ہیں مگر آپ خیال کیجیے کہ جس کو آپ نیوتہ کہتے ہیں اس کو اس کے سبب سے ضرور بہت سے اخراجات کا متکفل ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ پس اس رسم سے دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔[2]

اسی طرح رسومات غمی کا حال ہے کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے نامہذب و ناشائستہ رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ خدا رحمت کرے مولوی اسمٰعیل پر جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشائستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں۔[3]

شعائر مسلمین اور رسم بسم اللہ

شعائر اسلام کا' جن کو شعائر اللہ بھی کہتے ہیں، اور شعائر مسلمین دونوں کا ایک ہی مخرج ہے مگر ان دونوں کی قسمیں جداگانہ ہیں۔ شعائر اسلام وہ ہیں جن کے کرنے کو رسول خدا صلعم

---

[1] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۵۲۰-۵۲۱ [2] ایضاً، ص ۵۲۱ [3] تہذیب الاخلاق (۴) ص [illegible]

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور خدا نے ان کو شعائر اسلام گردانا اور ان کے کرنے کا حکم دیا، اور یہ وہی شعائر اسلام ہیں جس میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے نہ کمی، جوں کے توں ان کا بجالانا ضرور ہے۔ شعائر مسلمین وہ ہیں جو ان ہی شعائر اسلام سے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دلی خواہش سے جو آں حضرتؐ کے قول و فعل سے استنباط ہوتی تھی، ماخوذ ہیں اور گروہ در گروہ مسلمان مدت دراز سے ان کو کرتے آئے ہیں، گو کہ ان کے کرنے کا قولاً کوئی حکم نہ تھا...... ان شعائر مسلمین کی نسبت یہ کہنا کہ ان کا خدا نے حکم نہیں دیا، ان کو رسولؐ نے نہیں کیا، ان کو صحابہ و تابعین نے نہیں کیا اس لئے یہ سب بدعت ضالہ ہیں، محض غلط اور نادانی ہے۔[1]

شعائر مسلمین میں میں اس رسم کو بھی سمجھتا ہوں جس کا نام بسم اللہ رکھا گیا ہے۔ یہ یادگار ہے اس نعمت عظمیٰ کی جس وقت کہ میرے نزدیک خود خدا نے اپنے بے آواز کلام ازلی و ابدی سے، یا اکثروں کے نزدیک جبریل علیہ السلام کی وساطت سے، اپنے پیغمبر اور ہادی امت کو حکم دیا کہ ''اقرأ باسم ربک الذی خلق''۔ کیا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مسلمان کا بچہ اس قدر حد کو پہنچ جائے جو دوسرے کی بات کو بخوبی دہرا سکے تو وہی بات اس سے کہلوائی جائے جو تمام احکام اور ہدایتوں کے دئے جانے سے پہلے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی گئی تھی! پس یہ رسم فرض نہیں ہے، واجب نہیں ہے، سنت نہیں ہے، کیونکہ مجھ کو ثابت نہیں ہے کہ آں حضرت صلعم نے اپنی اولاد کے ساتھ، یعنی حضرت فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام کے ساتھ، ایسا کیا ہو مگر کیا اچھا شعائر مسلمین میں سے ہے کہ جب بچہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ کلام کو دہرا سکے تو اس وقت کی یادگاری میں جب کہ خدا نے اپنے پیغمبرؐ سے کہا کہ **اقرأ باسم ربک الذی خلق** تو اس سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور دوستوں اور مسلمانوں کے سامنے اس کی خوشی منائی جاتی ہے۔[2]

خطوں پر بسم اللہ لکھنے کا رواج

جس طرح ہماری قوم میں اور بہت سی فضول و نامناسب باتیں مروج ہیں اسی طرح خط و کتابت کے طریقہ میں بھی بہت سی فضولی ولغویات شامل ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں جو ہماری

---

[1] مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۵۱۹ ۔ [2] ایضاً، ص ۵۲۰

سمجھ میں مذہب اسلام کی عمدہ اور پراثر باتوں کو بے اثر اور کھیل بنا دیتی ہیں۔[1]

ہماری قوم کے مقدس لوگوں نے ان دنیاوی تحریرات میں ایک اور مذہبی طرہ لگایا ہے۔ کوئی خط ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے خالی نہیں ہوتا۔ بہت سے بزرگ اپنے خطوط کے عنوان پر مبسلاً' محمداً' حامداً' مصلیاً' مسلماً' لکھتے ہیں۔ لفافوں پر انشاء اللہ تعالیٰ' بعونہ تعالیٰ' بمنہ وکمال کرمہ تحریر فرماتے ہیں، اور جن بزرگوں کا مذاق عمل اعمال کی طرف مائل ہے وہ لفافہ پر ''حوالہ تطمیر'' بھی لکھ دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان الفاظ کی تحریر سے ہمارا خط ضرور مکتوب الیہ تک پہنچے گا مگر اکثر دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی کچھ بھی تاثیر نہیں ہوتی' ڈاک کے جن اکثر خط اڑا ہی لے جاتے ہیں۔ جو اس سے بھی ادنیٰ خیال کے لوگ ہیں وہ لفافوں پر ''چو ہتر بر دیگراں'' لکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا شخص ان کے خط کو کھول کر نہ پڑھ لے۔ ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنالیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دین داری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقا اور ٹھیٹ سنت پر چلنے کا کام ہے حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔[2]

ہم نے بڑے بڑے شخصوں کو دیکھا ہے کہ شطرنج کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور خط پر ''حامداً'' لکھ رہے ہیں۔ 'ح الف' لکھا تھا کہ بولے ''وہ پیادہ مرا' وہ پیادہ مرا''۔ پھر 'میم دال' لکھی اور کہا ''وہ کشت''۔ اتنے میں الف لکھا اور بولے ''وہ مات''۔ غور کرو کہ اس طرح پر مذہبی مقدس الفاظ کا برتاؤ کیا کچھ دل میں نیکی پیدا کر سکتا ہے؟ ہم نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ خدمتگار پر خفا ہو رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں اور قلم سے خط کے سرے پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حامداً و مصلیاً'' لکھ رہے ہیں۔ ایک گالی پر بسم اللہ اور دوسری پر حامداً اور تیسری پر مصلیاً لکھا جا رہا ہے۔ ہم نے ایسے خط بھی ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حامداً و مصلیاً'' لکھے دیکھے ہیں جن میں تمام دنیاوی مزخرفات بھرے ہوئے ہیں' ان کاموں کے کرنے کے حکم اور صلاحیں مندرج ہیں جو ایماناً، اخلاقاً، شرعاً ممنوع و حرام ہیں۔ بعضے خطوں کا یہ فقرہ بھی یاد ہے کہ کہ ''از دیگر حالات ہم مطلع فرمایند''۔ لفظ دیگر کی تشریح ہم نہ کریں گے' صرف مولوی کا یہ شعر پڑھ دیں گے ؏

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲) ص ۱۵۰ [2] ایضاً ص ۱۵۱

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں[1]

اگر دل کی آنکھیں اندھی ہیں تو خط پر بسم اللہ کا قشقہ دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔...
اگر کوئی شخص اپنے خطوط پر بسم اللہ لکھنی سنت سمجھتا ہو تو نہایت بے ادب و گستاخ ہے اور کچھ بھی قدر و منزلت سنت کی نہیں جانتا۔ اسی بات کو تو ہم روتے ہیں کہ مسلمان مذہب کو مذہب کی طرح نہیں برتتے بلکہ اس کا کھیل بناتے ہیں۔[2]

ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم کو شائستہ ہونا چاہیے۔ دنیا کے کاموں کو دنیا کی طرح اور دین کے کاموں کو دین کی طرح برتنا چاہیے۔ دونوں کو خلط ملط کر کے بگاڑنا اور مذہبی باتوں کو دنیاوی باتوں میں گڈمڈ کر کے غیر مذہب والوں کو ہنسوانا نہیں چاہیے۔ دنیاوی باتوں کے خطوط پر بسم اللہ نہ لکھنی درحقیقت اللہ کے نام کا ادب کرنا ہے۔ لفافہ پر انشاء اللہ کی چڑیا نہ بنانی دراصل خدا پر بھروسا کرنا ہے۔[3] ★

تعصّبات

تشابہ اور لباس

تشابہ ایک قوم کا دوسری قوم سے بلاشبہ زیادہ تر لباس پر منحصر ہوتا ہے مگر خود رسول خدا صلعم نے یورپ کی قوم کا اور خاص رومن کیتھولک میں جو مروج تھا، وہ لباس پہنا ہے...... بخاری کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا صلعم نے یہودیوں کی پوشاک بھی پہنی ہے...... مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا صلعم نے خاص آتش پرستوں کا بھی لباس پہنا ہے...

★ اسی قسم کے موضوع کی مناسبت سے ایک واقعہ حالی نے لکھا ہے کہ ''ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین کے موقع پر بجائے تالی کے سبحان اللہ' مرحبا یا جزاک اللہ کہا جایا کرے..... سرسید نے اس سے سخت ناراضی ظاہر کی اور کہا کہ ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسے دُنیوی غرض کے لئے ہوتے ہیں' ان الفاظ کو داخل کرنا' جو شعائر اللہ میں داخل ہیں، ان کی ہتک حرمت کرنا ہے۔'' (حیاتِ جاوید' (۲)' ص ۵۴۰)

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۵۲ [2] ایضاً، ص ۱۵۴ [3] ایضاً، ص ۱۵۵

کیا عقل سلیم اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ اگر جناب رسول خدا صلعم لندن میں یا جرمن وایشیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کا لباس ویسا ہی نہ ہوتا جیسا کہ ان ملکوں کے لوگوں کا ہے؟..... کیا دنیٰ مشابہت سے مثلاً دھوتی باندھ لینے سے یا بگھی و چرٹ پر چڑھنے سے یا بالکل پوری ظاہری مشابہت کر لینے سے، باوجود اقرار توحید ورسالت کے، آدمی کافر ہو جاتا ہے؟[1]

کیا اسلام ایسا ہے کہ ایک چیتھڑا چیر کر آگے لٹکا لینے سے تو باقی رہے اور اگر اس میں بٹن لگا دئے جائیں تو جاتا رہے؟ میں کہوں گا کہ ایسا یقین اسلام کی سچائی کے بالکل برخلاف ہے۔ اسلام ایک نور ہے جو دل میں ہوتا ہے اور جس سے اس نور رکھنے والے کے عقیدے مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ مولی کھانے سے اسلام مضبوط ہو اور انڈا کھانے سے وہ کمزور ہو جائے۔ اس کو لباس اور ان معمولی دنیوی طریقوں سے کچھ غرض نہیں۔ وہ خدا کے ساتھ پکا عقیدہ رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ میں سوال کرتا ہوں کہ.....رسول خداؐ، اصحاب کرامؓ، اہل بیت علیہم السلام کا کیا یہی لباس تھا جو اس وقت ہم پہنے بیٹھے ہیں؟ یہ تو کوئی بھی نہیں کہے گا کہ ہاں، یہی تھا۔ اور جب یہ نہ تھا اور ہم نے اس میں کئی طرح کی تبدیلیاں کی ہیں، آتش پرستوں، مجوسیوں، ہندوؤں کے لباس سے مل ملا کر ہمارے لباس میں ایک ترکیب دی گئی ہے تو پھر کیا ایسی تبدیلی کرنے والوں کا اسلام باقی نہیں رہا؟ یہ ایک غلط خیال ہے جو مسلمان لباس کی نسبت کرتے ہیں۔ اسلام نے ہم کو کچھ نہیں بتایا کہ ہمارے لباس کی کیا قطع ہونی چاہیے۔ کیا تم ان حدیثوں کو بھول گئے ہو جن میں ذکر ہے کہ عیسائیوں اور مجوسیوں نے اس قسم کے چغے جو اُن کے ہاں کے قسیس و رہبان پہنتے تھے اور جن کو حدیثوں میں جبہ رومیہ، ضیق الکمین یا واسع الکمین سے تعبیر کیا ہے، آں حضرت صلعم پاس تحفہ میں بھیجے اور آپ نے ان کو پہنا؟ پس لباس کے لحاظ سے طعن کرنا نعوذ باللہ اس فعل پر نا سمجھی سے طعن کرنا ہے جو آں حضرت صلعم نے کیا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ لباس کو اسلام میں کچھ دخل ہے تو یہ ایک سخت بدعت سیئہ ہے جو اعتقاد اور عمل دونوں معنوں میں صادق آتی ہے اور اس بدعت کا دور کرنا ہر ایک مسلمان پر لازم ہے اور اس لئے سب سے اول مقدس مولویوں ہی کو تبدیل لباس لازم ہے۔[2]

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲) ص ۲۴۱-۲۴۲

[2] سفرنامہ پنجاب ص ۱۷۶-۱۷۷

ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہننے کا فلسفہ

عرب میں رواج تھا کہ متمول اور سردار بنظر افتخار و تکبر و غرور کے ازار کو ٹخنے سے نیچے زمین پر گھسٹتی ہوئی پہنا کرتے تھے اور یہ امر گویا نشان ان کے تکبر و غرور کا تھا۔ آں حضرت صلعم نے ٹخنے سے نیچی ازار پہننے کو منع فرمایا جس کا مقصود تکبر و غرور کو منع کرنا تھا۔ ہمارے ہاں کے علما نے ٹھیک یہودیوں کی طرح بکری کے بچے کی مانند لفظی پیروی کر کے ٹخنے سے نیچی ازار پہننے والے کو، گو وہ کیسا ہی مسکین و بے غرور و منکسر ہو اور گو وہ امر نشان غرور و تکبر باقی ہی نہ رہا ہو، جہنم میں ڈال دیا اور لوگوں کو تعجب میں ڈالا کہ یہ کیسا مذہب ہے کہ دو انگل اونچی ازار پہننے سے بہشت ملتی ہے اور دو انگل نیچی پہننے سے دوزخ میں ڈالا جاتا ہے۔[1]

مسلمانوں کا نیشنل لباس

ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کو نیشنیلٹی (Nationality)* قائم کرنے کی ہے جس کو ان کے بزرگوں نے ہندوستان میں آ کر ڈبو دیا ہے۔ ان کو ایک نیشنل لباس اختیار یا ایجاد کرنا لازم ہے جو نیشنیلٹی کا ظاہر کرنے والا ہو...... بلاشبہ ترکوں سے اور ترکوں کی سلطنت سے (گو افسوس ہے کہ نہیں معلوم اس کی عمر کتنی باقی ہے) ہم مسلمانوں کو فخر ہے، تمام ہمارے مقدس معبد مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس سب ان کے زیر حکومت ہیں (گویہ بات خدا کو معلوم ہے کہ کب تک رہیں گے)۔ اس قوم نے نہایت عمدہ اور ہر موقع کے مناسب لباس اختیار کیا ہے جو بہت حالتوں میں موجودہ زمانہ کے مناسب اور قریب قریب اس لباس سے ہے جو ہم پر حکومت کرنے والی قوم کا لباس ہے۔ صرف ٹوپی کا فرق ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو اپنا نیشنل لباس قرار نہ دیں؟ ہم کو معلوم ہے کہ بعض انگریز اس لباس سے چڑتے ہیں، بلکہ ہم ایسے متعصب انگریزوں سے واقف ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم جس ہندوستانی کی ٹانگوں میں پتلون اور بدن میں ٹرکش یا انگلش سوٹ اور سر پر لال ٹرکش ٹوپی دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ یہ مغرور و متعصب انگریز ہندوستانیوں کو غلامی کی حالت میں رکھنا پسند

---

* قومیت

[1] مقالات سرسید (۵)، ص ۴

کرتے ہیں اور ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ ہندوستانی ان سے دوستانہ طریقہ سے ملیں، مگر ہم ہندوستانیوں کو ان متعصب اور مغرور انگریزوں پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ خود ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم کو اپنی قوم کی بہتری کے لئے کیا کرنا لازم ہے۔[1]

غیر مذاہب کے پیشواؤں کی بے ادبی

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جب ہم مذہبی مباحثوں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں تو اس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بری طرح پر ذکر کرتا ہے۔ یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ جس مذہب کے جو پیشوا ہیں جب ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں ان کا ذکر کریں تو ہم کو لازم ہے کہ ان کو برا نہ کہیں بلکہ ادب و تعظیم سے ان کا ذکر کریں خواہ وہ لوگ ہندو ہوں یا پارسی، عیسائی ہوں یا یہودی یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں۔ اگر ہم ان کے بزرگوں و پیشواؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں گے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اسی طرح ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں؟ اس لئے خدا تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ...... ''مت برا کہو ان کو جو خدا کے سوا اور کسی کی عبادت کرتے ہیں، پھر وہ نادانستگی سے خدا کو برا کہیں گے''۔ پس حقیقت میں غیر مذہب والوں کے پیشواؤں کو برا کہنا خود اپنے مذہب کے پیشواؤں کو برا کہنا ہے۔[2]

کفار کی عمومی دوستی سے پرہیز

اس زمانے میں مذہبی آدمی وہ سمجھے جاتے ہیں جن کے دل بد تعصب سے پتھر سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ سوائے اپنے اہل مشرب کے سب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تمام دنیا کو، بلکہ اپنے اہل مذہب میں سے بھی ان کو جو اُن کے مشرب کے برخلاف ہیں، حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ غیر مذہب کے لوگوں سے دوستی و محبت اور ان کے ساتھ ہمدردی کو کفر و الحاد جانتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ سوائے اپنے اور کسی کو دیکھ نہیں سکتے۔[3]

کیا ہم دیوالی دسہرہ میں اپنے ہندو دوستوں سے اور نوروز میں اپنے پارسی دوستوں سے

---

[1] بحوالہ تذکرہ سرسید، ص ۳۳۵-۳۳۶ [2] آخری مضامین، ص ۴۰ [3] مقالات سرسید (۵)، ص ۱۵۷

اور بڑے دن میں اپنے عیسائی دوستوں سے مل کر اور معاشرت وتمدن کی خوشی حاصل کر کے کافر ہو جائیں گے؟ نعوذ باللہ منہا۔ اگر درحقیقت ہمارا مذہب اسلام ایسا ہی بودا ہے تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی' ایک نہ ایک دن اس کو ذبح ہونا ہے۔[۱]

کفار سے محبت اور دوستی من حیث الدین ممنوع ہے' اس کے سوا کسی قسم کی دوستی اور معاشرت ومحبت ووفاداری اور امداد اور کسی طرح کی راہ ورسم مذہب اسلام کی رو سے ممنوع نہیں ہے۔[۲]

طعام اہل کتاب سے اجتناب

جہال میں یہ مشہور ہے کہ جہاں کسی نے کھانا انگریز کے برتن میں کھالیا وہ کافر ہو گیا اور کم قوموں اور کم ذاتوں میں تو یہ جہالت کی رسم ہے کہ جب تک وہ بے چارہ کچھ صرف نہ کرے اور پنچایت نہ دے اور پھر کر قاضی اس کو مسلمان نہ کرے تب تک وہ ذات میں نہیں ملایا جاتا۔ اور پھر جاہلوں کے خوف سے کوئی عالم یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا تمہاری جہالت ہے! شراب پینے سے بھی آدمی کافر نہیں ہوتا' نہ کہ حلال ومباح کھانے سے۔ یہ بلا اسی سبب سے ہے اور اسی سبب سے عوام میں اس کا رواج بھی ہو رہا ہے کہ علما ان کے ڈر سے اور اپنی نذر ونیاز کے خوف سے اور اپنے تئیں جھوٹ موٹ کا صاحب تقویٰ وورع جتانے کے لئے اور جولاہوں میں بیٹھ کر تعریف سننے کے لالچ سے کلمہ حق زبان پر نہیں لاتے' صاف اور صریح حدیثوں کو اور حکموں اور مسئلوں کو چھپاتے ہیں اور عوام کی تالیف قلوب کے واسطے اس مسئلہ کو کبھی بنظر تشبیہ کے حرام بتلاتے ہیں' کبھی اس کو باعث محبت اور دوستی کا بتلا کر منع ٹھہراتے ہیں مگر افسوس یہ کہ ہنود اور مشرکین کے حق میں اس قسم کا کوئی مسئلہ جاری نہیں کرتے۔ ان کے دینی بھائی بن جاتے ہیں اور ان کے میلوں میں شریک ہو جاتے اور ان کے ساتھ راہ ورسم دوستانہ رکھتے ہیں۔ ان کے گھر کے کھانا کھانے میں تو کبھی کوئی مسلم کافر کیا گنہ گار بھی نہ ہوا اور اہل کتاب کے کھانا کھانے سے کافر اور مرتد ہو جائے' اس کا کیا سبب ہے؟ یہی سبب ہے کہ جو طریقہ جاری ہو گیا ہے وہ سنت ہے اور جو جاری نہ ہوا ہو وہ بدعت ہے۔ سبحان اللہ' دین کو بھی دل لگی ٹھہرا رکھا ہے۔[۳]

---

۱ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۲۴۲ ۲ تفسیر القرآن (۲)، ص ۱۵ ۳ احکام طعام، ص ۵۱

جاننا چاہیے کہ طعام اہل کتاب، بشرطیکہ محرمات شرعیہ میں سے نہ ہو، مسلمانوں کے لئے حلال اور درست اور اس کا کھانا جائز و مباح ہے، خواہ ہم ان کا بھیجا ہوا اور ان ہی کا پکایا ہوا اپنے گھر کھائیں خواہ ان کے ہاں جا کر کھائیں، خواہ ہم اکیلے کھائیں خواہ ہم اور اہل کتاب ایک جگہ ساتھ بیٹھ کر کھائیں اور وہ کھانا قسم لحوم طیبہ سے ہو یا از قسم حبوب و شیرینی وغیرہ۔[1]

اور حلال چیز کو اگر مسلمان اور اہل کتاب یا کوئی کافر ایک رکابی میں کھائیں یا ایک کا جھوٹا دوسرا کھائے، بشرطیکہ کھانے کے وقت ان کا ہاتھ یا منہ شراب یا اور کوئی حرام چیز میں آلودہ نہ ہو، تو بھی اس چیز کا کھانا حلال و جائز ہے کیونکہ ہم مسلمانوں کے مذہب میں یہ مسئلہ مسلم الثبوت ہے کہ ''سور الانسان طاہر'' جھوٹا آدمی کا پاک ہے۔[2]

کانٹے چمچے کے استعمال سے گریز

یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا مسنون ہے اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ ہم اس رائے کی صحت و سقم کی بحث سے قطع نظر کر کے اس کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی آدھی پیروی کرنا باعث ذلت ہے۔ اگر مسلمان یہ بھی گوارا کریں کہ مرغن کھانے، جس سے ہاتھ اور منہ بھر جاتا ہے اور یہی امر باعث نفرت اور گھن آنے کا ہوتا ہے، چھوڑ دیں اور جو کے بن چھنے آٹے کی سوکھی روٹی ٹکڑی یا کھجور سے کھالیا کریں تو ان بزرگوں کی پوری پوری پیروی ہوگی اور اس وقت میں کوئی بھی ہاتھ سے کھانے پر نفرت نہ کرے گا، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کھانے تو ہوں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو مسنونی۔[3]

جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں اور ہر دفعہ رکابیاں اور چھری کانٹے بدلتے جاتے ہیں، جب وہ ہم مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کو نفرت اور کراہت آتی ہے۔[4]

انصاف سے ہم کو اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیے کہ چھری اور چمچے سے کھانا اور ہر قسم کے کھانے کے لیے جدا برتنوں کا ہونا بہ نسبت ہاتھ سے کھانا کھانے کے زیادہ عمدگی و نفاست رکھتا ہے۔[5]

---

[1] احکام طعام، ص ۳ [2] ایضاً، ص ۶ [3] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۷۷ [4] ایضاً، ص ۷۶

بزرگوں کا ادب یا بندر موافق تربیت؟

مسلمانوں میں اگر کسی شخص کی اولاد عوام الناس کے لونڈوں میں کھیل کود سے بچے اور اپنے ہی ہم جولیوں میں رہے اور اپنے یا اپنے ہم سر خاندان کی صحبت اُٹھائے اور دوزانو بیٹھنا اور جھک کر سلام کرنا یا عین کو ٹھیک اس کے مخرج سے نکال کر سلام وعلیک کرنا اور ہاتھ جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جائے تو نہایت سعادت مند اور تربیت یافتہ گنا جاتا ہے۔ اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہو اور کسی میاں جی یا مُلّا سے پڑھتا بھی ہو تو وہ تربیت کے کنگورہ پر پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر بخت واتفاق سے اس نے دو چار کتابیں زیادہ پڑھ لیں اور صدرہ و شمس بازغہ پڑھنے لگے تو پھر تو بڑا جان پھولے بھی نہیں سماتے اور لڑکے کا میاں مولوی اور میاں فاضل محمد کے سوا اور کوئی نام ہی نہیں لیتے۔ اور اگر ایسا اتفاق ہوا کہ چند تعصبات مذہبی نے ان کا گلا گھونٹا اور نماز پڑھ پڑھ کر ماتھے پر سیاہ گٹا ڈالا لیا اور دو چار فقہ حدیث کی کتابیں پڑھ لیں اور مسئلہ مسائل بھگارنے لگے پھر تو وہ عرش سے بھی آگے بڑھ گئے اور شبلیؒ وجنیدؒ کو بھی ٹرخانے لگے...... اگر غور سے دیکھا جائے اور انصاف کیا جائے تو یہ تربیت کچھ تربیت نہیں ہے۔ ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں کے خیالات کے محدود ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ ان میں نہیں رہتا۔ ان کی حرکات مؤدبانہ صرف ایسے بندر کی سی حرکات ہوتی ہیں جس کو سلام کہنا اور ادب سے بیٹھنا اور کھڑے رہنا سکھایا ہو۔[1]

ہمارے یہاں ادب کے معنی یہ ہیں کہ لڑکا اپنے بزرگوں کے ڈر کے مارے سچی بات زبان سے نہ نکال سکے، جھک جھک کر بلا ضرورت سلام پر سلام کرے۔ یہ ویسا ادب ہے جیسا ایک بندر والا بندر کو سکھاتا ہے کہ ٹانگ اٹھا کر کھڑا رہے، ہاتھ جوڑ کر گردن نیچی جھکا کر سامنے آئے، اشارے کے ساتھ ڈگڈگی پر چڑھ بیٹھے۔ ہمارے ملک میں جن بزرگوں کے ہاں کے لڑکے گھٹنے جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور نہایت جھک کے سلام کرتے ہیں اور اشاروں پر کام دیتے ہیں ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بہت ادب سکھایا گیا ہے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ یہ ادب نہیں ہے

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۸

ایسے ادب دینے والوں کو اس بات کا خیال نہیں آتا کہ اولاد کے ایسے ادب سکھانے سے دلی جوش مر جاتا ہے ان کی عادت ذلیل ہونے کی ہو جاتی ہے ان کی جرات دلیری اور شرافت کو کھو دیتی ہے۔ تربیت بری باتوں سے بچنے کی ہونی چاہیے اندرونی قویٰ کے مارنے کی ضرورت نہیں۔ اگر لڑکے اپنے باپوں کے سامنے اپنے جوشوں کو کام میں لائیں گے تو وہ آئندہ کو باعث فخر ہوں گے۔ ہمارے ہاں بعوض اس کے کہ ان کو صداقت اور آزادی رائے کی تعلیم ہو ہم کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑتی ہے ..... البتہ آزادی اور بے ادبی میں تمیز کرنا چاہیے۔ یہ دو چیزیں ہیں۔ اصلی ادب کے ساتھ آزادی کا کام میں لانا باعث فخر ہے۔ آپ لوگ یاد رکھیں کہ جو خیالات چھوٹی عمر سے دل میں بیٹھتے ہیں ان کا نکلنا بہت مشکل ہے، بلکہ نہیں نکلتے اور اسی سبب سے ہمارے ہاں کے لوگ جوان ہو کر بھی اکثر باتیں اپنے دلی خیال کے خلاف کہتے ہیں ..... یہ اسی خراب تربیت کا نتیجہ ہے ..... میونسپل کمیٹی کے ذی رتبہ اور عالی درجہ ممبروں کا حال ..... اکثر جگہ یہی دیکھا ہے کہ بجز حضور اور ہاں میں ہاں ملانے کے ممبر اور کچھ بھی نہیں کہتے۔ پھر باہر جا کر یہ کہتے ہیں کہ یہ تجویز بہت خراب تھی مگر کیا کرتے کلکٹر صاحب کی بھی مرضی یہ ہی تھی۔ یہ اسی بری تربیت کا اثر ہے۔ اگر سچی آزادی کی تعلیم ہوتی تو کلکٹر کیا وائسرائے کے سامنے بھی یہ کہتے "مائی لارڈ! آئی ایم ویری ساری آئی کانٹ ایگری ود یوئر ایکسیلنسیز پروپوزل"۔ [۱]

(My Lord! I am very sorry, I can't agree with your Excellency's proposal.)*

غلام اور لونڈیاں

اشرف المخلوقات کا تنزل

غلامی تمام اخلاق انسانی کو خراب کرنے والی ہے۔ غلاموں کے حالات اور ان کی عقل

---

* میرے آقا! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں جناب والا قدر کی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتا۔

[۱] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۲۲-۱۲۳

اور عادات انسانی حالت سے تنزل کر کے حیوانی حالت میں آ جاتے ہیں اور جو لوگ غلام بناتے ہیں وہ جبراً اور ناانصافی سے انسان کو، جو اشرف المخلوقات ہے، تنزل کی حالت میں ڈالتے ہیں۔[1]

انسان کی بدبختی سے کوئی نسل اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ غلامی کی مصیبت انسانوں میں نہ رہی ہو۔ بہت عقل منداور دانا اور حکیم گزرے، بہت سے صاحب شریعت گزرے مگر بجز ایک کے اور کسی نے اس قانون 'قدرت کے مخالف' کا کچھ تدارک نہ کیا۔[2]

محمد رسول اللہ صلعم نے جو کچھ اس کی نسبت کہا اس کو کسی نے نہیں سمجھا۔[3]

مسلمانوں کی یہ بدبختی تھی کہ ان کے عالموں نے اپنی قدیم رسم کی غفلت میں اس پر خیال نہیں کیا اور صرف لڑائی کے قیدیوں کا لونڈی وغلام بنانا جائز سمجھا مگر ہم صرف خدا اور خدا کے رسول کے حکم کی اطاعت کریں گے اور کسی مولوی، مُلّا، مجتہد، فقیہہ کی تقلید سے غلطی میں نہ پڑیں گے۔[4]

مسئلہ غلامی

کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ قرآن یا حدیث میں کسی جگہ یہ حکم ہے کہ جو لوگ جہاد میں پکڑے جاتے ہیں وہ لونڈی وغلام ہو جاتے ہیں۔[5]

لڑنا یا کافر ہونا اس قدرتی حق یعنی آزادی کو زائل نہیں کر سکتا اور نہ ان برائیوں کو کھو سکتا ہے جو غلامی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ فرض کرو کہ لڑنے والے قصوروار ہوں، مگر عورتوں کا کیا قصور ہے؟ شاید ان کا یہ قصور ہو کہ وہ کافر ہیں، مگر معصوم بچوں کا کیا قصور ہے؟[6]

قرآن مجید میں جو متعدد جگہ لونڈیوں وغلاموں کا ذکر آیا ہے اور بعضی جگہ ان کی نسبت کچھ احکام بھی بیان ہوئے ہیں، اس سے لوگ متعجب ہوں گے کہ اگر غلامی معدوم ہو گئی تھی تو وہ احکام قرآن مجید میں کیوں آئے تھے۔ اس چیز نے بڑے بڑے عالموں کو دھوکا دیا ہے اور غلطی میں ڈالا ہے مگر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تمام احکام ان ہی موجودہ لونڈیوں وغلاموں کی نسبت ہیں جو

۱۔ ابطالِ غلامی، ص ۲۱ ۲۔ مقالات سرسید (۴)، ص ۳۶۲ ۳۔ ایضاً، ص ۳۹۷
۴۔ ابطالِ غلامی، ص ۲۵ ۵۔ ایضاً، ص ۲۶ ۶۔ ایضاً، ص ۲۴

بموجب رسم جاہلیت اور قبل نزول آیت حریت کے غلام ہو چکے تھے اور جن کو اسلام نے بھی آزاد نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ان تمام آیتوں میں جن میں لونڈی و غلام کا ذکر ہے' ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے جو آئندہ کی غلامی پر' جس کو ہم بلفظ رقیت مستقبلہ تعبیر کریں گے' دلالت کرتا ہو۔[1]

عیسائی اور مسلمان حکومتوں کا موازنہ

اگرچہ عیسائی مذہب نے کچھ بھلائی غلاموں کے حق میں نہیں کی تھی مگر بلاشبہ عیسائیوں نے ان کے حال پر رحم کیا اور یہ نیکی اور بلند نامی انہوں ہی نے حاصل کی...... ولایت میں ایک میرے انگریز دوست نے مجھ سے کہا کہ صرف ہماری قوم ہی کو آزادی کا فخر نہیں ہے بلکہ ہماری زمین کو بھی یہ افتخار ہے' اس لئے کہ جو شخص ہماری زمین پر قدم رکھتا ہے' گو وہ کسی کا غلام ہی کیوں نہ ہو' اسی وقت سے آزاد ہے۔ اس کے اس کہنے نے میرے دل پر نہایت اثر کیا اور میں نے کہا کہ بلاشبہ تم کو اور تمہاری زمین کو یہ بڑی عزت ہے جو خدا نے دی۔[2]

مذہب اسلام کے پیروؤں کو بلاشبہ حق تھا کہ وہ غلامی کا نام نشان دنیا میں باقی نہ رکھتے اور غلاموں کی آزادی کا فرمان' جیسا کہ اصول مذہب اسلام سے پایا جاتا ہے' دنیا میں جاری کرتے مگر افسوس ہے کہ وہ سب سے زیادہ اندھیرے میں پڑے اور باوجودیکہ اس زمانہ میں تمام ملک روشن ہو گئے ہیں مگر اسلامی عملداریاں اب تک اسی تاریکی اور اندھیرے میں ہیں۔[3]

ہماری رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں دین و دنیا دونوں کا خسران مسلمان گورنمنٹوں کو نصیب ہے۔ اب بجز مسلمان گورنمنٹوں کے اور کہیں غلاموں کی تجارت جاری نہیں ہے...... کیا افسوس اور شرمندگی کی بات ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ عرب میں گائے بیل کی مانند نہایت بے رحمی سے لونڈی غلام بازار میں بکتے ہیں...... پس مسلمان گورنمنٹوں کو اس فعل کے سبب ہماری ملامت کرنا اور ''خسرة الدنیا و الاخرة'' کہنا کچھ خلاف نہیں ہے۔[4]

جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے وہ شریعت اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے' اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی بیت ناک عدالت میں بطور ایک گنہ گار کے حاضر ہوگا' خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینہ میں۔[5]

---

[1] ابطال غلامی، ص ۳۶ [2] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۶۵-۶۶ [3] ایضاً، ص ۶۵ [4] ایضاً، ص [illegible]
[5] خطبات احمدیہ، ص ۱۷۹

غلامی کے مسئلہ پر اجماع

یہ بحث، جو ہم نے شروع کی، ایک ایسی بحث ہے کہ ساڑھے بارہ سو برس کے درمیان میں شاید کسی نے نہیں کی اور بلاشبہ اس وقت ہم پر خرق اجماع اور تخلف اجماع امت کا الزام لگایا جاتا ہے مگر چونکہ مسلمانوں کا مقرر کیا ہوا یہ ایک مسئلہ ہے کہ اجماع ثانی اجماع اول کو منسوخ کر دیتا ہے، اور اجماع ثانی شروع ہونے کے لئے ضرور ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص اجماع اول سے اختلاف کرے پس وہ شخص میں ہوں۔ اور کیا عجب ہے کہ اس پر اجماع ہو جائے اور اجماع ثانی اجماع اول کو منسوخ کرے اور یہ جھوٹا داغ، جو ہم نے اپنی غلطی سے اسلام کے خوبصورت چہرہ پر لگایا ہے، ہمیشہ کے لئے مٹ جائے۔[۱]

لونڈیوں سے تصرف

جو امور لونڈیوں اور قیدی عورتوں اور بے گناہ اہل عصمت کے ساتھ جائز سمجھے جاتے ہیں کیا وہ حقیقت میں نیک ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ باتیں حرکات بہائم سے کچھ زیادہ رتبہ رکھتی ہیں؟ کیا وہ کسی مذہب کے سچے ہونے اور خدا کے دئے ہونے پر دلیل ہو سکتی ہیں؟ وہ دنیا کی آنکھ میں اس مذہب اور اہل مذہب کی نیکی بٹھا سکتی ہیں؟ حاشا وکلا، بلکہ ایک لحمہ کے لئے بھی یہ بات نہیں مانی جا سکتی کہ سچا مذہب، جو خدا کی طرف سے اُترا ہو، اس میں ایسے امور جائز ہوں۔ پس نہایت افسوس ہے کہ ان باتوں کو سوچا سمجھا نہ جائے۔[۲]

سنی صرف اس مطلب سے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا حق ہونا شیعوں پر ثابت ہو، ائمہ اہل بیت پر لونڈیوں کے تصرف کی تہمت لگاتے ہیں ورنہ وہ ازدواج مطہرات منکوحہ اہل بیت علیہم السلام تھیں۔ صحابہ وتابعین کی نسبت بھی کوئی کافی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ قیدی عورتوں کو بطور لونڈیوں کے بلا نکاح انہوں نے تصرف کیا ہو۔[۳]

ہم کو نہایت رنج وافسوس ہے مسلمانوں کی ایسی جاہلانہ باتوں پر جو اسلام کو ایسی بد باتوں

۱۔ ابطال غلامی، ص ۱۵۹ ۲۔ ایضاً، ص ۴۴ ۳۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۳۲۰

سے داغ دار کرتے ہیں اور جو باتیں اسلام میں نہیں ہیں صرف اپنی ہوائے نفسانی سے اس میں داخل کرتے ہیں ..... افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو ایسی باتیں مذہب اسلام میں جائز بتاتے ہیں اور مذہب اسلام کو بدنام کرتے ہیں' اور اس سے بھی زیادہ افسوس ہے مسلمانوں کی اس حالت پر کہ ایسوں کو تو مقدس مسلمان تصور کرتے ہیں اور جو کوئی مذہب اسلام کو ان نجس باتوں سے پاک بتائے اور ثابت کرے کہ یہ خدا کا حکم نہیں ہے اور نہ مذہب اسلام میں جائز ہے بلکہ مذہب اسلام اس عیب سے پاک ہے اس کو کافر و ملحد و کرستان و نیچریہ بتاتے ہیں۔[1]

خواجہ سرا روضہ مبارک پر

مسلمانوں میں خواجہ سراؤں کا رواج اسلام کو داغ لگانے والا ہے کیونکہ سوائے مسلمانوں کے اور کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے۔ پھر جو فعل کہ حرام و ممنوع شرعی ہے اس کے مرتکب ہوتے ہیں اور پھر ان ہی لوگوں کو حفاظت روضہ مطہرہ اور خانہ کعبہ پر متعین کرتے ہیں اور ان ہیجے کے پھوٹوں کو رسول خدا صلعم سے بھی شرم نہیں آتی کہ آں حضرتؐ کے حکم کے برخلاف کام کرتے ہیں اور پھر ان ہی کو روضہ مبارک کے سامنے لے جاتے ہیں اور حیات النبی کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ اگر غیرت اور خدا اور رسولؐ سے شرم ہوتی تو چپنی بھر پانی میں ڈوب مرتے۔[2]

جو بدعات کہ مکہ معظمہ میں ہوتی ہیں اور جو خلاف شرع رسول خدا صلعم ہیں وہ اس وجہ سے کہ مکہ والے کرتے ہیں' جائز نہیں ہوسکتیں۔ لونڈی اور غلام جس طرح کہ مکہ میں بیچے جاتے ہیں اور خواجہ سرا بنائے جاتے ہیں اور مکہ معظمہ اور روضہ منورہ جناب رسول خدا صلعم میں خواجہ سرا متعین ہیں یہ سب خلاف شرع ہیں اور جو مسلمان' ہیئے کے پھوٹے اور دل کی آنکھوں کے اندھے، اس کو اچھا جانتے ہیں محض جاہل ہیں۔ روضہ مطہرہ رسول خدا صلعم پر خواجہ سراؤں کا متعین کرنا میری دانست میں ایسی بے ادبی ہے کہ اس سے زیادہ اور کوئی بے ادبی نہیں ہوسکتی۔[3]

افسوس کہ ان ناخدا ترس مسلمانوں نے اپنے افعال قبیحہ سے کیسے روشن مذہب اسلام کو بدنام کیا ہے اور دھبہ لگایا ہے۔ سبحان اللہ' جو فعل مبغوض رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تھا اسی قسم

۱۔ تہذیب الاخلاق (۲) ص ۴۰۷ ۲۔ ایضاً ص ۳۱۸ ۳۔ ایضاً ص ۳۴۱

کے لوگ یعنی خواجہ سرا روضہ متبرکہ رسالت مآب علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اور خانہ کعبہ پر متعین کیے گئے ہیں اور یہ ہیجے کے چھوٹے مسلمان اس کو باعث افتخار جانتے ہیں اور اس کے مخالف کو لامذہب یا کرستان بتاتے ہیں۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔[1]

عائلی مسائل

کثرتِ ازدواج

مذہب اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدادِ ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک بیوی کو پسند کیا ہے...... شارع نے ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت کو نہایت محدود اور خاص حالت میں مخصوص کر دیا ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم کو خوف ہے کہ عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی ہونی چاہیے...... ہاں، بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو، جن کی زندگی کا عین منشا ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے، ایک حیلہ ہاتھ آ گیا ہے مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کے بے جا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے...... جو تعدادِ ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو اور تین تین اور چار چار جوروئیں کرنے لگے، اور ایک تازہ کی عورت کو دواؤں پر چڑھایا اور نکاح کر مارا، جہاں مقدس بزرگ مولوی ہوئے اللہ میاں کے سانڈ بنے اس مریدنی کو لے ڈالا، وہاں وعظ کہنے گئے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا، قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبۃ النکاح کا پڑھانے لگے، اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدہوتا ہے۔[2]

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲) ص ۷۰   [2] خطبات احمدیہ، ص ۱۶۱-۱۶۳

مسئلہ طلاق

یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے۔ اس کے سبب سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب وحالت سے ایسی خرابیاں مرد وعورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے، اور وہ علاج طلاق ہے۔[۱]

اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے حسن اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔ بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا ''بجز طلاق کے اور کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب ہو''...... یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو، جو طلاق لینا چاہتی ہیں، یہ فرمایا ہے کہ ''جو عورت اپنے خاوند سے بغیر ضرورت شدید اور بغیر حالت سختی کے طلاق چاہے اس پر خوشبو جنت کی حرام ہے یعنی جنت میں نہ جائے گی''۔[۲]

بانی اسلام نے انہی ہدایتوں اور تہدیدوں پر طلاق کے روکنے میں بس نہیں کیا بلکہ نکاح اور ملاپ کے قائم رکھنے کی اور بھی نہایت عمدہ تدبیر رکھی ہے، یعنی پوری تفریق واقع ہونے کو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہے اور پھر اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ دفعتاً تین طلاقیں نہ دی جائیں بلکہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے کہ ہر ایک میں قریباً پچیس روز کا فاصلہ ہو جاتا ہے اور پھر بھی اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے اور رنجش مٹ جائے اور دونوں کی محبت تازہ ہو جائے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں۔ دوسری طلاق کے بعد بھی اسی طرح وہ پھر آپس میں مل سکتے ہیں اور بدستور جورو خصم رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر پھر تیسری دفعہ طلاق دے دی جائے تو ثابت ہو گیا کہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں، پھر بہتر ہے کہ پوری تفریق ہو جائے۔[۳]

ہاں، میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت

۱۔ خطبات احمدیہ، ص ۱۶۴ ۲۔ ایضاً، ص ۱۷۰ ۳۔ ایضاً، ص ۱۷۱

طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس ان کے افعال کی نفرین انہی پر ہونی چاہیے، نہ مذہب اسلام پر..... کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لاعلاج کا علاج ہے۔[1]

متفرق

سود (ربائے ممنوع و ربائے جائز)

ربا درحقیقت ایک نہایت بری چیز ہے اور انسانی اخلاق اور تمدن کے لئے بعضی حالتوں میں نہایت مضر ہے۔ ربا جب کہ ایک پیشہ کرلیا جاتا ہے، جیسا کہ سودخور آڑھتیے اور مہاجن بطور پیشہ کے اس کو برتتے ہیں، تو تمدن کے لئے نہایت مضر ہوتا ہے۔[2]

ربا کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور ہر ایک بڑھوتری حرام نہیں ہے بلکہ وہی خاص بڑھوتری حرام ہے جو آپس میں عرب کے لوگوں میں ربا کے نام سے موسوم تھی اور وہ بڑھوتری ادھار کے معاملہ میں ہوتی تھی۔[3]

یہ طریقہ ربا کا جو عرب جاہلیت میں جاری تھا، بعینہٖ ہندوستان کے سودخوروں میں جاری ہے کہ وہ ایک شخص کو روپیہ قرض دیتے ہیں اور اس پر ماہواری یا ششماہی سود لیتے ہیں اور اگر وہ میعاد پر ادا نہیں ہوتا تو اس سود کو بھی اصل میں داخل کر دیتے ہیں اور مجموع اصل و سود پر پھر سود لیتے ہیں..... ایسا بھی کرتے ہیں کہ غلہ ایک میعاد معین کے لئے قرض دیتے ہیں اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ جتنا دیا ہے اس کا ڈیوڑھا یا دوگنا لیں گے اور جب میعاد پر ادا نہیں ہوتا ہے تو اس اضافہ کو بھی اصل میں شامل کر کے میعاد بڑھا دیتے ہیں اور اس مجموع پر ڈیوڑھا یا دوگنا لینے کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ سب صورتیں اس ربا کی ہیں.....اور بلاشبہ یہ ربا حرام ہے۔[4]

مذہب اسلام میں جس سود لینے کا امتناع ہے وہ درحقیقت عام اخلاق، عام انسانیت، عام رحم، عام ہمدردی کے برخلاف ہے۔ باقی معاملات تجارت اور دیگر قسم کے لین دین و معاملات میں جو سود ممنوع کا اطلاق کیا گیا ہے یہ علما اور ائمہ مجتہدین کی رائے اور قیاس ہے۔ اس تحریر سے

۱۔ خطبات احمدیہ، ص ۱۷۲ ۲۔ تفسیر القرآن (۱)، ص ۳۰۵ ۳۔ ایضاً، ص ۳۰۲ ۴۔ ایضاً، ص ۳۰۴

غرض یہ ہے کہ کوئی حکم اسلام کا، جس کو اس حد تک رکھا جائے جہاں تک کہ وہ ہے، باعث افلاس یا مسلمانوں کی اخلاقی و تمدنی حالت کا خراب کرنے والا نہیں ہے۔[۱]

وہی ربا حرام کیا گیا ہے جو ایسے غریب و محتاج آدمیوں سے لیا جاتا تھا جو کھانے کو محتاج تھے اور غلہ یا کھجوریں یا اور کچھ قرض لے کر قوت لایموت بہم پہنچاتے تھے اور جن کی نسبت قرآن مجید میں جابجا سلوک و ہمدردی کرنے کی ہدایت تھی...... ان کے سوا وہ لوگ ہیں جو ذی مقدور اور صاحب دولت و جاہ و حشمت ہیں اور اپنے عیش اور آرام کے لئے روپیہ قرض لیتے ہیں، جائدادیں مول لیتے ہیں، مکان بناتے ہیں اور قرض روپیہ لے کر چین اڑاتے ہیں۔ گو اُن کو قرض دینا بعض حالتوں میں خلاف اخلاق ہو مگر ان سے سود لینے کی حرمت کی کوئی وجہ قرآن مجید کی رو سے مجھ کو نہیں معلوم ہوتی۔[۲]

بہت سے معاملات قرضہ کے...... جن سے تجارت کو اور ترقی ملک کو اور افزونی آبادی کو نہایت امداد پہنچتی ہے، ان معاملات میں جو سود کہ لیا و دیا جاتا ہے مجھ کو قرآن مجید کی رو سے اس کے ایسے ربا ہونے کی، جس کو...... حرام کیا ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ پس حکم ربا کا، جو قرآن مجید میں ہے، وہ نہایت اخلاق و نیکی پر مبنی ہے اور کسی طرح ترقی تجارت و ترقی ملک و دولت کا مانع نہیں ہے۔ فقہا نے بلاشبہ اپنے اجتہاد اور قیاس سے ایسی قیدیں بڑھا دی ہیں جن سے ربا کا حکم تجارت کی ترقی کا مانع قوی ہو گیا ہے مگر قرآن مجید سے ایسا نہیں پایا جاتا۔[۳]

گورنمنٹ یا کوئی جماعت محدود اس غرض سے روپیہ قرض لے کہ اس روپیہ سے ایک نہر آب پاشی کے لئے یا آہنی سڑک آمد و رفت کے لئے جاری کرے اور دائن کو اس قرضہ کی بابت سود دینا قبول کرے تو وہ بھی ربائے ممنوع میں...... داخل نہیں ہے۔[۴]

فرض کرو کہ کسی شخص یا جماعت نے ایک سرمایہ اس غرض سے جمع کیا ہے کہ اس کے محاصل سے عام رفاہ کے کام کئے جائیں۔ گے، وہ سرمایہ فقہ کی رو سے وقف ہے اور وہ شخص یا جماعت صرف امین یا متولی وقف ہے، اس سرمایہ کی ملکیت نہیں رکھتے۔ پس اگر وہ سرمایہ بالفرض کسی کو سودی قرض دیا جائے تو وہ بھی ربائے ممنوع میں داخل نہیں ہو سکتا۔[۵]

۱۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (یکم دسمبر ۱۸۷۷ء)، ص ۱۰۴۲ ۔ ۲۔ تفسیر القرآن (۱)، ص ۳۰۷
۳۔ ایضاً ۔ ۴۔ ایضاً، ص ۳۱۰ ۔ ۵۔ ایضاً، ص ۳۱۱

تھیٹر کا اثر

ہر ملک میں کچھ تفریح کا بھی سامان ہونا چاہیے جس سے وہ لوگ جو اپنے دماغ کی قوت مفید اور عمدہ کاموں میں صرف کرتے ہیں' کسی وقت تفریح بھی حاصل کریں۔ تھیٹر میں ایک لازمی امر یہ ہے کہ نصیحت آمیز باتوں اور بداخلاقی کے عیوب دکھانے کے ساتھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو بداخلاقی یا بدنفسی کی باتوں کو بھی یاد دلاتی ہیں یا سکھاتی ہیں۔ پس تھیٹر ایسے ملک میں ہونا چاہیے کہ جہاں تعلیم نے اور سوسائٹی نے لوگوں کے دل پر ایسا اثر کر دیا ہو کہ ان کے دل پہلی قسم کی باتوں سے موثر اور دوسری قسم کی باتوں سے ذہول کرنے کے قابل ہوں۔ ہندوستان کی حالت ایسی نہیں ہے۔ یہاں مفید کام تو کوئی نہیں کرتا' پھر اگر تفریح ہی تفریح ہو تو کیا ہوگا؟ علاوہ اس کے دل میں نہایت مختلف اثر پیدا ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ پہلی قسم کی باتوں سے وہ موثر اور دوسری قسم کی باتوں سے ذہول کریں' وہ دوسری قسم کی باتوں سے موثر ہوتے ہیں اور پہلی قسم کی باتوں سے ذہول کرتے ہیں۔[1]

جاندار کی تصویر

حنفیوں کا ہاں کا مسئلہ ہے کہ جاندار کی اس قدر تصویر جس سے زندہ رہنا ممکن نہ ہو، بنانی یا رکھنی ناجائز نہیں ہے۔ ایک مصور نے سن کر کہا کہ "میں تو پورے قد کی تصویریں بھی ایسی ہی بناتا ہوں کہ اگر اتنی ہی چیزیں انسان میں ہوں جتنی کہ میں بناتا ہوں تو بھی انسان کا زندہ رہنا ممکن نہیں"۔ اس نے قسم کھائی اور کہا "میں نہ انسان کا بھیجا بناتا ہوں نہ پھیپھڑا' نہ دل و جگر' نہ معدہ' نہ امعاء' نہ خون' نہ روح اور بغیر ان سب چیزوں کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس میں بھی حنفی مسئلہ کے بموجب کوئی ناجائز کام نہیں کرتا"۔ جب مصور سے کہا گیا کہ قیامت میں خدا کہے گا کہ اب اس میں جان ڈال، تب وہ حیران ہوا اور کہنے لگا کہ جناب' درخت کی بھی تصویر بناؤں یا نہیں؟ تو اس سے کہا گیا کہ درخت کی تصویر منع نہیں۔ تب اس نے کہا جناب' اگر قیامت میں خدا کہے گا کہ اب اس کو بڑھا اور پھل پھول لگا تو میں کیا کروں گا؟ اس سے کہا گیا کہ درخت

---

[1] بروایت اقبال علی، سفرنامہ پنجاب، ص ۲۷

میں قوت نامیہ پیدا کرنے کو اور پھل پھول لگانے کو خدا نہیں کہنے کا۔ مصور بولا کہ نہ صاحب' میں نہ مانوں۔ ایسے خدا سے جو کاغذ پر لکیریں کی ہوئی جانور کی تصویر میں جان ڈالنے کو کہے گا' کیا لگتا ہے کہ وہ کاغذ پر درخت کی کھچی ہوئی تصویر میں بھی قوت نامیہ یا پھل پھول لگانے کو کہے۔ یا تو اس مسئلہ ہی میں کچھ غلطی ہے یا مطلقاً تصویر بنانا' جاندار کی ہو یا بے جان کی' بالکل ممنوع ہے۔[1]

میں نے اس امر کی نسبت کہ تصویر مجسم یا غیر مجسم' شرعاً جائز ہے یا غیر جائز' کبھی کچھ نہیں کہا۔ ہاں' میں اس قسم کی یادگاریوں کو پسند کرتا ہوں۔ اگر وہ شرعی گناہ ہیں تو میرا ان کو پسند کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ میں شامت اعمال سے اور گناہ کی باتوں کو پسند کرتا ہوں۔[2]

ان چیزوں کو موجودہ حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج ڈالنا اور ان کو متوحش اور زیادہ تر متنفر کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جن کی بحث سے ترقی تعلیم اور ترقی تہذیب میں ہرج پڑے گا' پس اس کو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیے۔ پہلے امور معظم اور اصول کو رائج کرنا چاہیے۔ تصویر و تماثیل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں۔ اس کی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی اور جواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود ہوتا جاتا ہے' پس جو بیل کہ چل رہا ہے اس کو آر مارنے کی کچھ ضرورت نہیں۔[3]

خیرِ دائم اور امورِ رفاہِ عام

ہمارے زمانہ کے مسلمان بھائیوں نے سوائے فرائض کے باقی عبادتوں کو صرف نماز' روزہ و تلاوت' قرآن مجید اور خیالی ترک دنیا اور درس و تدریس علوم دینیہ اور اوراد ماثورہ یا وظائف مقررہ پیران ہی میں منحصر کر رکھا ہے۔[4]

ایک بڑی غلطی جس میں مسلمان پڑے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل کرنے اور نفل پڑھنے اور نفلی روزہ رکھنے پر منحصر سمجھا ہے۔ قطع نظر اس کے ان کا ایسا کرنا اور حد اعتدال سے گزر جانا' جو قانون قدرت کے خلاف ہے' مقصود

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۴۱ [2] ایضاً، ص ۳۴۱ [3] خطوط سرسید، ص ۲۰۹

[4] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۶۹

شارع ہے یا نہیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عبادت صحیح، مگر اس کے سوا اور نیک باتوں کو عبادت نہ سمجھنا، جو اُن سے بھی بہت زیادہ مفید ہیں، بہت بڑی غلطی ہے۔ زہد و ریاضت، جہاں تک حد شرعی سے تجاوز نہ کرے، بلاشبہ نیکی و عبادت ہے مگر عام فلاح پر کوشش کرنا اور ایسے امور پر کوشش کرنا جو اپنے ہم مذہبوں کے دینی اور دنیوی حال اور مال کی بھلائی و بہتری کے ہوں اس سے بہت زیادہ تر مفید ہیں۔[1]

مسلمانوں کے عقائد کے مطابق انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام نیک ترین بندگان خدا ہیں اور اس لئے ضرور ہے کہ وہ ایسی نیکیوں کے منبع یا مخزن ہوں جو تمام نیکیوں سے اعلیٰ اور افضل ہوں ورنہ ترجیح بلا مرجح ہوگی۔ اس لئے ہر ایک انسان کو ایسی نیکی کی جو ہمیشہ رہنے والی ہے، تلاش اور تجسس لازم ہے۔ بعضوں نے پل اور مسجد، چاہ و مہمان سرائے چند روزہ رہنے والی چیزوں کو خیر دائم سمجھا اور بہت بڑی غلطی کی کیونکہ یہ تمام چیزیں ادنیٰ حوادث سے فنا اور معدوم ہونے والی ہیں۔ اب کہاں ہے وہ چاہ یوسف اور کہاں ہے وہ مسجد اقصیٰ؟ سب معدوم ہوگئیں اور اسی طرح ہزاروں بنیں گی اور معدوم ہوں گی۔ نہایت فہمیدہ اور دقیقہ رس لوگوں نے خیر و خیرات میں، زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا مگر اس کی صحت بھی مشتبہ ہے۔ ★ تمام اعمال حسنہ آنکھ

★ کسی زمانے میں سرسید خود ان کاموں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ حالی لکھتے ہیں: ''جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ ثواب کے معمولی کاموں میں بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔'' (حیاتِ جاوید (۲)، ص ۵۰۴)

حالی سرسید کا ایک واقعہ بھی بیان کرتے ہیں: ''غدر سے پہلے، جب کہ وہ بجنور میں صدر امین تھے، انہوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی۔ اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی لے کر لگایا۔ مگر غدر کے بعد جب سہارن پور کی جامع مسجد کے لئے ان سے چندہ طلب کیا گیا تو انہوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور لکھ بھیجا کہ میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔'' (ایضاً، ص ۱۷)

اسی طرح خیر و خیرات کے متعلق سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں: ''جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی ان کی آمدنی میں سے ایک حبہ پس انداز نہ ہوتا تھا۔'' (ایضاً، ص ۱۶)

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۷۲

موندی اور منقطع ہوئے۔ جب کہ انسان موت کی خواب راحت میں استراحت فرماتا ہے تو تمام اعمال حسنہ کا انقطاع ہو جاتا ہے۔ زاہد کی تسبیح ہمہ تن دانہ اشک بن کر روتی ہے کہ وہ کیا ہوا جو مجھ کو شمار وظائف سے زندہ رکھتا تھا۔ مصلیٰ محراب مسجد میں چت پڑا ہائے ہائے کرتا ہے کہ وہ کہاں ہے جو اپنی پیشانی سے مجھ کو جان تازہ بخشتا تھا۔ منبر فراق واعظ سے دل شکستہ ہے کہ میرا واعظ کہاں ہے۔ ملائکہ مقربین، جو اس کے ذکر و شغل کی مجلس کی خیر و برکت لینے کو آتے تھے، اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور یہ یک مشت خاک ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں، نہ اپنی کچھ کہتے ہیں اور نہ کسی کی سنتے ہیں۔ صرف زبان حال ان میں باقی ہے سو وہ یہ کہتی ہے کہ جو ہونا تھا سو ہولیا اور جو کرنا تھا سو کرلیا۔ غرض کہ ہر ایک قسم کی نیکی کو جب خیال کرو گے تو وہ اسی شخص کی ذات پر منحصر ہوگی اور اس کی فنا کے ساتھ ہی منقطع ہوگی اس لئے زہد و تقویٰ، عبادت و سخاوت خیر دائم نہیں ہوسکتی۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔[1]

یہ لاہور کی بڑی بادشاہی مسجد دیکھو، کس حالت سے کس حالت پر پہنچ گئی ہے اور ضرور ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ اس مسجد کی یہ حالت بھی باقی نہ رہے گی۔[2]

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی کام نہ کئے جائیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ جب قومی رفاہ کا کوئی کام نہیں کیا جاتا اور صرف مسجدیں، امام باڑے ہی بنائے جاتے ہیں تو میں اس کو قابل عزت اور قابل وقعت نہیں سمجھتا۔[3]

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

''مگر جب سے انہوں نے مدرسۃ العلوم قائم کیا ان کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا۔ وہ سائل کا کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے...... جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اس پر دورو بک کرتے تھے اس کو دیکھ کر ناواقف آدمی ان کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصور کرتا تھا۔'' (ایضاً، ص ۵۰۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کرلیا تھا کہ کوئی سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرسۃ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو...... سرسید کے ایک معزز ہم وطن نے ایک رفاہِ عام کے کام میں ان کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر کرنا چاہا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں صلاح و مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا۔ اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھ کو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔'' (ایضاً، (۱)، ص ۲۱۲-۲۱۳)

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۸ [2] مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۱۳۸ [3] خطوط سرسید، ص ۱۴۸

مسلمانوں کی خیالی معاشی بدحالی

ایک خیالی دنیا بناؤ اور یہ تصور کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے، سب مفلس اور نان شبینہ کومحتاج ہوں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان بدعقلیوں اور بدفہمیوں اور بدنصیبیوں کے سبب جو زمانہ حال میں ان کے خطوط پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں، عنقریب ہونے والا ہے) اور در بدر بھیک مانگتے پھریں، ان کی اولاد جاہل اور نالائق، چور اور بدمعاش ہو۔ واعظین کو، جو محض ریاکاری اور مکاری سے دنیا کماتے پڑے پھرتے ہیں، کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا لقمہ تر کھلانے والا نہ رہے، جناب حضرت پیر جی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کے اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ ان پر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اس کی تحصیل میں مصروف ہیں، ان کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ، جو حدیث و تفسیر یا صدرہ و شمس بازغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں، ان کو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے، جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے اچھے مولوی ٹکے ٹکے کو مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا، تو اس وقت دین کا کیا حال ہوگا؟[۱]

اس کا خیال بڑے دین داروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھیتری ڈھو رہے ہیں، کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہوں گے، کسی کا گھوڑا مل رہے ہوں۔ اور جو ایسے پکے دین دار نہیں ہیں ان کی نسبت کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کیا کریں گے۔ معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور جزائر نو آباد بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسا رونق پائیں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی اور اس وقت ہم سلام کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ و کعبہ، ہم جو مسلمانوں میں دنیوی ترقی و تہذیب، تربیت و شائستگی میں کوشش کرتے تھے وہ ہمارا امر معاش میں منہمک ہونا اور ترغیب دینا اور امر معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا تھا یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سر تا سر معاد کا تھا؟[۲]

۱۔ تہذیب الاخلاق (۲) ص ۱۶۲ ۲۔ ایضاً

مشنری تعلیمی اداروں میں انجیل کی تعلیم

......میرے نزدیک مشنری سکولوں اور کالجوں میں بائبل پڑھنا کسی طرح پر مذہب اسلام کے برخلاف نہیں ہے۔[1]

[1] بروایت حالی، حیاتِ جاوید (۱)، ص ۲۵۰

تعلیمی نظریات

انگریزی حکومت اور تعلیم

انگریزوں کی مثالی خدمات

ہم انگلش گورنمنٹ کے زیر سایہ بستے ہیں جس میں ہم کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہے۔ ہم کو اپنی گورنمنٹ کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہم کو امن و امان کے سوا تعلیم میں بھی ایسی مدد دی ہے کہ کوئی سلطنت، کوئی بادشاہت ایسی ہم کو نظر نہیں آتی جس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں ایسی مدد کی ہو اور عمدہ سامان تعلیم کا مہیا کر دیا ہو۔[1]

ہم نہایت سچے دل سے کہتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جس قدر ناطرف دار طریقہ تعلیم کا اور مذہبی خیالات سے بالکل بچا ہوا اور اچھوتا اختیار کیا ہے اور جس قدر سعی اور کوشش ہندوستان کی تعلیم میں گورنمنٹ نے کی ہے وہ دونوں بے مثل اور بے نظیر ہیں اور غالباً اس وقت دنیا کے پردہ پر اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔[2]

ہم رعایا اپنی گورنمنٹ کی نیک نیتی کے دل و جان سے ممنون و شکر گزار ہیں۔ کچھ شبہ نہیں کہ گورنمنٹ دل سے ہماری تعلیم و تربیت چاہتی ہے اور بے شک اس نے ہندوستان میں جس قدر کوشش اس باب میں کی ہے اور جس قدر روپیہ خرچ کرتی ہے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ہے۔[3]

میں دل سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ وہ سعی و کوشش گورنمنٹ نے ہندوستان کی تعلیم پر کی ہے وہ ایسی ہے جس کی مثال دنیا میں اور کسی عمل داری میں موجود نہیں ہے۔ تمام رعایائے

---

[1] سفرنامہ پنجاب، ص ۹۵ [2] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۵۸ [3] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۸۸

ہندوستان کو گورنمنٹ کی اس فیاضی اور مہربانی کا جو اس نے بالخصوص تعلیم کے باب میں ہندوستان کی رعایا کی نسبت کی ہے، دل و جان سے شکر گزار ہونا چاہیے۔[۱]

جو شخص ہماری انگریزی گورنمنٹ کے انصاف پر نظر ڈالے گا وہ خوش ہوگا اور شکر کرے گا کہ اس گورنمنٹ نے تعلیم کے متعلق بہت کچھ کوشش کی ہے۔ کوئی سلطنت، خاص کر ہندوستان کی جس پر ہم کو بہت فخر ہے، ایسی نہیں گزری جس نے تعلیم میں اس قدر کوشش کی ہو..... گورنمنٹ کا شکریہ تو ہم سے ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا ہے بے مثل اور بے نظیر ہے۔[۲]

ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے براہ مہربانی ہمارے لئے تعلیم اور بڑا بوجھ اس طرح سے اپنے اوپر اٹھالیا ہے جس کی نظیر دنیا میں نظر نہیں آتی۔ گورنمنٹ ہمارے لئے اس سے زیادہ اور کچھ کر نہیں سکتی۔[۳]

لارڈ میکالے کے احسانات

جب سے ایک روشن ضمیر و تربیت یافتہ گورنمنٹ یعنی گورنمنٹ انگلشیہ کے ہاتھ میں ہماری قسمتیں سپرد ہوئی ہیں اس وقت سے ہماری تعلیم نے مختلف طرح سے پلٹے کھائے ہیں۔ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جب ہندوستان میں ہوئی تو ایک مدت تک اس نے اس بات کو نہیں جانا کہ ہندوستان کے لوگوں کی نسبت اس معاملے میں اس کا کیا فرض ہے، مگر جب اس نے اس فرض کو جانا تو یہ مشکل پیش آئی کہ وہ ان کی تعلیم کا کون سا طریقہ اختیار کرے..... اہل ہند کی بدنصیبی کا یہ دور ۱۸۳۵ء تک نہایت استحکام سے قائم رہا۔ آخر کار ایک نیک اور سچا مدبر یعنی لارڈ میکالے ہندوستان میں پیدا ہوا جو اس زمانے میں ہندوستان کی تعلیم کے بورڈ کا میر مجلس تھا۔[۴] (۱۸۸۱ء)

جب لارڈ میکالے پریذیڈنٹ ایجوکیشنل بورڈ کے تھے اس وقت اس کی تکرار اور بحث تھی کہ ہندوستان کو آیا انگریزی علوم اور فنون سکھائے جائیں یا ان کو ان ہی مشرقی علوم میں مبتلا

۱۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۱۲۳ ۲۔ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۱۳ ۳۔ ایضاً، ص ۲۵۲
۴۔ مقالات سرسید (۱۵)، ص ۵۴-۵۵

رتھیں وہ شخص جو اپنی نیک دلی سے خدا کے بندوں پر نیکی کرنا چاہتا تھا، اس امر میں گورنمنٹ سے مخالف تھا مگر بڑی بحث کے بعد وہ نیک بندہ خدا کے بندوں پر شفقت کرنے والا یعنی لارڈ میکالے، جیت گیا۔ میری دانست میں کوئی گورنر جنرل، کوئی وائسرائے کوئی ملک کا خیرخواہ ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان پر اور ہندوستانیوں پر احسان کیا ہو، جس نے اس طرح کے استقلال اور ملک کی خیرخواہی زورِ قلم اور سچی رائے سے ثابت کر کے یہ طے کرا دیا کہ انگریزی زبان اور یورپین سائنسز کی ہندوستانیوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم ہو۔[1] (۱۸۸۴ء)

لارڈ میکالے میرے خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی کے درخت کا، یا یوں کہو کہ علم کے درخت کا، بیج بویا۔ گورنر جنرل اور کوئی وائسرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔[2] (۱۸۸۴ء)

لوگوں کا خیال ہے کہ لارڈ میکالے ایک مذہبی شخص تھا۔ وہ ایشیا کی تواریخ کو، ایشیا کی الٰہیات کو، ایشیا کی طبابت کو، ایشیا کے مذہب کو نامعقول سمجھتا تھا اور اس لئے مذہبی خیال سے اس قدیم طریقہ تعلیم کا تبدیل ہونا چاہتا تھا۔ فرض کیا جائے کہ وہ ایسا ہی تھا مگر جو عزت کہ اس کو اپنی سچی رائے ظاہر کرنے سے اور جس کو وہ دھوکا سمجھتا تھا اس کو دلیری سے دھوکا کہہ دینے سے حاصل ہوئی ہے، وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔[3] (۱۸۸۱ء)

ہم لارڈ میکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکا کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا۔[4] (۱۸۸۱ء)

زبان ذریعہ تعلیم

سائنٹفک سوسائٹی اور تراجم جدید علوم

بانیان سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے...... سوسائٹی اس مقصد سے قائم کی کہ علوم وفنون کی

---

[1] سفرنامہ پنجاب، ص ۲۵۱ [2] ایضاً، ص ۹۲ [3] مقالات سرسید (۱۵)، ص ۵۶ [4] ایضاً، ص ۶۴

کتابیں اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوں۔[۱] (۱۸۸۱ء)

جس وقت یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اس وقت اسکے بانیوں کا یہ خیال تھا کہ عمدہ عمدہ کتابوں کے ترجمے کرنے اور یورپ کے علوم و فنون کو اپنے ملک کی زبان میں لے آنے سے ہم اپنے ملک کے لوگوں کو یورپ کی اعلیٰ درجے کی تعلیم تک پہنچا دیں گے۔[۲] (۱۸۸۷ء)

بانیان سوسائٹی کو بعد غور و تجربہ کے یقین ہو گیا کہ ملک کو بذریعہ ترجموں کے اعلیٰ درجے کی تعلیم تک پہنچانا غیر ممکن ہے اور جب تک کہ زبان انگریزی ہی میں ان کو اعلیٰ درجے تک کی تعلیم نہ دی جائے ان کا اعلیٰ درجے تک پہنچنا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔[۳] (۱۸۸۷ء)

ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ خود ہم نے...... سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی اور بہت کچھ مباحثہ اور تکرار گورنمنٹ سے کی تھی اور اب ہم اس کے برخلاف ہیں۔ ہاں' یہ بات سچ ہے...... مگر اُس زمانہ میں اور حال کے زمانہ میں زمین آسمان کا فرق ہے...... اُس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہ ایک شخص کو' جو سچے دل سے اپنی قوم و ملک کی ترقی کا خواہاں ہو' اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں' نہایت واجب اور سچا خیال ہو سکتا ہے مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے گئے اور خود زمانہ نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے۔[۴] (۱۸۸۱ء)

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ (Minute)* ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی، اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کئے' اس مضمون پر متعدد

* تحریری یادداشت، تجویز

۱۔ مقالات سرسید (۸)، ص ۴۴ ۲۔ خطبات سرسید (۲)، ص ۴۹۶ ۳۔ ایضاً، ص ۴۹۸

۴۔ مقالات سرسید (۸)، ص ۴۴-۴۵

رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اس غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔[۱] (۱۸۸۲ء)

پنجاب کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ان جدید علوم کو اپنی زبان کے ترجموں سے حاصل کرلیں گے اور یہی بنا مشرقی زبان کی یونیورسٹی قائم کرنے کی ہوئی، مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں پہلا شخص ہوں جس کے خیال میں...... یہی بات آئی تھی۔ میں نے صرف اس کو خیال ہی نہیں کیا تھا بلکہ کر کے دکھایا اور آزمایا، تجربہ کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو اَب تک زندہ ہے۔ اس میں یہی کام شروع کیا تھا تاکہ علوم اور فنون کی کتابیں اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر قوم کی تعلیم کے لئے شائع کی جائیں، مگر بعد تجربے کے معلوم ہوا کہ ان جدید علوم کا ترجمہ کر کے اپنی قوم کو سکھلانا ناممکن ہے۔[۲] (۱۸۸۴ء)

میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ اردو زبان میں کتابوں کا ترجمہ ہونا بے شک ملک کے لئے مفید ہے مگر مجھ کو یقین ہو گیا کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت، جس کی ضرورت قوم کو ہے، اور سوشل حالت کی ترقی اور حاکم و محکوم کا میل جول، جو میرے اصولوں کا منشا ہے، بغیر انگریزی پڑھنے اور یورپین سائنسز و لٹریچر میں اعلیٰ درجہ تک ترقی کئے ناممکن ہے۔[۳] (۱۸۸۹ء)

بذریعہ ترجموں کے علوم مغربی کے ہندوستان میں پھیلانے کا قصد ایک ہنسی کی بات ہے۔[۴] (۱۸۸۱ء)

جن ملکوں نے اس زمانہ میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انہوں نے تمام علوم و فنون کو اپنی زبان میں کر لیا ہے۔ مگر جن ملکوں نے ایسا کیا ہے ان میں اور ہندوستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ ان ملکوں میں ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان حکومت کرتی ہے مگر ہندوستان میں نہ ہندوستانی حکومت کرتے ہیں، نہ یہاں کی زبان حکمران ہے۔ پھر ان ملکوں پر ہندوستان کا قیاس ایک بہت بڑی غلطی ہے۔[۵] (۱۸۸۱ء)

۱۔ بحوالہ حیات جاوید (۱)، ص ۲۴۶ ۲۔ سفرنامہ پنجاب، ص ۲۴۸ ۳۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۴۰۱
۴۔ مقالات سرسید (۱۵)، ص ۶۵ ۵۔ ایضاً (۸)، ص ۳۵

ہماری حکمران زبان انگریزی ہے۔ ہم کیسی ہی کوشش کریں، ناممکن ہے کہ ہماری زبان میں علوم پھیل سکیں ترجموں کے ذریعے سے علوم پھیلنے کے لئے ترجموں کی زبان وہی حکمران زبان ملک کی ہونی چاہیے۔[۱] (۱۸۸۴ء)

اردو کی بجائے انگریزی ذریعہ تعلیم کی اہمیت

انگریزی ابتدائی سکولوں میں، جو اس غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام دیں، ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔[۲] (۱۸۸۲ء)

تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو، کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔[۳] (۱۸۸۲ء)

سمجھنے کی یہ بات ہے کہ بالفعل ہم کو ضرورت کس چیز کی ہے اور کون سی زبان، ہم کو علوم کے اعلیٰ مطالب کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ انگلش لینگویج (English Language)* ...... ہم جو کچھ ترقی کر سکتے ہیں اسی زبان کے ذریعے سے کر سکتے ہیں۔[۴] (۱۸۸۴ء)

انگریزی، قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے حاکموں کی بھی زبان ہے اور علاوہ علوم حاصل کرنے کے اور بہت سے وجوہ سے ہمارے بکارآمد ہے، ہمارے دسترس میں ہے اور اس لئے لازم ہوگیا ہے کہ ہم اسی زبان میں ان علوم کو حاصل کریں۔[۵] (۱۸۹۶ء)

ہمیں اپنی قوم کو انگریزی زبان کی، جس کو خدا نے اپنی مرضی سے ہم پر حکومت دی ہے اور جس کے جانے بغیر ہم دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے بلکہ میں کہوں گا کہ دین کی بھی خدمت نہیں کر سکتے، تعلیم دینا ہے۔[۶] (۱۸۹۳ء)

...... گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے تو جو اس قوم کی

---

* انگریزی زبان

۱۔ سفرنامہ پنجاب، ص ۲۴۹ ۲۔ بحوالہ حیاتِ جاوید (۱)، ص ۲۴۶ ۳۔ ایضاً، ص ۲۴۷
۴۔ سفرنامہ پنجاب، ص ۸۹-۹۰ ۵۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۵۶۵ ۶۔ ایضاً، ص ۲۹۰

زبان ہے اسی میں اس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے گا۔ بظاہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں کیونکہ تمام اہل یورپ اور اہل عرب نے اپنی ہی زبانوں میں علم سیکھے ہیں۔ مگر یہ رائے غلط تھی۔ کل زبانوں پر ایسا خیال کر لینا صحیح نہیں ہے، بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اس زبان میں تعلیم ہونا ممکن ہو۔[1] (۱۸۵۹ء)

اردو زبان، جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، اس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں، کیونکہ پہلی بات تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لاعلاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، حدت ذہن، سلاست فکر، ملکہ عالی، قوت ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیب و دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے، بالکل بدل دے اور اس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔ میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو [illegible] گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی [illegible] کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی [illegible] اس میں ہو سکتی ہے۔[2] ★ (۱۸۵۹ء)

★ زبان ذریعہ تعلیم کی بحث میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ سرسید اس [illegible]
(باقی اگلے [illegible])

[1] بحوالہ حیاتِ جاوید (۱)، ص ۸۵ [2] ایضاً

ہم گورنمنٹ کی اس تجویز کو، کہ تمام اعلیٰ عہدے بجز لائق انگریزی دانوں کے کسی کو نہ دیے جائیں نہایت پسند کرتے ہیں اور جہاں تک اس میں سختی ہوتی جائے ملک کا اور قوم کا اور گورنمنٹ کا سب کا فائدہ سمجھتے ہیں۔[1] (۱۸۸۱ء)

اردو ذریعہ تعلیم کی حمایت میں میرے متروک خیالات

ہم ایک مدت پہلے اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ سرکاری سررشتہ تعلیم کی یہ ضد کہ طالب علموں کے منہ میں زبردستی سے انگریزی ٹھونسیں گے، ہندوستان کی عام تعلیم کی بڑی مزاحم اور مانع ہے۔[2] (۱۸۷۳ء)

اس بات پر جو نہایت استقلال کے ساتھ اتفاق ہو رہا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم صرف انگریزی ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اس سے ہم کو اس امر کی نسبت بالکل نا اُمیدی ہوتی ہے کہ ہماری زبان مغربی علوم کی کتابوں سے رونق پائے گی۔[3] (۱۸۷۳ء)

---

* (پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)
خیالات کے حامل رہے ہیں۔ تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینے کے آغاز میں وہ اردو ذریعہ تعلیم کی مخالفت اور انگریزی کے حق میں دلائل دیتے رہے۔ اس کے برعکس سائنٹفک سوسائٹی کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کے عروج کے زمانے میں اردو کی حمایت میں کمربستہ رہے۔ کچھ عرصہ بعد ایک بار پھر انگریزی تعلیم کے حق میں اپنے سابقہ خیالات کی ترویج میں جدوجہد شروع کی جو آخر عمر تک جاری رکھی۔ درمیانی دور میں انہوں نے اردو ذریعہ تعلیم کی جس ٹھوس انداز میں وکالت کی اس کا ایک خاکہ اگلے عنوان ''اردو ذریعہ تعلیم کی حمایت میں میرے متروک خیالات'' کے تحت ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ الطاف حسین حالی اس موضوع پر سرسید کے ان ادوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانہ میں تھا وہی خیال ان کا اس وقت تھا جب کہ مراد آباد میں انہوں نے ورنیکلر سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اردو میں لکھ کر شائع کی تھی۔'' (حیاتِ جاوید (۲) ص ۳۴۶)

حوالہ زیر مطالعہ کی عبارت سرسید کے اسی اشتہار کا اقتباس ہے جس پر حالی یوں تبصرہ کرتے ہیں: ''۳۶ برس کے تجربہ سے انہیں اس قدر ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہوسکتی ہے جو دیسی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔'' (ایضاً (۱) ص ۸۶)

ذریعہ تعلیم کے بارے میں سرسید کے ان متضاد خیالات کے ادوار کی شناخت کے لئے لارڈ میکالے اور اس موضوع سے متعلق عنوانات کے تحت ان کی آراء کے ساتھ متعلقہ سال بھی درج کر دیے گئے ہیں تاکہ سرسید کے اصلی خیالات جاننے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے کیونکہ جب کسی شخصیت کے مختلف ادوار کے افکار میں تضاد پایا جائے تو اس کے آخری دور کے خیالات ہی اصل تسلیم کیے جاتے ہیں۔

[1] مقالات سرسید (۸)، ص ۴۶ [2] ایضاً، ص ۱۲۵ [3] ایضاً، ص ۱۲۶

ہماری دانست میں یہ سمجھنا بڑی غلطی ہے کہ ہندوستان کی دیسی زبان اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے مضامین ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔[۱] (۱۸۷۳ء)

اس بات پر اکثر بحث ہوئی ہے کہ سرکاری کالجوں کی تعلیم سے لیاقت کامل نہیں ہوتی اور کیوں وہ تعلیم انگلستان کے کالجوں کی تعلیم کے برابر نہیں ہے۔ پس میری رائے میں اس کا سبب یہی ہے کہ انگلستان میں تعلیم انہی لوگوں کی زبان میں ہوتی ہے اور تمام علوم وفنون انہی کی زبان میں ہیں اور ہر وقت اور ہر محل پر ان کو اپنے علم کی ترقی کا موقع ہوتا ہے برخلاف ہندوستان کے کہ ان کی تعلیم ان کی مادری زبان میں نہیں ہے اور ان کو دوسری زبان پر قادر ہونے میں نہایت مشکل پیش آتی ہے اور اس پر قادر ہونے تک تمام وقت تحصیل علوم وفنون کا گزر جاتا ہے۔[۲] (۱۸۷۲ء)

اگر علم کی تحصیل غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے کی جائے تو اس میں دو چند وقت صرف ہوتا ہے۔ اول تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر وقت کھوتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعہ سے جس کو انہوں نے حاصل کیا ہے کسی مفید علم کے تحصیل کرنے کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا۔[۳] (۱۸۶۷ء)

سرکاری مدارس کی تعلیم کے دو حال گزرے ہیں۔ ایک حال اس کا وہ تھا جو لارڈ میکالے کے انتظام سے پہلے تھا اور جس میں صرف مشرقی علوم اور مشرقی زبان کی مشرقی طریقہ پر تعلیم ہوتی تھی جس کو لارڈ میکالے نے محض بے فائدہ تصور کیا تھا اور میرے نزدیک لارڈ میکالے کی یہ رائے بالکل صحیح و نہایت درست تھی۔ لارڈ میکالے صاحب نے اس طریقہ تعلیم کو موقوف کیا اور علوم مغربی کی تعلیم کا بجائے اس کے قائم کرنا تجویز کیا۔ یہاں تک لارڈ میکالے کی تجویز نہایت صحیح و بالکل قابل تسلیم تھی مگر ان کی یہ تجویز کہ ان علوم کی تعلیم کا ذریعہ بھی انگریزی زبان ہو' صحیح نہ تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان علوم مغربی کی تعلیم کا ذریعہ ہمارے ملک کی زبان قرار نہ دی جائے۔ علمی مسئلہ کو خواہ انگریزی زبان میں بیان کرو خواہ اپنی ملکی زبان میں' دونوں کا نتیجہ متحد ہوتا ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں ''ٹو اینڈ ٹو میکس فور'' (Two and two makes four)

---

[۱] مقالات سرسید (۸)، ص ۱۱۶ [۲] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۰۳ [۳] مقالات سرسید (۸)، ص ۴۱

بھی ہوتے ہیں، پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم تمام علوم کو اپنی زبان میں نہ سیکھیں۔ فرانس، رشیا، جرمن، انگلینڈ سب ملکوں پر خیال کرلو کہ سب نے اپنی ملکی زبان میں علوم سیکھے ہیں۔ انگلستان میں اگر بجائے انگریزی کے لیٹن ★[1] (Latin) زبان تحصیل علوم کے لئے قائم رہتی تو آج انگلستان میں بہت ہی کم عالم نکلتے۔[۱] (۱۸۷۳ء)

اگر آج انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن مین یا گریک (Greek) ★[2] میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو آج تک تمام انگریز ایسے ہی جاہل اور بے علم اور لاکھوں ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آئندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے جاہل اور نالائق رہیں گے۔[۲]
(۱۸۶۹ء)

کیا اہل یورپ کی روشن ضمیری اور شائستگی اور فضل و کمال کی تعلیم ایسی زبان کے ذریعہ سے جس سے وہ ناآشنا ہیں، اور وہ ایک غیر ملک کی ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندوستان مقبوضہ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کرلیں، بہتر اور عمدہ نہیں ہوسکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جاسکے۔ یہ کب یہ ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی اس قدرت کے برخلاف عمل کرسکیں جو بابل کے مینار پر اس نے دکھائی ہے؟ پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم اور ان کا فضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لئے دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم ٹھہرایا جائے۔[۳] (۱۸۶۷ء)

تمام ترقی کا باعث انگلستان میں صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ گو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسے ہندوستان میں، علی الخصوص شمال و مغربی اضلاع اور صوبہ بہار میں،

★[1] لاطینی ★[2] یونانی

۱۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ (۱۵ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ) ص ۵۸
۲۔ مسافران لندن، ص ۱۰۰
۳۔ مقالات سرسید (۸)، ص ۶۰

اردو جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انہی کی زبان میں ان کو دئے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لئے کھود دئے جائیں:

> ''اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دئے جائیں گے، کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا۔ یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔''[1] (۱۸۶۹ء)

تعلیم کے مختلف شعبے

مشرقی علوم کی ترقی کا پھندا

کیا ہندوستان کی ترقی علوم مشرقی کی ترقی سے ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔[2]

ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم اور دیسی زبان اور دیسی علوم کو (جن کو ہم نہیں جانتے) ترقی دے کر عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کریں گے، بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکہ کے اصل باشندوں کو خیال دلائے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں (جو کچھ کہ ہوں) ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔[3]

علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی اور ہم کو کون سی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی؟[4]

میں ان پچھلے عالموں کو غور سے دیکھتا تھا کہ وہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کے عالم اس زمانے میں کس کام کے ہوں گے اور ملک کو ان سے کیا فائدہ ہوگا۔ مانا کہ وہ علم کے خزانے رکھتے ہوں مگر وہ خزانے ہمارے کس کام آئیں گے جب کہ ہماری حکمران زبان وہ زبان نہیں

---

[1] مسافران لندن، ص ۱۹۷ [2] مقالات سرسید (۱۵)، ص ۶۴ [3] ایضاً (۸)، ص ۳۶ [4] ایضاً، ص ۳۷

ہے۔ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک پتلے کے پیٹ میں بہت سی کتابیں بھر دی جائیں۔[۱]

ہم علوم مشرقی کی ترقی کے معانی نہیں سمجھتے' نہ علوم مغربی کا دیسی زبانوں کے ذریعے سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک شائع ہونا ممکن جانتے ہیں۔[۲]

مردہ علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لئے' ملک کے لئے بلکہ گورنمنٹ کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے۔[۳]

یونیورسٹی کالج لاہور کی بنیاد مردہ علوم مشرقی کو پھر زندہ کرنے کے مقصد سے قائم ہوئی تھی۔[۴]

آج تک اس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں ان لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود و فاتحہ کی روٹیوں پر گزران کر کے عربی اور فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر اس میں پیدا کیا۔مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے زیادہ ہو گئے' ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟...... لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو انٹرنس میں پاس ہونے کی سندیں عطا کی ہیں' پرافیشنسی (Proficiency)★1 اور ہائی پرافیشنسی (High Proficiency)★2 کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور ان سے ملک کو' قوم کو' اس کی دولت کو' اس کی حکومت کو' اس کی تجارت کو' اس کے اخلاق کو' اس کی روشن ضمیری کو' اس کے وسعت خیالات کو کیا فائدہ پہنچا ہے یا آئندہ پہنچ سکتا ہے؟[۵]

کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؟[۶]

ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو علوم مشرقی کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔[۷]

★1 ★2 مشرقی زبانوں کے امتحانات کے درجے، ادیب اور عالم

۱ سفرنامہ پنجاب، ص ۲۵۲ ۲ مقالات سرسید (۱۵)، ص ۶۶ ۳ ایضاً (۸)، ص ۴۹

۴ ایضاً (۱۵)، ص ۵۸ ۵ ایضاً (۸)، ص ۴۳-۴۴ ۶ ایضاً، ص ۳۸ ۷ ایضاً (۱۵)، ص ۱۲

علوم مغربی کی برتری

ہمارے ملک کو، ہماری قوم کو اگر درحقیقت ترقی کرنی اور فی الواقع ہماری ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کا سچا خیر خواہ اور وفادار رعیت بننا ہے تو اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ علوم مغربی و زبان مغربی میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرے۔[۱]

انگلستان کے علم کے خزانوں پر ہماری دسترس ممکن ہے۔ خدا نے ایک اجنبی قوم کو ہم سے ملایا ہے جس سے صاف اس کی مرضی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسی قوم کے ذریعہ سے پھر اپنے آپ کو ایک اعلیٰ درجہ کی تربیت اور شائستگی پر پہنچائیں...... مجموعی صفت اس قوم کی انسان کی بھلائی چاہنا اور سب کی ہمدردی کرنا ہے۔[۲]

ہمارے لئے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے، یورپین لٹریچر اور یورپین سائنسز میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں، جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں اور جب اس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں، اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ جنٹلمین اس کے اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں اور جو فیض تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے ان مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہو اس کو اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں میں پھیلائیں۔[۳]

جو شخص اپنی قومی ہمدردی سے اور دور اندیش عقل سے غور کرے گا وہ جانے گا کہ ہندوستان کی ترقی، کیا علمی اور کیا اخلاقی، صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست مال ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں، ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود آپ کرنی سیکھیں، ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنی محسن و مربی سمجھیں۔[۴]

---

۱ مقالات سرسید (۸)، ص ۴۸ ۲ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۴۴ ۳ مقالات سرسید (۸)، ص ۴۱

۴ ایضاً (۱۵)، ص ۲۶

دینی تعلیم کے ٹٹ پونجئے مدرسے

مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات سمائی ہے کہ علمی عبادت صرف علوم دینیہ ہی کے پڑھنے پر منحصر ہے اور اس کے سوا کسی علم کا پڑھنا یا پڑھانا یا اس پر روپیہ خرچ کرنا داخل عبادت نہیں اور اسی لئے ثواب بھی نہیں۔ ان میں یہ مثل مشہور چلی آئی ہے کہ ع

علم دیں فقہ است و تفسیر و حدیث
ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث[۱]

جب مسلمانوں میں کچھ تعلیم کی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اس بات پر مقصود ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ اس زمانہ میں اسی پرانے طریقہ پر مسلمانوں نے کئی مدرسہ تعلیم کے لئے...... جاری کئے ہیں۔[۲]

دیکھو، پنجاب میں کتنے مدارس اسلامیہ جاری ہوئے! دہلی میں اسلامی مدرسہ جاری ہوا۔ لکھنؤ میں مدرسہ ایمانیہ قائم ہوا۔ دیوبند کے مدرسے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، افتخار العلما فخر الکملا، امام اعظم عہد، شیخ زماں وصاحبین دوراں مدرس و مہتمم ہیں۔ پھر سہارن پور میں، انبیٹہ میں مدارس اسلامی موجود ہیں، غرض کہ بہت سی جگہ مدارس جاری ہیں۔ قطع نظر اس بحث کے کہ یہ کام قوم کو مفید ہیں اور قوم کو اس کی ضرورت ہے یا اس سے زیادہ اور چیزوں کی ضرورت ہے، جب ان لوگوں کے جنہوں نے یہ کام کئے ہیں اور کر رہے ہیں، دل سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ وہ یہ تمام کام اس خیالی جوش میں کر رہے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھڑیاں باندھ رہے ہیں، مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جائیں گے اور بہشت میں بڑے بڑے درجے پائیں گے، تاج ہمارے سر پر ہوگا اور ایک موتی کا محل جنت میں ملے گا، حوریں تصرف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہوگا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی، بے انتہا جتنی چاہو۔ غلمان بھی نہایت خوبصورت، معلوم نہیں تصرف یا خدمت کو ملیں گے۔ باغ ہوگا، میوہ ہوگا، نہریں ہوں گی۔ شراب ہوگی، پئیں گے اور چین کریں

---

۱ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۶۹ ۲ ایضاً، ص ۴۹۶

گے اور کہا کریں گے کہ حافظ نے کیسا غلط یہ شعر کہا تھا ع

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلی را[1]

وہ لوگ بسبب ان مقدس مولویوں کے جو اِن مدرسوں میں مصروف ہیں اور ان کی قدوسیت کا خیال لوگوں کے دلوں میں جما ہوا ہے اور نیز اس خیال سے کہ مذہبی کتابوں اور قرآن و حدیث اور عربی پڑھانے میں روپیہ، روٹی، اناج، بھس دینے میں بڑا ثواب ہوگا، ان مدرسوں میں روپیہ دیتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔ یہ کرنا ہ٘مۂ کرنے میں داخل نہیں ہے اور اس سے قومی عزت حاصل نہیں ہوتی ہے، اور اسی سبب سے ہم اس کی نہ کچھ زیادہ قدر سمجھتے ہیں اور نہ خوش ہوتے ہیں۔[2]

ہم اس بات سے خوش نہیں ہو سکتے کہ کسی جگہ چالیس طالب علم ریشائل ادھر ادھر پورب پچھم کے جمع ہو گئے اور صدرہ و شمس بازغہ پڑھنے لگے۔[3]

وہ زمانہ گیا جب طالب علم مسجدوں کے حجروں میں رہ کر اور فاتحہ و درود کی یا کسی لنگر خانہ کی روٹیاں کھا کر عالم ہوتے تھے۔[4]

کیا ان ٹٹ پونجیوں عربی مدرسوں سے، جو جا بجا قائم ہوئے ہیں، جن کے طالب علم مسجدوں میں پڑے ہوئے مانگ کر ٹکڑے کھاتے ہیں، ہماری قوم کو کچھ فائدہ اور ہماری قومی عزت ہونے والی ہے؟[5]

ایک بات بے شبہ اس قسم کی تعلیم سے ہونے والی ہے کہ کاہل اور مال مردم خوروں کا گروہ بڑھتا جائے گا۔ آج اس مسجد میں اگر دس مُلّاں خیرات کی روٹی کھانے والے موجود ہیں تو کل بیس ہو جائیں گے اور اگر آج فلاں گاؤں کی چوپاڑ میں دو مُلّا نے، بے محنت کی روٹی کھانے والے، اترے ہوئے ہیں تو کل چار موجود ہو جائیں گے۔ ان کی صورت سے گاؤں کا چودھری کانپ جائے گا اور اس کا سیر بھر خون خشک ہو جائے گا۔ دوسرے مُلّانے کی صورت دیکھ کر اپنی بیوی سے کہے گا کہ اری کلوا کی ماں، ایک اور آیا، اس کے لئے کچھ روٹی ٹکڑا دے۔[6]

---

1. تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۷۶ 2. ایضاً، ص ۵۲۱ 3. ایضاً، ص ۱۲۰
4. مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۵۴۳ 5. تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۵۲۶ 6. مقالاتِ سرسید (۷)، ص ۲۸۵

مسلمانوں کی تعلیم کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ دو چار مُلّاں کسی جگہ پڑھانے کو مقرر کر دئے جائیں اور وہی پرانی کڑکھائی کتابیں دو چار دس پانچ آدمیوں کو پڑھانے لگیں بلکہ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اول فہمیدہ فہمیدہ ذی علم اور ذی عقل لوگ جمع ہوں اور بعد بحث و گفتگو کے یہ بات قرار دیں کہ اب سلسلہ تعلیم بنظر حالات زمانہ اور بلحاظ علوم و فنون جدیدہ کے کس طرح پر قائم ہونا چاہیے اور ہماری پرانی دقیانوسی تعلیم کے سلسلہ میں کیا کیا تبدیلی اور ترمیم کرنی چاہیے' ہمارا سلسلہ تعلیم کا بلحاظ مقاصد مذہبی کس طرح پر قائم ہو اور بلحاظ مطالب دنیوی کے کس طرح جاری کیا جائے؟ اور جب کوئی طریقہ تجویز ہو لے اس وقت اس کے اجرا پر ہر ضلع کے لوگ اپنے اپنے ضلع میں سعی و کوشش کریں۔[1]

تعلیم نسواں کی حدود

باوجودیکہ بہت سی باتوں میں میری طرف نئے خیالات منسوب ہوتے ہیں لیکن عورات کی تعلیم کی نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو ہمارے قدیم بزرگوں کے تھے۔[2]

میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقہ تعلیم سے ہے، جس کے اختیار کرنے پر اس زمانہ کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔[3]

عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے اس کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ نہ وہ ہماری حالت کے مناسب ہیں اور نہ سینکڑوں برس تک ہماری عورتوں کو ان کی ضرورت ہے۔ بغیر معنی سمجھائے قرآن مجید پڑھانا' جس کو ایک حقارت سے دیکھا جاتا ہے' میری دانست میں کوئی ذریعہ اس سے زیادہ روحانی تربیت' روحانی نیکی اور توجہ ذات باری کے لئے نہیں ہو سکتا۔[4]

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں' اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۶۰ [2] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۸۱ [3] سفر نامہ پنجاب، ص ۱۰۱
[4] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۸۲

سچی تعلیم نہایت عمدہ کی ہے ان کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ میں بھی مفید ہیں۔[1]

وہ علوم...... جن کو اس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں، یورپ کی اور امریکہ کی حالت معاشرت کے خیال سے وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹرز اور ٹیلی گراف ماسٹرز یا پارلیمنٹ کی ممبر ہوسکیں لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے، نہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔ پس جو علوم کہ اُس زمانہ میں عورتوں کے لئے مفید تھے وہی اس زمانہ میں بھی مفید ہیں، اور وہ علوم صرف دینیات اور اخلاق کے لئے تھے...... میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو افریقہ اور امریکہ کا جغرافیہ سکھانے اور الجبرا اور ٹرگنامیٹری کے قواعد بتانے اور احمد شاہ اور محمد شاہ اور مرہٹوں اور دہلیوں کی لڑائیوں کے قصے پڑھانے سے کیا نتیجہ ہے۔[2]

لڑکیوں کی تعلیم کے لئے عام سکول بنانے کو، جہاں کہ عام لڑکیاں بلالحاظ اس کے کہ کس قوم و خاندان کی ہیں چادر یا برقعہ اوڑھ کر یا ڈولی میں بٹھا کر بھیجی جائیں، میں پسند نہیں کرتا۔ معلوم نہیں کہ کیسی عورتوں سے صحبت ہوگی۔ معلوم نہیں کہ کیسی لڑکیاں جمع ہوں گی، معلوم نہیں کہ ان کا طرز کیسا ہے، گفتگو کیسی ہے؟ مگر میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ اشراف لوگ جمع ہو کر اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا ایسا انتظام کریں جو نظیر ہو پچھلی تعلیم کی، جو کسی زمانے میں ہوتی تھی۔ کوئی شریف خاندان کا شخص یہ نہیں خیال کرسکتا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم دے کہ ٹیلی گراف آفس میں سگنلر ہونے کا کام دے یا پوسٹ آفس میں چٹھیوں پر مہر لگایا کرے۔ عورتوں کی تعلیم نیک اخلاق، نیک خصلت، خانہ داری کے امور، بزرگوں کا ادب، خاوند کی محبت، بچوں کی پرورش، مذہبی عقائد کا جاننا ہونی چاہیے، اس کا میں حامی ہوں اس کے سوا اور کسی تعلیم سے بےزار ہوں۔[3]

عورتوں کی تعلیم کے لئے مدرسوں کا قائم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا ہندوستان کی موجودہ حالت کے کسی طرح مناسب نہیں ہے اور میں اس کا سخت مخالف ہوں۔[4]

اس وقت ہم تمام یورپ کی تعلیم یافتہ ملک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب

---

[1] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۰۳ [2] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۸۴ [3] خطبات سرسید (۲)، ص ۲۷۹
[4] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۸۱

مرد لائق ہو جاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں' جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے' اسی کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔[1]

عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا...... مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے...... جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور بالضرور ایک زبردست' گو خفیہ' اثر پہنچے گا۔[2]

میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورات کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جائے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔[3]

پس بالفعل عورتوں کو ایسا رکھنا چاہیے کہ اگر ان کے شوہر مہذب ہوں تو ان کو مہذب کر سکیں اور اگر نامہذب ہوں تو ان کی بیویاں بھی ویسی ہی ہوں۔[4]

اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع جائے گی۔[5]

ٹیکنیکل تعلیم کی غیر افادیت

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اگر اس سے مراد حرفوں کی تعلیم ہے' جیسے توہاری' نجاری' نوربافی وغیرہ وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں کیونکہ اس قسم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہندوستان میں نہیں ہے۔[6]

---

[1] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۴۷۵ [2] بحوالہ حیاتِ جاوید (۱)، ص ۲۵۲-۲۵۳ [3] مکتوباتِ سرسید، ص ۳۸۰
[4] ایضاً، ص ۳۸۱ [5] بحوالہ حیاتِ جاوید (۱)، ص ۲۵۳ [6] آخری مضامین، ص ۱۴۰

ٹیکنیکل تعلیم کی خواہش اس ملک میں ہوتی ہے جہاں پرائیویٹ ہر قسم کے کارخانوں کی کثرت ہو اور ان کے لئے ٹیکنیکل تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی ضرورت ہو۔ کارخانوں کے قائم ہونے کو سرمایہ کی ضرورت ہے جو ہندوستان میں نہیں ہے۔ پس ٹیکنیکل تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی کھپت ہندوستان میں نہیں ہو سکتی اور اس لئے اس کی خواہش ملک کو نہیں ہے۔ یہ غلط خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب ٹیکنیکل تعلیم یافتہ لوگ ہوں گے تو کارخانے بھی قائم ہو جائیں گے کیونکہ یہ خیال ایسی فلاسفی پر مبنی ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ مرغی پہلے تھی یا مرغی کا انڈا۔[۱]

ٹیکنیکل کارخانوں کا جیسا کہ ہندوستان میں قائم ہونا مشکل بلکہ نہایت مشکل ہے، اسی طرح ان سے ملک کو فائدہ پہنچنا بھی مشکل ہے۔[۲]

یورپ کے ملکوں کا قیاس ہندوستان پر نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں ہر قسم کے متعدد کارخانے موجود ہیں اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں سائنسز کی تعلیم دینا فائدہ سے خالی نہیں...... مگر ہندوستان میں اس قسم کے کارخانے نہیں ہیں اور نہ ابھی ان کے ہونے کی توقع ہے۔ پس سائنسز جاننے والا بجز اس کے کہ سائنسز کا عالم ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور کوئی ذریعہ معاش حاصل نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ ڈاکٹری، انجینئری، نقشہ نویسی وغیرہ کی، جو ٹیکنیکل ایجوکیشن یا سائنسز میں داخل ہیں، بقدر اس ملک کے تعلیم دیتی ہے اور اس ذریعہ سے وہ لوگ معاش بھی پیدا کرتے ہیں، مگر اس سے زیادہ تعلیم کی نہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں گنجائش ہے اور نہ وہ اس تعلیم سے کچھ معاش پیدا کر سکتے ہیں۔ بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشل حالت کی درستی کی ہے جو ابھی تک نہیں ہوئی یا پورے طور پر نہیں ہوئی۔[۳]

ہم نہایت خوش ہیں کہ ملک میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ترقی کے لئے جو مناسب تجویزیں ہوں ان کو عمل میں لایا جائے بشرطیکہ ہماری لٹریری (Literary)* تعلیم میں کچھ خلل واقع نہ ہو اور ایسی کوئی تدبیر یا تبدیلی تعلیم میں نہ اختیار کی جائے جو ہم کو برخلاف ہماری خواہشوں کے اور ہم کو مجبور کر کے اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم کی ترقی سے محروم کیا جائے۔[۴]

---

* کتابی

۱۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۶۴۳ ۲۔ ایضاً، ص ۴۶۴ ۳۔ آخری مضامین، ص ۱۴۱

۴۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۴۶۸

ادنیٰ اور چھوٹے مدرسوں سے قومی نقصان

جن بزرگوں نے..... متعدد جگہ چھوٹے چھوٹے سکول بے ثبات چندہ کے بھروسے پر قائم کیے ہیں اور مسلمان بچوں کے غول بھرے ہیں ان سکولوں کی حقارت کرنا یا ان کو غیر ضروری قرار دینا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان سے جو نفع قوم کو پہنچتا ہے اور جو نقصان قوم کا ان سے ہوتا ہے ان دونوں کا اندازہ کیا جائے..... وہ لوگ نیک نیتی اور قومی ہمدردی میں یہ سمجھتے ہیں کہ غریب لوگوں اور بے مقدوروں کے بچوں کو فائدہ پہنچے اور عام تعلیم سے لوگ فائدہ اٹھائیں مگر اس میں دو طرح کی غلطی ہے۔ اوّل، یہ کہ جب تک اعلیٰ قوموں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہوتی، ادنیٰ قوموں اور غریب لوگوں میں ہرگز تعلیم نہیں پھیل سکتی۔ دوم، یہ کہ جب تک اعلیٰ درجہ کی تعلیم ملک میں موجود نہیں ہوتی، ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا پھیلنا ناممکن ہے۔ دنیا کے کسی حصہ ملک کی تاریخ سے ثابت ہوا ہے کہ بدوں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے شائع ہوئے ادنیٰ درجہ کی تعلیم پھیلی ہو؟ قدرت کا قاعدہ ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کی پیروی کرتا ہے، کبھی اعلیٰ ادنیٰ کی پیروی نہیں کرتا..... جو لوگ اپنی کوششیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر متوجہ نہیں کرتے اور ادنیٰ پر مصروف کرتے ہیں وہ اُلٹی گنگا بہاتے ہیں جس میں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔[1]

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان چھوٹے سکولوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم دے کر لوگوں کو تیار کرتے ہیں تاکہ وہ کسی سکول یا کالج میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانے کے لئے داخل ہو سکیں اور اس خیال سے بہت سے بزرگوں نے جا بجا پرائمری اور اپر پرائمری، مڈل اور بعض مقاموں میں انٹرنس تک کے سکول قائم کیے ہیں..... انہوں نے ایسا کرنے سے اس مقدم امر سے، جس کو میں نے مقدم قرار دیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم ترقی سے بالکل غفلت کی ہے۔[2]

ہم کو کسی سکول کے قائم کرنے کا ارادہ نہیں (کرنا) چاہیے جب تک کہ ہم انٹرنس کلاس کی پڑھائی کا سکول نہیں قائم کر سکتے اور جس میں ایک نہایت عمدہ اور لائق پورا جنٹلمین یورپین

---

[1] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۳۴-۳۳۵ [2] ایضاً، ص ۳۳۶

ہیڈ ماسٹر مقرر نہیں کر سکتے ...... اس درجہ سے کم تر درجہ کا سکول قائم کر کے بچوں کو اس میں پھنسانا قومی نقصان کا باعث ہے۔[1]

بلاشبہ میری رائے ہے کہ ایسے سکول جو انٹرنس تک پڑھاتے ہیں یا پڑھانا چاہتے ہیں اور جس میں ہیڈ ماسٹر ایک یورپین جنٹلمین نہیں ہے، بہت ناقص سکول ہیں اور طالب علموں کو ناقص رکھتے ہیں، خواہ وہ سکول گورنمنٹ کے ہوں یا مشنریوں کے یا پرائیویٹ لوگوں کے۔[2]

تعلیم کے باب میں چھوٹے چھوٹے سکولوں سے، خواہ وہ گورنمنٹ کے ہوں یا پرائیویٹ ہوں، کچھ نہیں ہو سکتا۔ ادنیٰ درجہ کی تعلیم کی نسبت میں صاف کہتا ہوں کہ آپ نے پرانی مثل سنی ہوگی کہ "نیم ملا خطرہ ایمان و نیم حکیم خطرہ جان"۔ یہی حال ادھوری تعلیم کا ہوگا۔[3]

غریب لڑکوں پر مشتمل مدرسوں میں انگریزی تعلیم دینے کا غلط خیال

ایسے مدرسہ میں ...... انگریزی پڑھانے کا خیال ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ہماری قوم میں انگریزی زبان اور انگریزی علوم کی تعلیم کی شدید ضرورت ہے، ہماری قوم کے سرداروں اور شریفوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دیں۔ مجھ سے زیادہ کوئی شخص نہ نکلے گا جو مسلمانوں میں انگریزی علوم کی ترقی دینے کا حامی اور خواہش مند ہو مگر ہر امر کے لئے موقع اور محل ہے ...... جس حیثیت و درجہ کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہونے کا۔ ان کو اسی قدیم طریقہ عام تعلیم میں مشغول رکھنا ان کے حق میں اور ملک کے حق میں اور قوم کے حق میں زیادہ تر مفید ہے ......

مناسب حال یہ ہے کہ ...... ان لڑکوں کو کچھ لکھنا پڑھنا اور ضروری کارروائی کے موافق حساب کتاب آجائے اور ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے ان کو پڑھائے جائیں جن سے نماز روزہ کے ضروری ضروری مسائل، جو روزمرہ پیش آتے ہیں، اور مسلمانی مذہب کے سیدھے سادے عقائد ان کو معلوم ہو جائیں۔[4]

---

[1] مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۲۸ [2] ایضاً، ص ۳۴۱ [3] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۱۴
[4] مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۱۸۵-۱۸۶

غریب لڑکوں میں اشاعت تعلیم کی بے فائدہ کوششیں

تعلیم کے متعلق صرف دو قسم کے خیالات ہیں۔ ایک اشاعت کرنا اعلیٰ درجے کی تعلیم کا جو بلاشبہ ایک محدود گروہ کو یا قلیل گروہ کو نصیب ہوگی، دوسرے اشاعت کرنا عام تعلیم کا جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اور غریب گروہیں اور غریبوں کے لڑکے اس سے فائدہ اٹھائیں اور گروہ کے گروہ اور غول کے غول ایسے پیدا ہو جائیں جو شد بد سے واقف ہوں۔ جہاں تک مجھ کو اپنی قوم کے بزرگوں سے موقع ملا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے خیالات اس پچھلی قسم کی تعلیم کی طرف زیادہ مائل ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی سے تعلیم کا ایسا طریقہ چاہتے ہیں جس سے غریب آدمی بھی فائدہ اٹھا سکیں...... بلاشبہ مجھ کو افسوس ہے کہ نیک نیت کوششیں جو قبل از وقت ہماری قوم کے بزرگ دوسری قسم کے خیالات سے کرتے ہیں یا وہ سب ضائع ہونے والی ہیں یا قوم کے عروج کے لئے سب بے سود ہیں۔[1]

جو لوگ غریب لوگوں میں یا ادنیٰ درجہ کی تعلیم کے رواج کے خواہاں ہیں ان کا سب سے اول یہ فرض ہے کہ اپنی قوم میں اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے پیدا کرنے کی کوشش کریں، ادنیٰ درجہ کی تعلیم غریب لوگوں میں رفتہ رفتہ از خود پھیل جائے گی۔[2]

دہقانوں کے گروہوں کو، جو دیہات وغیرہ میں رہتے ہیں، دیسی زبانوں میں بدرجہ اعتدال تعلیم کی جائے اور صرف لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے...... یہ لوگ جو بہت محنت اور مشقت اور سختی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے ان کی جسمی تربیت کے واسطے یہ طریق زندگی ہی کافی وافی ہے اور کچھ سکھانے سمجھانے کی حاجت نہیں۔[3]

جدید تعلیم کے منفی پہلو

یونیورسٹیوں کی پست تعلیم

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی دو یونیورسٹیاں ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں‘‘

۱؎ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۳۷ ۲؎ ایضاً، ص ۳۳۵ ۳؎ ایضاً، ص ۳۶-۳۷

بلاشبہ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہیں مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے' بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔[۱]

زیادہ افسوس یہ ہے کہ جو لیاقت بنگالی بی اے اور ایم اے کو حاصل ہوتی ہے وہ بدقسمتی سے مسلمان بی اے اور ایم اے کو حاصل نہیں ہوتی۔ کیا آپ ہم کو کوئی ایسا مسلمان بتا سکتے ہیں جس میں ایسی لیاقت ہو کہ اگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی انگریزی اخبار جاری ہو تو اس لیاقت سے ایڈیٹری کر سکے کہ اس کے لکھے ہوئے مضامین کو' اس کی عبارت کو' اس کے طرزِ تحریر کو انگریز پسند کریں اور ان پر اثر ڈالے اور انگریزوں کو اس کے پڑھنے کا شوق ہو اور مسلمانوں کے مقاصد اس سے پورے ہو سکیں؟ صد افسوس میری صاف گوئی پر جو میں نہایت دل سوزی سے کہتا ہوں' میرے دوست مجھ کو معاف کریں گے' کہ جو مسلمان ولایت میں بھی تعلیم پا کر آئے ہیں وہ بھی قوم کے لئے اپنے ساتھ علوم و فنون و لٹریچر کیا چیز لائے ہیں؟[۲]

یونیورسٹی اپنے امتحانوں میں طالب علموں کی اصلی استعداد' ان کی اخلاقی تعلیم و تربیت سے کچھ غرض نہیں رکھتی' صرف اپنے سوالات کے جوابوں سے غرض رکھتی ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ ممتحن ان جوابوں کے نمبر دینے میں کہاں تک غور کرتے ہیں۔ پس اس صورت میں کالج بجز اس کے کہ اپنے طالب علموں کو طوطے کی طرح یاد کرا کے امتحان کے لئے تیار کریں اور کیا کر سکتے ہیں؟ یونیورسٹی تمام ملک کی تعلیم پر پورا اقتدار رکھتی ہے اور وہی تعلیم کو اچھا یا برا کر سکتی ہے۔ کالجوں کو' جو اس کے ماتحت ہیں' کچھ اختیار نہیں ہے یا بہت ہی کم اختیار ہے۔[۳]

یونیورسٹی کی تعلیم کی ایسی مثال ہے کہ ایک ان گھڑ پتھر کو لے کر مورت کے ڈول میں بنائے مگر اس پر پالش یا چمک دمک ہونی' جس سے لوگ اس کو پسند کریں یا اس کے خواہاں ہوں' صرف تربیت سے ہوتی ہے۔ یہ تربیت اگر بچپنے سے ہو تو زیادہ موثر ہوتی ہے۔ بڑے ہونے کے بعد' جب تک نہایت قوی اثر نہ ہو' مشکل سے ان امور میں طبیعت موثر ہوتی ہے مگر تمام یونیورسٹیاں اور کالج اس قسم کی مطلق تربیت نہیں دیتے ہیں۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں اس کا

۱۔ آخری مضامین، ص ۱۳۸ ۲۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۵۱۲ ۳۔ بحوالہ مجموعہ لکچرز، محسن الملک، ص ۳۲۸

خیال کیا گیا ہے اور کچھ کچھ نتیجہ بھی حاصل ہو چلا ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جیسا چاہیے وہ مقصد پورا پورا حاصل ہو گیا ہے۔[۱]

یونیورسٹی کی ڈگریاں ہم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے کافی نہیں۔ یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالجوں کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی مثال ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہے اس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں..... ہماری پوری تعلیم اس قوت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلا دیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں میں اور کلمہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔[۲]

سیاسی ایجی ٹیشن

ہندوستان میں جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم کہلائی جاتی ہے وہ درحقیقت اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ صرف ایک ادنیٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے مگر جہاں کسی نے کوئی ڈگری یونیورسٹی سے پائی اس نے سمجھ لیا کہ اب میں بہت بڑا عالم ہو گیا...... ناواجب آزادی کو وہ اپنا ایمان بناتا ہے اور یہ سمجھتا بھی نہیں کہ آزادی کیا چیز ہے۔ حب الوطنی کا بہت جوش اُس کے دل میں اُٹھتا ہے مگر وہ نہیں سمجھتا کہ حب الوطنی کیا چیز ہے اور کیونکر ہوتی ہے۔ پالیٹکس (Politics)* میں جو ایک بڑا اور عمیق فن ہے اس میں تو وہ اپنے تئیں لاثانی سمجھتا ہے...... یہ باتیں صرف ان ہی لوگوں میں نہیں ہوتیں جنھوں نے یونیورسٹی کی کوئی ڈگری پائی ہے بلکہ ان طالب علموں میں بھی جنھوں نے اے بی سی ڈی شروع کی ہے یہ سب باتیں دیکھا دیکھی ان میں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ شور و شغب کرنا اور گورنمنٹ کی ہر بات میں مخالفت کرنا اور ملک میں غل مچاتے پھرنا ان کا شیوہ ہو جاتا ہے جیسے کہ اس زمانہ میں کانگرس والوں کا شیوہ ہے۔[۳]

---

* سیاست

۱ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۵۱۳ ۲ خطباتِ سرسید (۲)، ص ۲۷۶ ۳ آخری مضامین، ص ۶۳-۶۴

پہلے تو انہوں نے اپنے تئیں اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا اسٹیٹس مین (Statesman) یعنی مدبر امور سلطنت سمجھ لیا' پھر اس بات کے درپے ہوئے کہ انگلش گورنمنٹ جس طرح کہ یورپ میں حکومت کرتی ہے اسی طرح ہندوستان میں حکومت کرے اور گورے کالے اور فاتح مفتوح میں کچھ فرق نہ سمجھے۔ پھر انہوں نے اس تعلیم سے ایک لفظ آزادی کا سیکھا اور اس کے معنی یہ سمجھے کہ جو کچھ منہ میں آئے یا خیال میں گزرے' بلحاظ اس بات کے کہ وہ صحیح ہے یا غلط' موقع ہے یا بے موقع، اس کی تائید کے لئے کافی دلیلیں ہیں یا نہیں' اس سب کو کہنا اور چھاپنا اور تمام ہندوستان میں شائع کرنا ہے۔ پھر انہوں نے ایک لفظ ایجی ٹیشن (Agitation) * کا سیکھا اور کہا کہ دیکھو' آئرلینڈ والے کیسا ایجی ٹیشن گورنمنٹ کی تجویزوں پر کرتے ہیں' انجمنیں اور سوسائٹیاں ایجی ٹیشن کے لئے بناتے ہیں اور اسپیچوں میں اور تحریروں میں جو کچھ چاہتے ہیں، کہتے ہیں۔ پھر ان کے خیال میں گزرا کہ انگریزی گورنمنٹ اسی قسم کی گورنمنٹ ہے کہ وہ عام ایجی ٹیشن سے ڈرتی ہے اور جب تک ایجی ٹیشن نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی مطلب انگلش گورنمنٹ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ سمجھے کہ ایجی ٹیشن جب تک عام نہ ہو اور عام رعایا یا ملک کے باشندے ایجی ٹیشن پر متفق نہ ہوں اس وقت تک نہ ایجی ٹیشن ہوسکتا ہے اور نہ مفید ہوتا ہے' انہوں نے ایجی ٹیشن کے عام کرنے پر کوشش شروع کی۔[1]

پولٹیکل ایجی ٹیشن...... جو انگریزی خواں طالب علموں نے گورنمنٹ کے مقابلہ میں' جس کے سایہ عاطفت میں ہم بآرام زندگی بسر کرتے ہیں اور جس کے پرامن زمانہ میں ہم اپنی قوم کو ہر طرح کی ترقی دے سکتے ہیں' اختیار کئے ہیں۔ یہ نوجوانان انگریزی خواں ایک ہلدی کی گرہ پا کر پنساری ہونے کے مدعی ہیں۔ نہ پالیٹکس کے اصول سے واقف ہیں' نہ اس پر غور کی ہے' نہ دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف ہیں' نہ ان کو کبھی دیکھا ہے اور بے سروپا باتوں اور گورنمنٹ کی پالیسی کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ اور میں کامل یقین سے کہتا ہوں کہ ایسے ایجی ٹیشن ملک کے لئے، اور اگر مسلمان اس میں شریک ہوں تو بالتخصیص مسلمانوں کی قوم کے لئے، نہایت مضر بلکہ قوم کو برباد کرنے والے ہیں۔[2]

---

* تحریک۔ ہلچل

[1] آخری مضامین، ص ۷۶ [2] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۵۳۹

جو لوگ ایجی ٹیشن کی مخالفت کرتے ہیں ان کی نسبت ایجی ٹیشن کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کی خوشامد کرتے ہیں۔ ان کا جو دل چاہے کہیں مگر ایجی ٹیشن سے مخالفت کرنے والے اپنے دلی یقین سے یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ اگر ان ایجی ٹیشن کرنے والوں کی درخواستیں منظور کرلے (حالانکہ ایسا ہونا ناممکن ہے) تو ہندوستان کے انتظام اور اس کے امان و امان میں خلل عظیم واقع ہوگا اور اسی یقین پر وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں، نہ گورنمنٹ کی خوشامد سے۔[1]

ہمارے نزدیک جو حالت، جہالت اور بے تعلیمی کی بالفعل مسلمانوں کی ہے، جو نہ ملکی انتظام سے واقف ہیں اور نہ اپنی حالت آئندہ کو سمجھ سکتے ہیں، اس کے سبب سے زیادہ تر اندیشہ تھا کہ وہ بھی اسی طوفان بدتمیزی میں طوفان زدہ لوگوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ لیکن جب ان میں اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ کثرت سے ہو جائیں گے اور اپنے ملک کی حالت کو دیکھیں گے جس میں مختلف قومیں بستی ہیں اور جن کی اغراض اور سوشل حالت مختلف ہے، اور اپنی قوم کی آئندہ حالت کو سوچیں گے تو ممکن نہیں ہے کہ اس طوفان بے تمیزی میں شامل ہوں۔ اس وقت جو چند تعلیم یافتہ مسلمان اس طوفان بے تمیزی میں شامل ہو گئے ہیں (وکیل یا بیرسٹر) انہوں نے اپنے ذاتی فائدہ پر نظر کی ہے اور اپنے ذاتی فائدہ پر ملکی اور قومی فائدہ کو قربان کر دیا ہے۔ ایک یا دو ایسے بھی ہیں جو دل سے اور سچائی سے ان طوفان زدہ لوگوں کے ساتھ شریک ہیں مگر ان کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو فاروقی شیخ تھا اور شیعہ ہو گیا اور اس نے کہا کہ گو مجھے اپنے باپ دادا پر تبرا کرنا پڑے گا مگر میں تو شیعہ ہی ہوں گا۔[2]

پولیٹیکل امور میں پڑنا کسی کالج کے طالب علموں کا کام نہیں ہے بلکہ ان کو اپنے تحصیل علوم میں مشغول رہنا چاہیے۔ پولیٹیکل امور ایسے نازک اور باریک ہیں کہ بڑی معلومات اور وسیع علم اور بہت سے تجربوں کے بعد اس میں رائے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ جن کی معلومات نہایت محدود ہیں، جن کا علم ابھی کچا ہے وہ کیا رائے اس کی نسبت لگا سکتے ہیں؟...... مگر ہم کو اپنے کالج کے مسلمان طالب علموں سے ایسی توقع نہیں ہے۔ ان کو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوتی ہے۔ وہ ہر گورنمنٹ کی مخالفت پر کمر نہیں باندھیں گے اور گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھیں گے اور

---

[1] آخری مضامین، ص ۷۸
[2] مقالات سرسید (۱۵، ص ۱۶۵

جانیں گے کہ گورنمنٹ کو کیا کیا مشکلیں پیش آتی ہیں، کس خوبی اور عمدگی سے ان کو حل کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے رعایا کی آسودگی اور بہبودی اور خوش حالی میں کوشش کرتی ہے! اور اگر ہم زیادہ تر لائق، زیادہ تر وفادار، زیادہ قابل اطمینان گورنمنٹ کے ہوں گے تو زیادہ آسائش سے بسر کریں گے۔[۱]

اسلام اور اپنے بزرگوں کے ادب کا ترک

تمام اخلاق اور صفات انسانی کا مجموعہ اور تمام لب لباب خدا کی مخلوق کے پیدا ہونے کے مقصد کا ان پانچ حرفوں میں ہے جس کو ہم ''اسلام'' کہتے ہیں...... مجھے نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہے جب کہ میں دیکھتا یا سنتا ہوں کہ ہماری قوم کے بعض لڑکے...... جو انگریزی پڑھنا شروع کرتے ہیں، اس کا پورا پورا ادب نہیں کرتے۔ جو سوشل اور اخلاقی صفات یورپین میں ہیں وہی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اگر ہم صدیوں تک کوشش کریں تو شاید وہاں تک پہنچیں مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے نوجوان ان کی خوبیوں کا تو دھیان تک نہیں کرتے اور ان میں جو عیب ہیں ان کو اختیار کر لیتے ہیں...... بزرگوں سے بے پروائی سے پیش آنے لگے، ماں باپ کا ادب جیسا چاہیے اس قدر بجالانا چھوڑ دیا، اپنے سے عمر میں جو بڑا ہے اس کا اور اپنے بزرگوں کے دوستوں کا لحاظ ترک کر دیا۔ یہ تمام باتیں نہایت رنج دہ ہیں۔[۲]

مذہبی بداعتقادی

اب تو گویا بالاتفاق تمام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ کے سیکھنے سے مسلمان اپنے عقائد مذہبی میں سست ہو جاتے ہیں بلکہ ان کو لغو سمجھنے لگتے ہیں اور لامذہب ہو جاتے ہیں اور اسی سبب سے مسلمان اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھانا نہیں چاہتے۔ مسلمانوں پر کیا موقوف ہے، انگریز بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں، جو...... انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت لکھی ہے، یہ فقرہ مندرج فرمایا ہے:

۱۔ آخری مضامین، ص ۶۵-۶۶ ۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۹۱-۳۹۲

''کوئی نوجوان' خواہ ہندو خواہ مسلمان' ایسا نہیں ہے جو ہمارے انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائے اور اپنے بزرگوں کے مذہب سے بداعتقاد ہونا نہ سیکھے۔ ایشیا کے شاداب اور تروتازہ مذہب جب مغربی (یعنی انگریزی) علوم کی سچائی کے قریب آتے ہیں' جو مثل برف کے ہے' تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔''

آمنا و صدقنا' یہ قول ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا بالکل سچ اور بتمامہ سچ ہے۔[1] ★

بڑے بڑے معمم و مشمل قدوس عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ و اصول و تفسیر و حدیث و علم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائی جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں اور علوم غربیہ کے ریلے میں بہہ نہ جائیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ...... یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج کر نہیں سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جائیں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بداعتقادی پھیلے گی اس لئے کہ سوائے قرآن مجید کے جس قدر کتب مذہبیہ اس زمانہ تک موجود ہیں' ہزاروں غلطیوں سے معمور ہیں۔ کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی عظیم الشان غلطی موجود نہ ہو اور جس نے اسلام کی سچی اور صحیح سیدھی سادی حقیقت کو وہمی اور خیالی نہ بنا دیا ہو...... ایسی حالت میں ان کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مسلمان ہونے اور بہشت میں جانے کو خدا کو ایک و پیغمبر کو برحق جاننا کافی ہے' عمل کو

★ سرسید ۱۸۸۴ء میں جب پنجاب کے دورہ پر گئے تو لدھیانہ میں وہاں کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منشی حکیم الدین سے ان کی متعدد مسائل پر گفتگو ہوئی۔ سرسید کے ہم سفر سید اقبال علی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے والے مضامین کے ضمن میں ان کی گفتگو کے آخری حصہ کی روئداد یوں قلم بند کرتے ہیں: ''سید صاحب نے کہا کہ جو شبہات علومِ جدیدہ اور انگریزی علوم کی ترویج کے سبب پیدا ہوتے ہیں اور جو مذہب اسلام کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں ان کا حل کرنا اور ان کو بیان کرنا ضرور ہے۔ منشی صاحب نے کہا کہ جب اس قسم کے شبہات لوگوں کو ہوں اس وقت ضرورت ان کی نسبت لکھنے کی ہو سکتی ہے مگر وہ شبہات خود آپ پیدا کرتے ہیں۔ سید صاحب نے کہا ''معاف فرمایئے' وہ شبہات میں پیدا نہیں کرتا بلکہ ہزاروں کے دلوں میں وہ شبہات موجود ہیں اور کوئی شخص انگریزی پڑھا ہوا یا علوم جدیدہ کا جاننے والا یا ادھر ادھر سے سننے والا ایسا نہیں ہے کہ جس کے دل میں وہ شبہات نہ ہوں۔'' (سفرنامہ پنجاب' ص ۸)

[1] تہذیب الاخلاق (۲)' ص ۱۹۲-۱۹۳

نماز پڑھ لینی اور روزہ رکھ لینا بس ہے' ان غیر مفید کتابوں کے پڑھنے سے کیا حاصل ہے؟[۱]

ہماری رائے یہ ہے کہ یا تو مطلق تعلیم مذہبی درس میں داخل نہ کی جائے' صرف زبانی چند مسئلہ توحید و رسالت اور طریقہ صوم و صلوٰۃ سکھا دینے پر اکتفا کیا جائے جیسا کہ اس زمانہ میں عموماً اشراف خاندان کے لڑکوں بلکہ دھنوں' جولاہوں تک کے لڑکوں کو سکھائے جاتے ہیں' اور اگر داخل کیا جائے تو کتب مذہبی اصلاح کر کے' اور جو جو غلطیاں ان میں مصنفوں کی رائے اور اجتہاد سے واقع ہوئی ہیں اور دراصل مذہب اسلام اس سے پاک اور بری ہے' ان کو صحیح کر کے درس میں داخل کی جائیں۔[۲]

شیطانیت کی صفت

تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی اُمید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔ جس کو نہایت سعادت مند سمجھا اخیر وہ شیطان معلوم ہوتا ہے۔[۳]

۱۔ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۹۲-۱۹۴ ۲۔ بحوالہ مجموعہ لکچرز محسن الملک، ص ۳۶۸

۳۔ خطوط سرسید، ص ۱۴۱
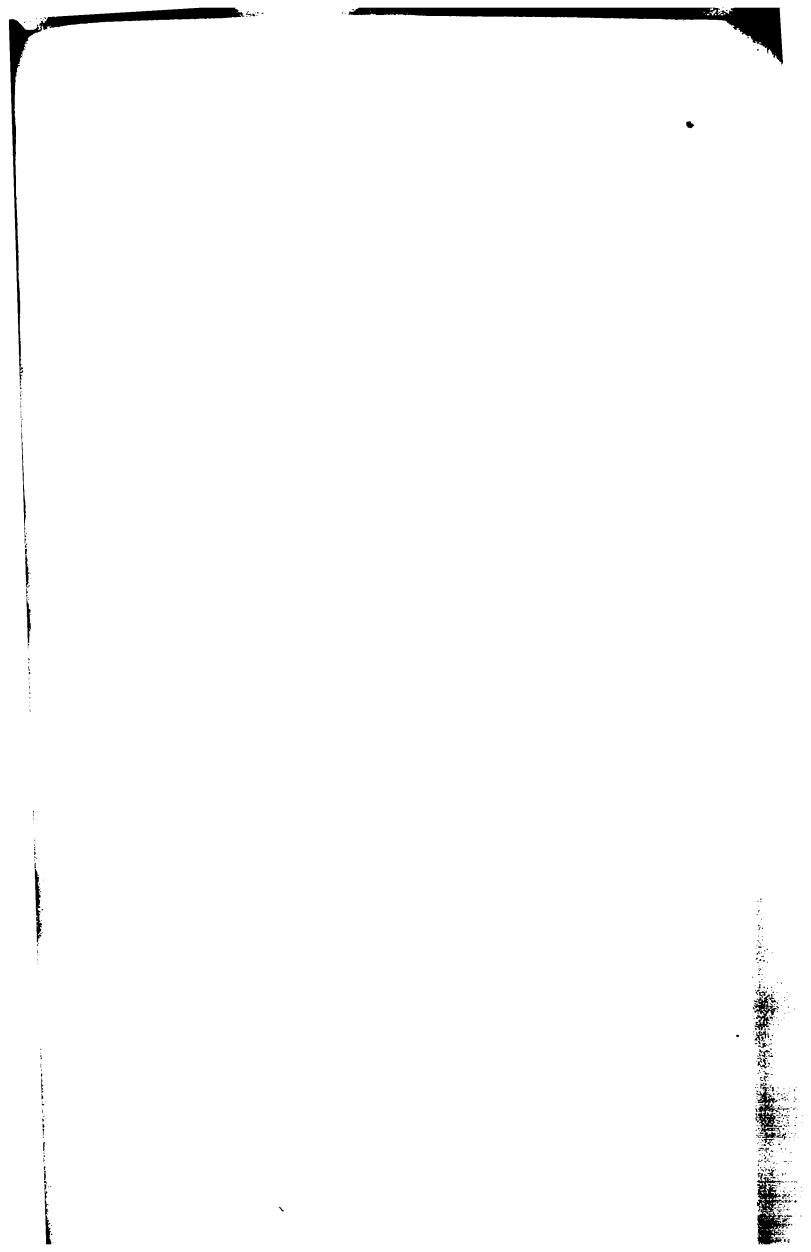
سیاسی وتاریخی افکار

مملکت کے مسائل

فقہ اور انتظام سلطنت

......تمام لوگوں کے خیالوں میں یہ غلط مسئلہ جم گیا کہ مذہب اسلام تمام دنیوی امور سے بھی متعلق ہے اور کوئی دنیاوی کام بے سند یا اجازت مذہبی کے نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ جو مسائل علما نے اپنے اجتہاد و قیاس سے و بلحاظ حالات، وقت و عادت اہل زمانہ یا رواج ملک قرار دئے تھے اگر وہ مسائل رتبہ میں بطور رائے ایک عالم یا جج یا مفتی و قاضی کے رہتے تو کچھ نقصان نہیں تھا مگر نقصان یہ ہوا کہ وہ عین مذہب اسلام کے مسائل قرار پا گئے اور سوائے پیغمبر خدا صلعم کے اور بہت سے لوگوں کو مرتبہ شارع ہونے کا مل گیا۔ تیسرے یہ کہ اب ان مسائل کے برخلاف کرنا خلاف مذہب اسلام کے تصور ہوا۔[1]

جب یہ خیال جما کہ مسائل مذکورہ عین مذہب اسلام ہے تو ضرور ہوا کہ اس کو خدا کا دیا ہوا مانا جائے۔ اور جب خدا کا دیا ہوا مانا گیا تو ضرور ہوا کہ اس کو کافی اور کامل سمجھا جائے۔ اس خیال نے اس بات پر مائل کیا کتب فقہیہ واسطے سیاست ملکیہ کے بالکل کافی ہیں اور اب ہم کو نہ سول کوڈ (Civil Code)★1 کی ضرورت ہے نہ سول پریسجر (Civil Procedure)★2 کی، نہ کریمنل کوڈ (Criminal Code)★3 کی ضرورت ہے، نہ کریمنل پریسجر (Criminal Procedure)★4 کی، نہ ریونیو کوڈ (Revenue Code)★5 کی

★1 غیر فوجداری مجموعہ قوانین ★2 غیر فوجداری قوانین کا طریق کار ★3 غیر قانونی افعال سے متعلق مجموعہ قوانین ★4 غیر قانونی افعال سے متعلق ضوابط کا طریق کار ★5 محاصل آمدنی سے متعلق [illegible]

1 تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۱۴۹

ضرورت ہے نہ ٹریڈ کوڈ (Trade Code)* کی حالانکہ کتب موجودہ فقہیہ ان میں سے ایک کے لئے بھی کافی نہیں ہیں۔ ان تمام نقصوں نے کل سلطنت ہائے اسلامیہ کو ڈبو دیا اور غارت و برباد کر دیا۔[۱]

قبول کرو کہ علمائے متقدمین اسلام بڑے عالم تھے، بڑے ذہین تھے، بڑے فلسفی تھے، بڑے منتظم تھے مگر جو کچھ کہ انہوں نے دنیوی امور کی نسبت کیا اور لکھا، وہ اُس زمانہ کی حالت کے نہایت مناسب تھا اور یہی سبب تھا کہ اس زمانہ میں سب سے مقدم اور سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑے فتح مند تھے مگر زمانہ روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے، نئے نئے علوم، نئے نئے فنون، نئے نئے طریقہ تجارت، نئے نئے طریقہ سیاحت، نئے نئے ہتھیار، نئے نئے قواعد سلطنت نکلتے آتے ہیں۔ جو لوگ دنیا میں ہیں ان کا فرض ہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے جائیں۔ چنانچہ جس قوم نے اس پر عمل کیا وہ اب اپنی پچھلی حالت سے زیادہ ترقی پر ہے۔ مسلمانوں نے یہ اصول ٹھہرایا کہ اس پچھلی لکیر پر فقیر رہیں۔ وہ گھٹ گئے اور اور قومیں بڑھ گئیں۔ پس جب تک یہ نہ یقین کریں گے کہ مذہب اور چیز ہے اور دنیوی امور اور چیز ہیں اور مذہب کو دنیوی امور سے اور دنیوی انتظام سے کچھ تعلق نہیں ہے بلکہ مملکت کا انتظام بلحاظ ضرورت وقت اور حاجت کے کرنا چاہیے، اس وقت تک کبھی سلطنت ہائے اسلامیہ میں ترقی نہیں ہونے کی۔ منتظمان ملک کو چاہیے کہ فقہ کی کتابوں کو نہایت ادب سے تہ کر کے رکھیں اور اول طریقہ انتظام ملک مقرر کریں اور اپنے ملک کے قوانین بنائیں، ہر قسم کی مضبوط و قوی عدالتیں مقرر کریں جو کسی قسم کے دباؤ کے نیچے نہ ہوں بلکہ ان کا دباؤ سب پر ہو۔ پھر ایسی قوت کام میں لائیں جس سے وہ عدالتیں اپنے حکم پر سب کو مطیع کرنے کا قابو رکھیں اور ہر شخص، یہاں تک کہ خود اس ملک کا والی ان ہی قوانین کا مطیع ہو۔[۲]

اسلامی طرزِ حکومت

خلیفہ اربعہ میں سے کسی نے کبھی انتظام مملکت اور اجرائے احکام سلطنت کو تابع رائے

---

* تجارت سے متعلق مجموعہ قوانین

[۱] تہذیب الاخلاق (۲) ص ۱۵۰ [۲] تہذیب الاخلاق علی گڑھ (یکم رمضان ۱۲۹۲ھ) ص ۱۴۹

عام نہیں کیا بلکہ صلح و جنگ وغیرہ تمام امور صرف اپنی رائے و مرضی کے موافق انجام دئے اور
سب نے ان کے حکم کی اطاعت کی، اور یہ طرز حکومت وہ ہے جس کو سلطنت شخصیہ سے تعبیر کیا
جاتا ہے اور ایک اصول بھی طرز حکومت ری پبلک (Republic) ★[1] کا اس پر صادق نہیں
آتا۔ اس تمام بحث سے ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جن لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام
نے طرز حکومت ری پبلک اصول پر قائم کی تھی اور مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا، اس کی نظیر کسی
خلافت یا بادشاہت میں نہیں پائی جاتی۔ ختم نبوت کے بعد خلافت فی النبوت باقی نہیں رہی
تھی۔ ہاں، مسلمانوں کے امور تمدنی کے انتظام کو کسی امیر کا ہونا ضرور تھا اور یہ ایک دنیاوی امر
تھا نہ کہ مذہبی، اور اس لئے اسلام نے کوئی طریقہ اس کے لئے مقرر نہیں کیا۔[۱]

سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دونوں کا اصول ایڈمنسٹریشن
(Administration) ★[2] متحد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی گورنمنٹ کو، جس طرح ہو سکے،
قائم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے اور اس کے بعد رعایا کے
واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ پہلے امر کے متعلق ایک مہذب سلطنت یا سلطنت جمہوری بھی
وہی کرتی ہے جو ایک نامہذب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے۔ کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے
کہ ایسے وقت میں ایک مہذب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو جو ایک نامہذب یا شخصی
سلطنت نے کیا ہو۔[۲]

میرا مذہب یعنی اسلام، جس پر مجھے پورا پورا یقین ہے، وہ بھی ریڈیکل
(Radical) ★[3] اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی
(Limited Monarchy) ★[4] کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے۔ ایک
پریذیڈنٹ، جس کو لوگ منتخب کریں، اس کو اسلام پسند کرتا ہے...... وہ ریڈیکل اصول، جو ہم نے
اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں، ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے
جب کہ زمانہ کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو، نہ کہ اس حالت میں جب کہ زمانہ
کے حالات ان کے موافق نہ ہوں۔[۳]

★1 جمہوریہ ★2 نظم و نسق ★3 فطری۔ اساسی ★4 محدود فرمانروائی

۱ مکالمۂ تذکرۂ سرسید، ص ۱۹۶ ۲ بروایت حالی حیات جاوید (۲)، ص ۳۲۹ ۳ مکتوبات سرسید، ص ۱۸۷۔۱۸۸

خلافت اور خلیفہ

خلافت کے معنی جانشین ہونے کے ہیں اور خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کا جانشین ہو مگر اب خلافت ایک مذہبی لفظ ہو گیا ہے اور خلیفہ بھی ایک مذہبی عہدہ خیال کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ آں حضرتؐ کے جانشین قرار پائے اور ان کو خلیفہ رسول اللہ کا لقب بھی ملا۔[1]

اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ رسولؐ کہا گیا ہے مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ سے یہ لفظ متروک ہو گیا اور بجائے اس کے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا گیا جو بالکل صحیح اور نہایت موزوں اور واقعہ کے مطابق تھا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانہ تک اور ان کے بعد بھی چند روز تک بجائے خلیفہ کے امیر المومنین کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا تھا مگر ان کے بعد اور امام حسن علیہ السلام کے زمانہ کے بعد جن لوگوں نے اقتدار حاصل کیا انہوں نے اس خیال سے کہ خلیفہ کا لفظ امیر المومنین کے لفظ سے زیادہ مقدس ہے اپنے تئیں خلیفہ کے لفظ سے تعبیر کیا جیسے کہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس نے اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا لفظ بھی شامل کر لیا تھا۔[2]

ہرگاہ خلافت کا اختتام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تیس برس بعد مذکور ہو چکا ہے اور وہ تیس برس خلع خلافت حضرت امام حسن علیہ السلام پر ختم ہوتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے بعد جو لوگ صاحب حکومت و سلطنت ہوئے ہم ان کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ مصطلحہ قرار دیں خواہ قرشی ہوں خواہ غیر قرشی۔ پس خلافت کا زمانہ ہونے کے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا والی ملک یا امیر وغیرہ قرار پا سکتے ہیں اور از مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو ان خلفا سے تھا جو زمانہ تیس برس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئے وہ ان حاکموں سے نہیں ہو سکتا جو بعد تیس برس مذکور کے ہوئے خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں یا سلطان یا امیر یا جو کچھ چاہیں۔ پس کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو بجز ایک مسلمان یا حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے' نہ اس کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر سکتے ہیں۔[3]

---

۱ آخری مضامین، ص ۵۰ ۲ ایضاً ص ۵۱ ۳ ایضاً ص ۵۳

شیخ الاسلام کا عہدہ

شیخ الاسلام مسلمانی مذہب کے مطابق کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی شخص خواہ مخواہ اس کا حکم ماننے پر مجبور نہیں ہے۔ جو شخص کہ اس کا حکم نہ مانے اس کے ایمان میں، اس کے مذہب میں کسی قسم کا نقصان نہیں آ سکتا، نہ کوئی گناہ اس پر ہوتا ہے۔ یہ عہدہ کوئی مذہبی عہدہ نہیں ہے جیسے کہ پوپ کا عہدہ خیال کیا جاتا ہے۔[1]

کافر حکومت میں مسئلہ جہاد و اطاعت

جہاد مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ اس کے قواعد ایسے قاعدہ پر مبنی ہیں جس میں ذرا بھی دغا اور فریب اور غدر و بغاوت اور بے ایمانی نہیں۔[2]

اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے ان کو امن دیا ہو، مسلمان ہو یا کافر، اس کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔[3]

میرے عقیدہ میں مذہب اسلام دغا بازی اور فریب کا وسیلہ یا لٹیرے پن کا حیلہ نہیں ہے۔ اس کا سچا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے حاکم کے، جس کے امن میں رہتے ہیں اور امن میں زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے سچے خیر خواہ رہیں۔[4]

مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات ہے کہ اگر مسلمان اپنے اختیار سے کسی کو بادشاہ بنانا چاہیں تو مسلمان کو اور قریش کی قوم سے بنائیں لیکن جو شخص کہ اپنے غلبہ سے بادشاہ ہوا ہو اُس بادشاہ یا حاکم کا، جس کی اطاعت میں مسلمان ہوں، مسلمان ہونا شرط نہیں ہے یعنی کسی مذہب کا بادشاہ ہو اس کی اطاعت واجب ہے۔[5]

جس وقت تک مسلمان کامل امن و امان کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا وعظ کہہ سکیں اس وقت تک کسی مسلمان کے نزدیک اپنے مذہب کی رو سے اس ملک کے بادشاہوں پر جہاد کرنا جائز نہیں ہے خواہ وہ کسی قوم کے کیوں نہ ہوں۔[6]

۱؎ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۰۴ ۲؎ لائل محمڈنز (۲)، ص ۳۸ ۳؎ تفسیر القرآن (۱)، [illegible]
۴؎ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۷۶ ۵؎ لائل محمڈنز (۲)، ص ۱۶ ۶؎ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، [illegible]

خلافت اور خلیفہ

خلافت کے معنی جانشین ہونے کے ہیں اور خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کا جانشین ہو، مگر اب خلافت ایک مذہبی لفظ ہوگیا ہے اور خلیفہ بھی ایک مذہبی عہدہ خیال کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ آں حضرت ؐ کے جانشین قرار پائے اور ان کو خلیفہ رسول اللہ کا لقب بھی ملا۔[1]

اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو خلیفہ رسول ؐ کہا گیا ہے مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ سے یہ لفظ متروک ہوگیا اور بجائے اس کے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا گیا جو بالکل صحیح اور نہایت موزوں اور واقعہ کے مطابق تھا۔ حضرت علی مرتضیٰ ؓ کے زمانہ تک اور ان کے بعد بھی چند روز تک بجائے خلیفہ کے امیر المومنین کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا تھا مگر ان کے بعد امام حسن علیہ السلام کے زمانہ کے بعد جن لوگوں نے اقتدار حاصل کیا انہوں نے اس خیال سے کہ خلیفہ کا لفظ امیر المومنین کے لفظ سے زیادہ مقدس ہے اپنے تئیں خلیفہ کے لفظ سے تعبیر کیا جیسے کہ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس نے اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا لفظ بھی شامل کرلیا تھا۔[2]

ہرگاہ خلافت کا اختتام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تیس برس بعد مذکور ہو چکا ہے اور وہ تیس برس خلع خلافت حضرت امام حسن علیہ السلام پر ختم ہوتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے بعد جو لوگ صاحب حکومت وسلطنت ہوئے ہم ان کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ مصطلحہ قرار دیں خواہ قرشی ہوں خواہ غیر قرشی۔ پس خلافت کا زمانہ ہونے کے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا والی ملک یا امیر وغیرہ قرار پاسکتے ہیں اور از روئے مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو ان خلفا سے تھا جو زمانہ تیس برس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئے وہ ان حاکموں سے نہیں ہوسکتا جو بعد تیس برس مذکور کے ہوئے خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں یا سلطان یا امیر یا جو کچھ چاہیں۔ پس کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو بجز ایک مسلمان یا حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے' نہ اس کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر سکتے ہیں۔[3]

1۔ آخری مضامین، ص ۵۰ 2۔ ایضاً ص ۵۱ 3۔ ایضاً ص ۵۳

شیخ الاسلام کا عہدہ

شیخ الاسلام مسلمانی مذہب کے مطابق کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی شخص خواہ مخواہ اس کا حکم ماننے پر مجبور نہیں ہے۔ جو شخص کہ اس کا حکم نہ مانے اس کے ایمان میں اس کے مذہب میں کسی قسم کا نقصان نہیں آ سکتا، نہ کوئی گناہ اس پر ہوتا ہے۔ یہ عہدہ کوئی مذہبی عہدہ نہیں ہے جیسے کہ پوپ کا عہدہ خیال کیا جاتا ہے۔[1]

کافر حکومت میں مسئلہ جہاد و اطاعت

جہاد مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ اس کے قواعد ایسے قاعدہ پر مبنی ہیں جس میں ذرا بھی دغا اور فریب اور غدر و بغاوت اور بے ایمانی نہیں۔[2]

اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے ان کو امن دیا ہو، مسلمان ہو یا کافر، اس کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔[3]

میرے عقیدہ میں مذہب اسلام دغا بازی اور فریب کا وسیلہ یا لٹیرے پن کا حیلہ نہیں ہے۔ اس کا سچا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے حاکم کے، جس کے امن میں رہتے ہیں اور امن میں زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے سچے خیر خواہ رہیں۔[4]

مسلمانوں کے مذہب میں یہ بات ہے کہ اگر مسلمان اپنے اختیار سے کسی کو بادشاہ بنانا چاہیں تو مسلمان کو اور قریش کی قوم سے بنائیں لیکن جو شخص کہ اپنے غلبہ سے بادشاہ ہوا ہو اُس بادشاہ یا حاکم کا، جس کی اطاعت میں مسلمان ہوں، مسلمان ہونا شرط نہیں ہے یعنی کسی مذہب کا بادشاہ ہو اس کی اطاعت واجب ہے۔[5]

جس وقت تک مسلمان کامل امن و امان کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا وعظ کہہ سکیں اس وقت تک کسی مسلمان کے نزدیک اپنے مذہب کی رو سے اس ملک کے بادشاہوں پر جہاد کرنا جائز نہیں ہے خواہ وہ کسی قوم کے کیوں نہ ہوں۔[6]

---

[1] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۰۴ [2] لائل محمڈنز (۲)، ص ۳۸ [3] تفسیر القرآن (۱)، ص [illegible]

[4] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۷۶ [5] لائل محمڈنز (۲)، ص ۱۶ [6] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص [illegible]

جب تک کوئی کافر بادشاہ مسلمانوں کے مذہب میں دست اندازی نہ کرے اس وقت تک ان پر اس کافر کی بھی اطاعت کرنا فرض ہے۔[۱]

جس حاکم کی عمل داری میں جو بطور رعیت ہو کر اس کے امن میں رہتے ہیں، ان حاکموں سے مقابلہ کرنا بغاوت ہے نہ کہ جہاد۔[۲]

جب کہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ان کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض منصبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو...... اس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمان داری کا بتایا ہے کہ جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی، یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔[۳]

دارالسلام اور دارالحرب

لفظ ''دارالسلام'' اور ''دارالحرب'' قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا اور نہ وہ کسی حدیث میں ملا۔ البتہ صرف ایک حدیث میں، جس میں مسلمانوں کو دارالحرب میں سود لینے کی اجازت ہے، لفظ دارالحرب آیا ہے (لیکن چونکہ وہ اور حدیثوں کی مانند مستند نہیں ہے اسی وجہ سے زیادہ اعتبار کے لائق نہیں ہے)۔[۴]

دارالحرب صرف ایک اصطلاحی نام اس ملک کا ہے جس پر احکام اسلام کے بموجب حکومت شرعیہ مسلمانوں کی نہ ہوتی ہو یا اس ملک کا نام ہے جو مسلمان گورنمنٹ کے قبضہ میں نہ ہو۔ اور جس ملک پر شرع اسلامیہ کے بموجب حکومت ہوتی ہو اور وہ مسلمان گورنمنٹ کی حکومت میں ہو اس کا نام دارالسلام ہے۔ اب الفاظ مذکورہ بالا کے معنی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو ملک مسلمان گورنمنٹ کے قبضہ میں آ جائے وہ دارالسلام ہو جائے گا اور جس ملک کو ایک کافر بادشاہ مسلمانوں سے فتح کرے وہ دارالحرب ہو جائے گا۔[۵]

مسلمانوں کو، خواہ وہ دارالحرب میں رہتے ہیں خواہ دارالسلام میں، اس گورنمنٹ پر جہاد

---

۱ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۱۱ ۲ لائل محمڈنز (۳)، ص ۱۸۶ ۳ تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۲۸
۴ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۳ مئی ۱۸۷۱ء)، ص ۲۹۶ ۵ ایضاً، ص ۲۹۷

کرنا حرام ہے جو اُن کے مذہبی فرائض کے ادا کرنے کی مانع نہ ہو۔[1]

وہ مسلمان...... جو کفار کے ملک (یعنی دارالحرب میں) اور غیر قوم کی حکومت میں بطور رعایا کے رہتے ہیں...... اگر وہ گورنمنٹ...... مذہبی فرائض کے ادا کرنے میں ان کی مانع ہو تو ان کو لازم ہے کہ گورنمنٹ سے مقابلہ نہ کریں بلکہ چپکے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔[2]

اگر دارالسلام میں ملک کا مسلمان بادشاہ شرع کے خلاف عمل کرے تو اس کی مسلمان رعایا کو اختیار ہے کہ اس کو تخت سے اتار دیں اور ایک دربارِ عام میں اس کے مقدمہ کی تنقیح کریں اور اگر ضرورت ہو تو اپنے شرعی حکم کی تکمیل کے واسطے بحرب و پیکار پیش آئیں کیونکہ مذہب اسلام کے بموجب دارالسلام میں خلیفہ یا بادشاہ کو یا جس نام سے کسی ملک کا بادشاہ مشہور ہو امریکہ کی سلطنت متفقہ کی گورنمنٹ کے میر مجلس سے کچھ زیادہ اختیار حاصل نہیں ہے...... وہ ایک کافر گورنمنٹ پر اس صورت میں جہاد کرنے کے مجاز ہیں جب ان کو اس بات کے یقین کرنے کا نہایت پکا ثبوت حاصل ہو کہ گورنمنٹ مذکور ان کے ہم مذہبوں کو ایذا پہنچاتی ہے اور ان کو مذہبی فرائض کے ادا کرنے سے روکتی ہے۔ الاشرط یہ ہے کہ ان کے باہم کسی قسم کا معاہدہ نہ ہو اور ان کو اس بات کا بھروسہ بھی ہو کہ ہم اس لڑائی میں فتح یاب ہوں گے۔[3]

اسلام اور تلوار

امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی! یہ کہنا کہ اسلام کے نہ قبول کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے مذہب اسلام پر من جملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذاہب والوں نے نا انصافی سے اس پر کیے ہیں۔ یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ دانستہ حق پوشی کی نظر سے باندھے ہیں۔ اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا، پس کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس چیز سے وہ بات پیدا ہی نہیں ہو سکتی جس کی ضرورت اسلام کے لئے ہے اس کے کرنے کو خود اسلام ہی ہدایت کرے۔[4]

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۲۸ اپریل ۱۸۷۱ء)، ص ۲۵۹ [2] ایضاً (۱۲ مئی ۱۸۷۱ء)، ص ۲۹۷-[illegible]

[3] ایضاً، ص ۲۹۸ [4] خطبات احمدیہ، ص ۱۸۷

بلاشبہ اسلام نے بھی تلوار کو نکالا مگر دوسرے مقصد سے، یعنی خدا پرستوں کے امن اور ان کی جان و مال کی حفاظت اور ان کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو، اور یہ ایک ایسا منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا...... جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کے جان و مال کو امن سے نہ رہنے دیں، جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے، اس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کو اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے مگر اسی وقت تک جہاں تک کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے...... ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے، وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ بجرد حاصل ہونے اس مقصد کے تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے گو کہ ایک بھی کافر مسلمان نہ ہوا ہو۔[1]

ہاں، ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا، مگر مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے بلکہ ہم کو یہ بات تحقیق کرنی چاہیے کہ آیا انہوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں، اور اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے۔[2]

اسلامی سزائیں

قید خانے اور سزائے بدنی

قرآن مجید میں جس طرح کہ مختلف سزاؤں کا بیان ہوا ہے اور جس طرح کہ وہ مختلف حیثیت اور مقدار جرم سے علاقہ رکھتی ہیں اسی طرح زمانہ کی حالت سے بھی ان کا تعلق رکھنا ان احکام کے ضمن میں پایا جاتا ہے۔ جس زمانہ میں کہ ملک کی یا قوم کی ایسی حالت ہو کہ قید خانوں کا انتظام ناممکن ہو اور نہ ایسے جزائر پر دسترس ہو جہاں مجرم جلاوطن کر کے قید کئے جا سکیں تو ان جرموں کے موقوف کرنے کے لئے اور تمام خلق اللہ کو امن دینے کے لئے بالاضطرار سزائے

---

[1] خطباتِ احمدیہ، ص ۱۸۸ [2] ایضاً، ص ۱۸۹

بدنی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ گو کہ وہ ایک وحشیانہ سزا ہو مگر بجبوری اختیار کی جاتی ہے۔ نہایت شائستہ ملکوں میں بھی بحالت مجبوری سزائے بدنی دی جاتی ہے۔ بید کی سزا بھی ایسی ہی وحشیانہ سزا ہے مگر قید خانے اس قدر کثیر مجرموں کے قید کرنے کو کافی نہیں ہوتے تو بجبوری سزائے بدنی دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پس قرآن مجید نے اور نیز حضرت موسیٰؑ نے مجبوری کی حالت میں اس سزائے بدنی کو جائز رکھا ہے۔ مگر جب کہ ملک میں تسلط ہو اور قید خانوں کا انتظام موجود ہو تو قرآن مجید کی رو سے اس سزائے بدنی کا دینا کسی طرح جائز نہیں ہے۔[۱]

چوری کی سزا

سرقہ محض میں یا سارق کا ہاتھ کاٹا جائے گا جب کہ ملک و قوم کی حالت ایسی ہو کہ قید خانوں کا انتظام نہ ہو یا قید خانہ میں قید کیا جائے گا جب کہ وہ موجود ہوں...... مکرر سرقہ کرنے کی حالت میں قرآن مجید میں دوسرے ہاتھ یا پاؤں کے کاٹے جانے کا ہرگز حکم نہیں ہے۔ جنہوں نے اس پر عمل کیا ہے ان سے اجتہاد میں خطا ہوئی ہے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ اگر یہ جائز ہو تو تیسرے یا پانچویں جرم سرقہ میں کیا کیا جائے گا۔ ڈاکوؤں اور رہزنوں کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں اور چور کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالنا ان کو جرائم کے ارتکاب سے ایک مناسب حد تک معذور کر دینا ہے اور اس سے زیادہ خدا کی حکمت کو باطل کرنا اور ان کو انسان سے ایک مضغہ بنا دینا ہے جو فطرت اللہ کے برخلاف ہے۔[۲]

تائب چور سے درگزر

قرآن مجید میں آیا ہے کہ ایک ڈاکو جو درحقیقت ڈاکہ زنی کرتا ہے یا ایک چور جو درحقیقت چوری کا پیشہ رکھتا ہے اور اس کے ڈاکو یا چور ہونے میں کسی کو شبہ نہیں مگر بسبب نہ دستیاب ہونے ثبوت کے ہم اس کو سزا دینے پر قادر نہیں ہیں۔ پس اگر قبل ہماری قدرت سزا دینے کے وہ ڈاکو اور چور اپنے پیشہ کو چھوڑ دے اور صلاحیت قبول کرے اور نیک چلن ہو جائے تو اس کے گزشتہ افعال سے درگزر کرنا ایک ایسا امر ہے جس کی مخالفت نہ انصاف کر سکتا ہے اور نہ کوئی قانون۔[۳]

---

[۱] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۰۲ [۲] ایضاً، ص ۲۰۴-۲۰۵ [۳] ایضاً، ص ۲۰۳

قصاص اور دیت

قرآن مجید میں صرف خون کے بدلے خون کا حکم ہے...... قتل ایک ایسی چیز نہیں ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی اس کے مواخذہ سے کوئی شخص بری ہو سکے، مگر زمانہ جاہلیت میں جو بے انتہا خون ہوتے تھے اور بدلہ لینے کے لئے قتل وقتال قائم تھے اس لئے ابتدائے اسلام میں ان تمام جھگڑوں کے مٹانے کے لئے وہ معاہدے جو زمانہ جاہلیت میں قصاص سے بری ہونے کی بابت قرار پائے تھے، اسی طرح جائز رکھے گئے...... یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسلام میں بھی قتل عمد کا معاف کر دینا یا دیت کا لینا جائز کر دیا گیا ہے۔ قتل خطا قتل عمد سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور اس میں دیت کا اقرار پانا اور کسی معاوضہ کا ٹھہرانا انصاف کے برخلاف نہیں ہے۔[1]

زنا میں سنگساری و بدنی سزا

رجم قرآن میں نہیں ہے۔[2]

معتزلی اور خارجی، جو مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں اور معتزلی فرقہ کے لوگ عربیت میں بہت بڑا اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں، اب بھی یہی کہتے ہیں کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا نہیں ہے اور...... راقم کی بھی، گو وہ ان دونوں فرقوں سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا ہے، بلکہ سنی مذہب کی بھی یہی رائے ہے۔[3]

صرف ایک جرم میں یعنی زنا میں سزائے بدنی کا دیا جانا فطرت انسانی کے مطابق ہے کیونکہ جیسا وہ جرم لذت نفسانی سے علاقہ رکھتا ہے ویسی ہی اس کی سزا بھی تکلیف نفسانی سے ہونی چاہیے۔ پس اسلام نے بھی سوائے حالت مجبوری کے بجز زنا کے اور کسی جرم میں سزائے بدنی کو جائز نہیں رکھا ہے۔[4]

زنا کی سزا سو کوڑے مارنا مذہب اسلام میں ہے۔ یہ سزا یہودیوں کے قانون سے مختلف ہے لیکن جو علمائے اسلام یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں بھی زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے تو یہ سزا یہودیوں کے مذہب سے بالکل مماثلت رکھتی ہے۔[5]

۱؎ تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۱۱-۲۱۴ ۲؎ ایضاً (۳)، ص ۲۵ ۳؎ خطبات احمدیہ، ص ۳۰۲
۴؎ تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۰۳ ۵؎ خطبات احمدیہ، ص ۱۴۷

غیر مسلموں پر حد

خدا تعالیٰ نے ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن کے احکام کے مطابق حکم کرنے کا حکم دیا ہے جو اسلام میں داخل ہوئے ہیں، نہ غیر اہل اسلام کی نسبت۔ یہ ایک محقق مسئلہ ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے وہ جب تک کہ مسلمان نہ ہوں، جزئیات احکام شرع کے مکلف نہیں ہیں بلکہ صرف اسلام لانے پر مکلف ہیں اور اسلام لانے کے بعد جزئیات احکام شرع کے مکلف ہوتے ہیں اور اس لئے قبل اسلام ان پر احکام شرع جاری نہیں ہو سکتے۔[1]

خلفائے راشدین

عہد خلافت کا تعین

خلفائے راشدین کا انحصار صرف پانچ میں ہے: ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، حسن مجتبیٰ، خاتم الخلفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، اور ان کا زمانہ خلافت صرف تیس برس ہے۔ اس کے بعد زمانہ خلافت نہیں ہے بلکہ عہد دولت ملوک عضوض ہے، الا ماشاء اللہ۔[2]

استحقاقِ خلافت

مذہب اہل سنت و جماعت اور شیعہ اثنا عشریہ میں جو مباحث افضلیت اور استحقاق خلافت خلفائے اربعہ کے ہیں، اور مذہب خوارج میں جو عقائد ختنین و اہل بیت کی نسبت اور مذہب نواصب میں علی مرتضیٰؓ و اہل بیت کی نسبت ہیں، ان سے زیادہ لغو و بے ہودہ مباحث و عقائد کوئی نہیں ہیں۔ استحقاق خلافت آں حضرت صلعم کا من حیث النبوت کسی کو بھی نہ تھا اس لئے کہ خلافت فی النبوت تو محالات سے ہے۔ باقی رہ گئی خلافت فی ابقائے اصلاح اصلاح تمدن، اس کا ہر کسی کو استحقاق تھا، جس کی چل گئی وہی خلیفہ ہو گیا۔[3]

---

[1] تفسیر القرآن (۲)، ص ۲۱۳ [2] ابطال غلامی، ص ۱۵۳ [3] تصانیف احمدیہ، حصہ (۱) جلد (۱)، ص [illegible]

حضرت علی کی خواہش خلافت

کون کہہ سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے علی مرتضیٰؑ کو خلیفہ ہونے کا خیال نہ تھا اور تینوں مقدم خلافتوں کے زمانہ میں ان کو ان کے خلیفہ نہ ہونے کا افسوس یا اپنے خلیفہ نہ ہونے کا رنج نہ تھا؟ مگر علی مرتضیٰؑ کی خواہش زیادہ تر سلطنت شخصی کے مشابہ تھی جو اس وقت کے طریقہ تمدن کے موافق نہ تھی اور اسی لئے ان کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ جب ایسا وقت آ گیا کہ ذی اقتدار لوگوں نے ان کی طرف رجوع کی، وہ خلیفہ ہو گئے۔ نہ مقدم خلیفہ ہونے میں کوئی وجہ افضلیت تھی، نہ موخر خلیفہ ہونے میں کوئی وجہ منقصت۔[۱] ★

خلفائے اربعہ کا انتظامِ مملکت

خلافت کی نسبت بحیثیت انتظامِ ملکی کیا لکھا جائے اور کون لکھ سکتا ہے؟ میں تو ان صفات کو

★ اس موضوع پر سرسید کے مزید خیالات ان کے ایک مکتوب میں ملتے ہیں جو انہوں نے سوسائٹی کے معاملات کے ضمن میں تحریر کئے۔ وہ لکھتے ہیں: ''آپ کی تحریر کہ میں صرف خدمت کرنے والا ہوں اور حکم بجا لانے والا، لغو محض — سوسائٹی کا معاملہ پھرتے پھرتے حق بہ مرکز قرار گرفت کا ہو گیا۔ جس طرح حضرت علیؑ نے خطبہ پڑھا تھا، جب وہ خلیفہ ہوئے تھے، آپ بھی پڑھئے اور صاف کہہ دیجیے کہ غاصبین سے خدا نے سوسائٹی کو چھڑایا اور جس کا حق تھا اس کو پہنچا۔'' (سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز، ص ۱۳۲)

اسی موضوع پر حالی نے سرسید کا ایک لطیفہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''بعض اوقات سرسید کسی مسئلہ کی نسبت اپنے عقیدہ کا اظہار ظرافت کے پیرایہ میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی مگر درحقیقت وہ ان کی اصلی رائے اس مسئلہ کی نسبت ہوتی تھی۔ جس زمانہ میں وہ بنارس میں تھے ان کا ایک آرٹیکل ''تہذیب الاخلاق'' میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع، جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں، حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب، جو بنارس میں ملازم تھے، اس آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی ان سے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سرسید سے اس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے: ''کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفہ اول کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی؟'' سرسید نے کہا: ''حضرت! نہ ہوگی تو ان کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا؟'' وہ یہ سن کر اور بھی خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے: ''کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت، جب کہ کچھ لوگ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟'' سرسید نے کہا: ''حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا؟ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو بسوے کامیاب ہوتا۔'' یہ سن کر ان کی جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن کر گھر کا رستہ لیا۔'' (حیاتِ جاوید، (۲) ص ۴۵۱)

[۱] تصانیف احمدیہ حصہ (۱) جلد (۱)، ص ۳۷

جو ذات نبوی میں جمع تھیں دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں' ایک سلطنت اور ایک قدوسیت۔ اول کی خلافت حضرت عمرؓ کو ملی' دوسری کی خلافت حضرت علیؓ و ائمہ اہل بیت کو۔ مگر یہ کہہ دینا تو آسان ہے مگر کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے' حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ تو صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے۔ پس میری رائے میں ان بزرگوں کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے۔ جو ہوا سو ہوا، جو گزرا سو گزرا۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ خلافت تو شمار کرنا نہیں چاہیے کیونکہ در حقیقت وہ زمانہ بھی حضرت عمرؓ ہی کی خلافت کا تھا اور وہی بالکل دخیل و منتظم تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ' کیا بہ نظر انتظام اور کیا بنظر فتوحات و امن و حکومت و رعب و داب جو ابقاء اصلاح امت و اصلاحِ تمدن کے لئے ضرور تھا' ایک بے نظیر زمانہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں جو کچھ ہوا وہ صرف حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کا اثر تھا۔ اصلی زمانہ خلافت حضرت عثمانؓ ان کی خلافت کا اخیر زمانہ تصور کرنا چاہیے جس میں تمام اصول سیاست مدن اور وہ اصول سلطنت جمہوری جس پر اس عالی شان محل کی بنیاد قائم ہوئی تھی' سب کے سب سست اور برہم درہم ہو گئے تھے اور غدر کا ہونا اس کا ایک ضروری نتیجہ تھا جو ہوا۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام تک جب خلافت پہنچی تو ایسی ابتر و خراب ہو گئی تھی جس کا درست ہونا اگر ناممکن نہ تھا تو قریب قریب ناممکن کے تھا۔ اس کی اصلاح میں' جہاں تک ممکن تھا' کوشش کی گئی' ملک دے گئے' دوسری حکومتیں تسلیم کی گئیں مگر اصلاح نہ ہوئی۔[2]

سلطنت کی تقسیم سے قومی تنزلی

سب سے بڑا نشان قومی تنزل کا حکومت یا سلطنت کا تقسیم ہو جانا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ اور معاویہ بن ابوسفیانؓ، امام حسن علیہ السلام نے کمال دانائی و بردباری اور عالی ہمتی اور قومی ہمدردی سے اس کو مٹایا اور ترک خلافت کیا مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حجاز میں مستقل حکومت قائم کرنے سے پھر اس علامت کو تازہ کیا۔[3]

---

[1] خطوط سرسید، ص ۱۸۳ [2] تصانیف احمدیہ، حصہ (۱) جلد (۱)، ص ۴۷ [3] مقالات سرسید [illegible]

غیر مذاہب پر مسلمان حکمرانوں کے ظلم

جہاد کے نام پر وحشت اور درندگی

سلسلہ خلافت کا جناب رسالت مآبؐ کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہو گیا تھا۔[1]

اس زمانہ کے بعد کسی شخص پر خلیفہ نبی اور جانشین پیغمبر کا اطلاق نہیں ہو سکتا' البتہ بادشاہان اسلام تھے جن میں سے بہت سوں نے ہزاروں ظلم اور ہزاروں کام خلاف مذہب اسلام کیے۔[2]

مسلمانوں کی تاریخ میں سوائے چند متعصب اور ناعاقبت اندیش بادشاہوں' مثل متوکل باللہ وغیرہ' کے ایسے بادشاہوں کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں جنہوں نے عیسائیوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا...... کون شخص ہے جو بعض ظالم مسلمان حکمرانوں کی بے جا متعصبانہ سختیوں کے لئے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے جواز کا فتویٰ نکال سکتا ہے؟[3]

قرآن مجید میں جو احکام لڑائی کے نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے ان کو مسلمانوں نے' جو خلیفوں یا بادشاہوں کے نام سے مشہور ہوئے' دین داری کے بہانے سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بد اخلاقی اور ناانصافی سے برتا اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے۔[4]

جہاد کا مسئلہ...... اگر وہ مسئلہ درحقیقت ایسا ہی ہو جیسا کہ بعض یا اکثر حقیقت تک نہ پہنچنے والے یا خود غرض لوگوں نے سمجھا ہے یا اکثر ظالم و مکار مسلمان حکمرانوں نے برتا ہے تو اس کے اخلاق کے برخلاف ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے؟[5]

محمود غزنوی اور عالمگیر کی بت شکنی

بعض مسلمان بادشاہوں نے غیر مذہب والوں پر ظلم کیا اور ان کی مذہبی آزادی کو برباد کر دیا مگر ایسا کرنا ان کا ذاتی فعل تھا جس کے وہ خود ملزم ہیں' نہ مذہب اسلام۔ بلاشبہ آں حضرت

---

۱ خطبات احمدیہ، ص ۲۳۱ ۲ ابطال غلامی، ص ۱۵۳ ۳ آخری مضامین، ص ۳۱

۴ تفسیر القرآن (۱)، ص ۲۳۴ ۵ تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۹۶

صلعم نے فتح مکہ کے بعد قوم عرب کے بتوں کو توڑ دیا مگر اس بت شکنی کی نظیر محمود غزنوی کی یا عالمگیر کی یا اور کسی بادشاہ کی بت شکنی کی نہیں ہو سکتی ..... آں حضرت صلعم نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے، اس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔[1]

مذہبی تحمل کے مخالف بادشاہ

ہندوستان میں اہل اسلام کی حکومت میں قوم ترک اور وہ پٹھان بادشاہ، جو حنفی فرقہ میں سے تھے، مذہبی تحمل کے بالکل مخالف تھے۔[2]

ترکوں اور پٹھانوں کی سلطنت میں ہندوستان کی رعایا سے محبت اور میل جول نہ ہوا جب تک آسائش اور آسودگی سلطنت نے صورت نہ پکڑی۔ مغلیہ کی سلطنت میں اکبر اول کے عہد سے یہ ملاپ بخوبی شروع ہوا اور شاہ جہاں کے وقت تک بدستور رہا...... عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بسبب مقابلہ اور سرکشی قوم ہنود، مثل سیواجی مرہٹہ وغیرہ کے، عالمگیر جملہ قوم ہنود سے ناراض ہوا اور اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ بہ سختی گیری پیش آئے اور ہر ایک سے جذیہ لے۔ پھر جو مضرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے۔[3]

انگریز اور ہندوستان ★

انگریزوں کی آمد کا پس منظر

گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت

★ اس ذیلی باب میں سرسید کی تحریروں سے جو اقتباسات منتخب کیے گئے ہیں، ان میں سے بہت سے انگریزی حکومت کے عدل و انصاف، اس حکومت کے استحکام کی خواہش، حکمرانوں کی اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین اور متحدہ قومیت کے نظریہ کی حمایت سے متعلق ہیں۔ یہ اقتباسات حیات سرسید کے آخری سال ۱۸۹۷ء کی تحریروں سے لئے گئے ہیں لہٰذا یہ ان کے اصلی خیالات تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ تصدیق کے لئے ان عبارتوں کے ساتھ ماہ و سن بھی درج کر دئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر دیگر اقتباسات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ ان کے صرف آخری دور کے خیالات نہیں بلکہ وہ عمر بھر انہی خیالات کے حامل اور ان پر سختی سے کاربند رہے۔

[1] تفسیر القرآن (۴)، ص ۱۰۹-۱۱۰ [2] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۱۴

[3] اسباب سرکشی ہندوستان، ص ۳۳-۳۴

ہندوستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سواسی ضرورت نے ہندوستان، ان کا محکوم بنا دیا۔[1]

وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، ایک ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی، اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا...... انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے، نہ بطور ایک دشمن کے۔[2]

مسلمان رعایا نہ تو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے قیام کی مخالف تھی اور نہ برٹش گورنمنٹ کے قیام نے ان لوگوں میں کوئی سیاسی بے چینی پیدا کی۔ طوائف الملوکی اور ظلم و تشدد کے اس دور میں جب کہ ملک کو ایک مختار کامل حکومت کی ضرورت تھی، ساری مقامی آبادی نے برٹش اقتدار اعلیٰ کا پر جوش خیر مقدم کیا اور مسلمانوں نے اس سیاسی تبدیلی پر اطمینان کے جذبات کا اظہار کیا۔[3]

جو میری آرا اور خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت ہیں ان کے اصول میرے بیٹے سید محمود کی پیدائش سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔[4]

۱۸۵۴ء میں جب میں نے ایک تاریخ دہلی کی پرانی عمارتوں اور اگلی عملداریوں کی لکھی تو اس میں سلسلہ سلطنت خاندان مغلیہ کا ۱۸۰۳ء سے، یعنی جب سے کہ لارڈ لیک سپہ سالار انگلشیہ نے دہلی کو فتح کیا، منقطع کیا اور ہندوستان کی سلطنت میں سلسلہ شاہان انگلستان کا قائم کیا۔ اس سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس ہنگامہ کے پہلے سے میری نیت یہی تھی کہ تمام اہل ہند جان لیں کہ اب سلطنت خاندان مغلیہ کی ختم ہو گئی ہے اور ہندوستان کی بادشاہت شاہان انگلستان کی ہے۔[5]

انگریزی حکومت —— خدا کی مرضی

خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ہندوستان ایک دانش مند قوم کی حکومت میں دیا جائے جس کا

۱۔ بروایت حالی، حیات جاوید (۲)، ص ۳۴۰ ۔ ۲۔ ایڈریس اور اسپیچیں، ص ۷۵

۳۔ بحوالہ گراہم، دی لائف اینڈ ورک، ص ۲۴۰ ۔ ۴۔ مکتوبات سرسید، ص ۱۳۶ ۔ ۵۔ لائل محمڈنز (۱)، ص ۲

طرزِ حکومت زیادہ تر قانونِ عقلی کا پابند ہو۔ بے شک اس میں بڑی حکمت خدا تعالیٰ کی تھی۔[۱]

اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے' انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے' ملک میں امن قائم رکھتی ہے اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہے' جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے' تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔[۲]

خدا نے ان کو ہم پر حاکم کیا ہے۔ پس ہم ان سے دوستی کریں اور وہ طریقے اختیار کریں جس میں ان کی حکومت کو ہندوستان میں استقلال اور استحکام رہے۔[۳]

خدا کا حکم کوئی تحریری نہیں آتا مگر زمانے کے حالات سے پایا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہم کو خدا کی یہ مرضی معلوم ہوتی ہے کہ انگلش نیشن ہندوستان میں حکومت کرے اور ہم ان کے زیرِ سایہ بسیں۔[۴]

عقل مند شخص' جو خدا پر یقین رکھتا ہے' اُس کی یہی خواہش ہوگی کہ اس طریقے پر چلیں جو خدا کی مرضی ہے۔ اب ہندوستان میں دیکھنا چاہیے کہ خدا کی مرضی باہم کس طرح بسر کرنے کی ہے۔ صدیاں گزر گئی ہیں کہ ہندو اور مسلمان یہاں آباد تھے۔ چند سال سے خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ایک تیسری قوم بھی یہاں آباد ہو۔ یہ تینوں قومیں اب یہاں آباد ہیں اور اب ان ہی تینوں کا یہ ملک ہے۔[۵]

بے نظیر انگریزی گورنمنٹ

کون شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر مذہبی آزادی ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور جو امن اس ملک کے درمیان پھیلا ہوا ہے' وہ خدا کی ایک نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا ہر مسلمان پر اور اس ملک کے ہر باشندے پر فرض ہے۔[۶]

(دسمبر ۱۸۹۷ء)

انگریزی گورنمنٹ سے جس قدر کہ ملک میں امن و امان اور رعایا میں آزادی ہے اس کی

---

[۱] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۲۴ [۲] مکتوبات سرسید، ص ۱۸۸ [۳] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۴۷۴
[۴] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۱۲ [۵] ایضاً، ص ۱۲۳ [۶] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۵۷۲

نظیر دنیا کی کسی گورنمنٹ میں نہیں ہے۔ میں نہایت دلی یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ جن عمدہ اصولوں پر انگریزی گورنمنٹ ہے اس سے زیادہ عمدہ اصول گورنمنٹ کے لئے ہو نہیں سکتے۔ جیسے رعایا کے حقوق اور ان کی دولت اور ان کی جان اور ان کی آزادی اس گورنمنٹ میں محفوظ ہے، دنیا میں کہیں نہیں ہے۔[۱]

یہ مذہبی آزادی، یہ امن و امان یورپ کے ان ملکوں میں بھی نہیں ہے جو سویلائزڈ (Civilized)* کہلاتے ہیں...... میں نے انگلستان میں چند مہینے بسر کئے ہیں اور میں اپنے ذاتی تجربے اور واقفیت سے کہہ سکتا ہوں کہ جس آسائش سے ہندوستان کے باشندے زندگی بسر کرتے ہیں اس طرح خود انگلستان کے باشندے آسائش سے بسر نہیں کرتے۔[۲] (دسمبر ۱۸۹۷ء)

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے جو اُن کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہے اور اس نے ہر طرح کی مذہبی آزادی عنایت کی ہے اور وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتی ہے، نہ کبھی دے گی جس سے ہم کو خدا کی نافرمانی کرنی پڑے۔[۳] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

انگریزی حکومت کا استحکام

انگریزوں کی قوم ایک ایسی قوم ہے جس کے دل میں انسان کی بھلائی اور بہتری چاہنے کا ایک قدرتی جوش ہے۔[۴]

ہم کو جو کچھ اپنی بھلائی کی توقع ہے وہ انگریزوں سے ہے۔[۵]

خدا کا شکر ہے کہ ہم ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریا قیصرہ ہند کے زیر سایہ ہیں۔[۶]

ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم حضرت ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کی اطاعت دل و جان سے کریں اور ان کی دولت اور حکومت کی درازی اور قیام و استحکام کی دعا کرتے رہیں۔[۷] (دسمبر ۱۸۹۷ء)

---

* مہذب

۱۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۱۱۷ ۲۔ ایضاً، ص ۵۷۳ ۳۔ آخری مضامین، ص ۱۱۳ ۴۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۶۸

۵۔ ایضاً، ص ۳۷۴ ۶۔ خطبات سرسید (۲)، ص ۳۷۳ ۷۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۵۷۳

میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔[1]

جب یہ امر طے ہو گیا کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کی حکومت ضرور ہے تو ہندوستان کے لئے یہی مفید ہے کہ اس کی حکومت نہایت استحکام سے ہندوستان میں قائم رہے اور گورنمنٹ کے لئے بھی یہی مفید ہے کہ وہ اپنے استحکام کے لئے جس قدر مناسب سمجھے فوج رکھے اور اپنے افسر فوج میں مقرر کرے اور ہر ایک ضلع میں ایسے افسر مقرر کرے جس پر اس کو پوری طمانیت ہو تاکہ اگر کسی ضلع میں کوئی سازش پیدا ہو تو وہ اس کا علاج کر سکے۔[2]

میری رائے میں جس قدر گورنمنٹ انگریزی کی عمل داری پر طمانیت اور اس کو ہندوستان میں استقلال ہوتا جائے گا اور جس قدر ارتباط بڑھے گا اسی قدر ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بھلائی اور بہبودی اور ہر قسم کی ترقی کا باعث ہوگا۔[3]

اگر میری قسمت میں ہو کہ میں وائسرائے ہو جاؤں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ..... نہایت مضبوط وائسرائے کے طور پر ملکہ معظمہ کی حکومت ہندوستان میں قائم رکھوں۔[4]

ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (Eternal)* ہونی چاہیے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لئے ہے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا ان کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی و بہتری کے لئے ہے۔[5]

انگریزوں کی مذہباً اطاعت کا بیان

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی' جس کے سایہ عاطفت میں ہم امن و امان سے

* دائمی۔ ابدی

۱۔ بروایت حالی، حیات جاوید (۲)، ص ۳۳۰ ۔ ۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۷۰
۳۔ ایضاً، ص ۲۶ ۔ ۴۔ ایضاً، ص ۳۴۸ ۔ ۵۔ ایڈریس اور اسپیچز، ص ۵۵

زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ میری یہ رائے آج کی نہیں ہے بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں۔[۱]

کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں یہ بہتر ہے کہ انگریزوں سے دشمنی رکھیں؟ دریا میں رہیں اور مگر مچھ سے بیر؟ اور کیا درحقیقت مذہب اسلام کا یہ حکم ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ مذہب کی رو سے ہمارا فرض ہے کہ ہم بادشاہ وقت کی، گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، دل سے اطاعت کریں۔[۲]

حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو خواہ تمہارے ساتھ ظلم و ستم ہوتا ہو یا وہ انصاف اور مروّت سے پیش آتے ہوں۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس مذہب کا ہو۔ پس تمام مسلمانوں کو ان حدیثوں کا ماننا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے اور ان ہی حدیثوں کی رو سے لازم آتا ہے کہ تمام مسلمان، جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں، نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں۔[۳] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

کوئی شخص، کوئی متنفس اس سے انکار نہ کرے گا کہ رعایا پر، وہ کسی حاکم کی رعایا ہو، کچھ فرائض ہوتے ہیں جن میں سے بڑا فرض یہ ہے کہ رعایا اپنے حاکم کی وفادار اور خیر خواہ ہو۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں یہ کہوں گا کہ یہ فرض صرف عقلی اور انسانیت ہی کا نہیں ہے بلکہ ہمارے مذہب، ہمارے خدا کا حکم ہے، رسولؐ کا حکم ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو، گو وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو۔[۴]

......وہ تو کالے نہیں، بہت گورے ہیں۔ تو ہم ان گورے منہ والوں کی، جن کو خدا نے ہم پر حاکم کیا ہے، کیوں نہ اطاعت اور وفاداری کریں اور خدا کا حکم بجالائیں؟[۵]

ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً

۱۔ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم)، ص ۱۶۹ ۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۱۳۴

۳۔ آخری مضامین، ص ۱۱۳ ۴۔ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۱۷ ۵۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۷۴

و فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔[1]
(ستمبر ۱۸۹۷ء)

انگریزوں پر جہاد کی حرمت

مسلمانوں کے مذہب بموجب ہماری گورنمنٹ کی عمل داری میں جہاد نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم تمام مسلمان ہندوستان کے برٹش گورنمنٹ کے امن میں ہیں اور مستامن ان لوگوں پر، جن کے امن میں ہے، جہاد نہیں کر سکتا۔[2]

کسی مسلمان کو ایسے منصوبوں میں شریک ہونا حلال نہ ہوگا جن کی بنا اس ارادہ پر ہو کہ گورنمنٹ انگریزی کو تہ و بالا کر دیں۔ اور اگر بالفرض گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے کچھ دست درازی بھی ہو تو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں، نہ کہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں بغاوت اختیار کریں۔[3]

اگر چہ ہماری گورنمنٹ کسی کے دین و مذہب میں مداخلت نہیں کرتی اور نہ کرے گی......
لیکن بالفرض اگر کرے تو بھی مسلمان غدر اور بغاوت نہیں کر سکتے۔ ہاں، ہجرت کر جانے کے مختار ہیں۔[4]

انگلش گورنمنٹ کی رعایا ہو کر وہ انگلش گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کا فساد یا مخالفت یا بغاوت قولاً و فعلاً نہیں کر سکتے۔[5] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

مسلمانانِ ہند کو اپنے حکام پر جہاد کرنا حلال نہیں ہے بلکہ وہ ایک قسم کی بغاوت ہے، اور جو کوتاہ اندیش اس میں شریک ہوں وہ اپنے مذہب کے بموجب سزائے قتل کے سزاوار ہیں، اور اگر ایسے لوگوں کی نسبت مجھ سے کوئی رائے دریافت کرے تو ثبوت جرم کے بعد بموجب شرع محمدیہ کے میں بھی یہی حکم دوں۔[6]

مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مسئلہ جہاد

مولوی محمد اسماعیل صاحب اور سید احمد صاحب نے ان سکھوں پر جہاد کیا تھا جو اپنی

---

[1] آخری مضامین، ص ۱۰۱ [2] لائل محمڈنز (۲)، ص ۱۳ [3] مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۲۵ [4] لائل محمڈنز (۲)، ص ۱۷-۱۸ [5] آخری مضامین، ص ۱۱۳ [6] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۲۸ پریل ۱۸۷۱ء)، ص ۲۶۴

مسلمان رعایا کو تکلیف پہنچاتے تھے۔ مجاہدین کے پیشوا سید احمد صاحب تھے مگر وہ واعظ نہ تھے۔ واعظ مولوی محمد اسماعیل صاحب تھے جن کی نصیحتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ایسا ولولہ اثر خیز پیدا ہوتا تھا جیسا کہ کسی بزرگ کی کرامت کا اثر ہوتا ہے مگر اس واعظ نے اپنے زمانہ میں کبھی کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالا جس سے ان کے ہم مشربوں کی طبیعت ذرا بھی گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے منحرف ہو کر برافروختہ ہو۔ بلکہ ایک مرتبہ وہ کلکتہ میں سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے، اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو کافر ہیں؟ اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی، اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لئے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔ پس اُس زمانہ میں ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے ہندوستان میں جمع ہو گیا۔ مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے ان کو صاف لکھا کہ تم کو اس معاملہ میں ہرگز دست اندازی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ان کا ارادہ کچھ گورنمنٹ انگریزی کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔[1]

مولوی محمد اسماعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کیا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت اس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کی امان میں رہتے ہیں، ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے، اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا افساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔[2]

جس جہاد کا منصوبہ ہندوستان میں ہوا تھا وہ سکھوں کی نسبت تھا، گورنمنٹ انگریزی پر حملہ کے واسطے نہ تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جو لوگ مذہبی جوش کے پیدا کرنے میں ایسے سرگرم تھے کہ وہ اپنے جوش میں اکثر سکھوں سے لڑتے تھے، دس برس تک گورنمنٹ انگریزی پر حملہ کرنے سے باز نہ رہتے۔[3]

1۔ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۱۹-۲۲ 2۔ اسباب سرکشی ہندوستان، ص ۶ 3۔ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۴۳

غیر سلطنتیں اور ہندوستانی مسلمان

غیر سلطنتوں کے ساتھ جنگ میں ہمارا فرض

ہم سب مسلمان ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں اور اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے جو گورنمنٹ کے برخلاف ہو۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کر لے، برما لے لے، افغانستان سے لڑے، اس سے صلح کرے ان سے ہم لوگ، جو ملک کے باشندے ہیں، کچھ سروکار نہیں رکھتے۔[2]

انگریزوں نے ہندوستان کو اور اس کے ساتھ ہم کو فتح کر لیا ہے اور جس طرح ہم نے اس ملک کو تابع دار یا غلام بنا لیا تھا اسی طرح انہوں نے ہم کو بھی تابع دار یا غلام بنا لیا ہے۔ پھر کیا یہ اصول سلطنت کے مطابق ہے کہ وہ ہم سے پوچھیں کہ ہم برما جا کر لڑیں یا نہ لڑیں؟ ایسا کبھی ہوا ہے اور سلطنت کا کوئی اصول اس کے موافق ہے؟ جس زمانے میں کہ مسلمانوں کی حکومت تھی اور وہ ہندوستان کے کسی ملک پر فوج کشی کرتے تھے تو کیا یہ اصول سلطنت کے مطابق تھا کہ وہ بادشاہ ہندوستان کی رعایا سے پوچھتے کہ ہم اس ملک کو فتح کریں یا نہ کریں؟ وہ کس سے پوچھتے؟ کیا ان سے جن کو انہوں نے فتح کیا اور اپنا غلام بنا لیا اور اب ان ہی کے دوسرے بھائیوں کو غلام بنانے کا ارادہ کرتے ہیں؟ ہماری قوم نے خود بھی سلطنت کی ہے اور ہماری قوم کے لوگ اب بھی سلطنت کر رہے ہیں۔ کیا کوئی اصول ایسا ہے جس سے سلطنت کا غیر قوم پر اس طرح سے کام چل سکے؟[3]

اسلام کا درست اور صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جو مسلمان کسی غیر مسلمان بادشاہ کی حکومت میں بطور رعیت کے مستامن ہو کر رہتے ہیں، ان کو مذہب اسلام کی رو سے اجازت نہیں ہے کہ وہ اس بادشاہ کے ساتھ کسی وقت دغا بازی کریں یا فساد پھیلائیں۔ دیگر یہ کہ غیر مسلمان اور مسلمان

۱۔ آخری مضامین، ص ۶۱ ۲۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۳۶ ۳۔ ایضاً، ص ۳۶۸

مسلمان رعایا کو تکلیف پہنچاتے تھے مجاہدین کے پیشوا سید احمد صاحب تھے مگر وہ واعظ نہ تھے۔ واعظ مولوی محمد اسماعیل صاحب تھے جن کی نصیحتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ایسا ولولہ اثر خیز پیدا ہوتا تھا جیسا کہ کسی بزرگ کی کرامت کا اثر ہوتا ہے مگر اس واعظ نے اپنے زمانہ میں کبھی کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالا جس سے ان کے ہم مشربوں کی طبیعت ذرا بھی گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے منحرف ہو کر برافروختہ ہو۔ بلکہ ایک مرتبہ وہ کلکتہ میں سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے، اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو کافر ہیں؟ اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی، اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لئے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔ پس اُس زمانہ میں ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے ہندوستان میں جمع ہو گیا۔ مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے ان کو صاف لکھا کہ تم کو اس معاملہ میں ہرگز دست اندازی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ان کا ارادہ کچھ گورنمنٹ انگریزی کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔[1]

مولوی محمد اسماعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کیا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت اس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے، جو سرکار انگریزی کی امان میں رہتے ہیں، ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے، اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا افساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔[2]

جس جہاد کا منصوبہ ہندوستان میں ہوا تھا وہ سکھوں کی نسبت تھا، گورنمنٹ انگریزی پر حملہ کے واسطے نہ تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جو لوگ مذہبی جوش کے پیدا کرنے میں ایسے سرگرم تھے کہ وہ اپنے جوش میں اکثر سکھوں سے لڑتے تھے، دس برس تک گورنمنٹ انگریزی پر حملہ کرنے سے باز نہ رہتے۔[3]

---

۱ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۱۹-۲۱ ۲ اسباب سرکشی ہندوستان، ص ۶ ۳ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۲۱

غیر سلطنتیں اور ہندوستانی مسلمان

غیر سلطنتوں کے ساتھ جنگ میں ہمارا فرض

ہم سب مسلمان ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں اور اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولیٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے جو گورنمنٹ کے برخلاف ہو۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کر لے، برما لے لے، افغانستان سے لڑے، اس سے صلح کرے ان سے ہم لوگ، جو ملک کے باشندے ہیں، کچھ سروکار نہیں رکھتے۔[2]

انگریزوں نے ہندوستان کو اور اس کے ساتھ ہم کو فتح کر لیا ہے اور جس طرح ہم نے اس ملک کو تابع دار یا غلام بنا لیا تھا اسی طرح انہوں نے ہم کو بھی تابع دار یا غلام بنا لیا ہے۔ پھر کیا یہ اصول سلطنت کے مطابق ہے کہ وہ ہم سے پوچھیں کہ ہم برما جا کر لڑیں یا نہ لڑیں؟ ایسا کبھی ہوا ہے اور سلطنت کا کوئی اصول اس کے موافق ہے؟ جس زمانے میں کہ مسلمانوں کی حکومت تھی اور وہ ہندوستان کے کسی ملک پر فوج کشی کرتے تھے تو کیا یہ اصول سلطنت کے مطابق تھا کہ وہ بادشاہ ہندوستان کی رعایا سے پوچھتے کہ ہم اس ملک کو فتح کریں یا نہ کریں؟ وہ کس سے پوچھتے؟ کیا ان سے جن کو انہوں نے فتح کیا اور اپنا غلام بنا لیا اور اب ان ہی کے دوسرے بھائیوں کو غلام بنانے کا ارادہ کرتے ہیں؟ ہماری قوم نے خود بھی سلطنت کی ہے اور ہماری قوم کے لوگ اب بھی سلطنت کر رہے ہیں۔ کیا کوئی اصول ایسا ہے جس سے سلطنت کا غیر قوم پر اس طرح سے کام چل سکے؟[3]

اسلام کا درست اور صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جو مسلمان کسی غیر مسلمان بادشاہ کی حکومت میں بطور رعیت کے مستامن ہو کر رہتے ہیں، ان کو مذہب اسلام کی رو سے اجازت نہیں ہے کہ وہ اس بادشاہ کے ساتھ کسی وقت دغابازی کریں یا فساد پھیلائیں۔ دیگر یہ کہ غیر مسلمان اور مسلمان

---

[1] آخری مضامین، ص ۶۱ [2] مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۳۶ [3] ایضاً، ص ۳۶۸

بادشاہ میں جنگ کرنے کی صورت میں اس مسلمان رعایا کو، جو مقدم الذکر بادشاہ کی سلطنت میں مستامن ہے، مذہب کی رو سے اس بات کی قطعی ممانعت ہے کہ وہ مسلمان بادشاہ کا ساتھ دیں یا اس کی کسی طرح سے مدد کریں۔[1] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

انگریزوں کی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی حالت میں کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے، اور اگر وہ ایسا کریں تو گنہ گار خیال کئے جائیں گے کیونکہ ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کو توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔[2]

خلافت اور سلطانِ ترکی

خلیفہ کو ضرور لازم ہے کہ وہ ملک پر قبضہ اور سلطنت رکھتا ہو اور احکام حدود و قصاص اس میں جاری کر سکتا ہو۔ اس کا حکم اس میں جاری ہو، دین کی حمایت کرتا ہو، دشمنوں کے ہاتھ سے اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو محفوظ رکھ سکتا ہو اور اس ملک میں امن قائم رکھنے کی قوت اس کو حاصل ہو۔ پس جس ملک میں کسی مسلمان بادشاہ کو ایسا اختیار اور اقتدار نہ ہو وہ اس ملک کے لئے یا اس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہوسکتا، نہ خلیفہ کہلایا جاسکتا ہے۔[3] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

جو سلطان کسی ملک پر حکومت رکھتے ہیں وہ اس ملک کا سلطان کہلانے کے مستحق ہیں، اور درحقیقت وہ اس ملک کے سلطان بھی ہیں گو انہوں نے اپنے تئیں کسی لقب سے ملقب کیا ہو۔[4] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہیں اور گورنمنٹ انگریزی میں مستامن ہوکر رہتے ہیں۔ گورنمنٹ انگریزی نے ہم کو امن دیا ہے اور ہم کو ہر طرح پر مذہبی آزادی بخشی ہے...... سلطان عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ کی ہم رعیت نہیں ہیں نہ ان کو ہم پر، ہمارے ملک پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہے۔ پس وہ بلاشبہ ایک مسلمان بادشاہ ہیں اور بوجہ

---

[1] مکاتیب سرسید احمد خاں، ص ۷۷ [2] ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص ۸۷ [3] آخری مضامین، ص ۱۰۰
[4] ایضاً، ص ۱۱۱

اتحاد اسلامی کے ہم ان کی بھلائی سے خوش اور ان کی برائی سے ناخوش ہوتے ہیں، مگر کسی طرح نہ شرعاً نہ مذہباً خلیفہ ہیں اور نہ خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی حق خلافت ہے تو وہ اسی ملک پر اور اسی ملک کے مسلمانوں پر محدود ہے جو اُن کی عمل داری میں رہتے ہیں۔[1] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

ہمارے نزدیک یہ بات کہ مسلمان سلطان کو ایک مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں اور اس لئے اس کی ہمدردی کرتے ہیں، ایک لغو و مہمل بات ہے بلکہ یہ ہمدردی ایک قدرتی طبعی بات ہے اور تعلیم سے اور اخبارات سے اور سفر کی آسانی سے، جو اس زمانہ میں حاصل ہے اور جس کے سبب سے سلطنت ٹرکی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی آمد و رفت بہت زیادہ ہوگئی ہے، اس ہمدردی کو بہت کچھ ترقی ہوگئی ہے۔[2]

ترکی کا شیخ الاسلام

شیخ الاسلام کا عہدہ سلطنت ترکی میں درحقیقت ایک بہت بڑا معزز عہدہ ہے...... یہ عہدہ ہمیشہ ایسے شخص کو دیا جاتا ہے جو بہت بڑا عالم اور حنفی مذہب ہو اور مسائل فقہ حنفی سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔ اس کو کوئی ایسا حق یا اختیار نہیں ہے کہ کوئی جدید حکم، مثل حکم شرع کے، جاری کر سکے یا ان حکموں میں سے، جو شرع میں ہیں، کوئی حکم منسوخ یا ترمیم کر سکے بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جو واقعات پیش آئیں ان کی نسبت بتادے کہ فقہ حنفی کا کیا حکم ہے۔[3]

ہندوستان کے مسلمانوں کو قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے، نہ کوئی اس کا حکم ان پر واجب التعمیل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ٹرکی کے مسلمانوں کی حالت سے ازروئے احکام مذہب اسلام کے بالکل مختلف ہے۔ ہندوستان کے مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں اور اس کے امن میں رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ٹرکی کے مسلمان ایسے نہیں ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ دونوں کے لئے احکام مذہبی مختلف ہیں۔ شیخ الاسلام کا کوئی حکم ہندوستان کے مسلمانوں سے مذہباً متعلق نہیں ہو سکتا۔[4]

---

[1] آخری مضامین، ص ۱۰۱ [2] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۰۵ [3] ایضاً، ص ۴۰۳
[4] ایضاً، ص ۴۰۵

یونان پر ترکی کی فتح کا جشن (۱۸۹۷ء)

یونانیوں پر ٹرکی کی فتح کی خوشی میں مسلمانوں نے حد اعتدال سے باہر قدم رکھا ہے' ترکوں کی اس فتح کو اسلام کی فتح سے پکارتے ہیں۔ ہماری دانست میں ایسے امور میں اسلام کو شامل کرنا اور ''اسلام' اسلام'' پکارنا نہایت ناسمجھی کی بات ہے...... ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ میں فتحیاب ہوئی اور برباد نہیں ہوئی لیکن اس کو ایک اسلامی لباس پہنانا اور ''اسلام کی فتح' اسلام کی فتح'' پکارنا اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور یہ فتح ایسی کون سی فتح ہے جس پر اتنا شور وغل مچایا جائے؟ ہر شخص جانتا تھا کہ ترکوں کے آگے یونانیوں کی کچھ حقیقت نہیں ہے' اگر وہ مقابلہ کریں گے تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے اسی طرح ترک یونانیوں کو مار لیں گے۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

جن لوگوں نے اس زمانہ میں ترکی کی فتحیابی پر ہندوستان میں متعدد جلسے کیے اور سلطان کو مبارک بادی کے تار اور ایڈریس بھیجے، وہ خود سمجھتے ہوں گے کہ اس خفیف الحرکتی سے کیا نتیجہ ہے۔ یورپ کی سلطنتوں کی پالیسی ٹرکی کی نسبت جو ہوئی ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے مسلمان سلطان ٹرکی کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور اس خوشی منانے سے سلطان کو کیا فائدہ ہوا؟ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو' جنھوں نے یہ خوشی منائی' کیا نتیجہ حاصل ہوا بجز اس کے کہ چند حمقا اور جاہلوں نے یہ سمجھا کہ سلطان ٹرکی کی فتح یابی پر خوشی منانے والے نہایت پکے مسلمان ہیں جو سلطان کی فتح یابی پر خوشی مناتے ہیں' اور خوشی منانے والوں نے اپنی بزرگی اور تقدس کو احمقوں اور جاہلوں کے نزدیک ثابت کرنا چاہا۔[2] (اگست ۱۸۹۷ء)

سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا لیکن جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا' بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ کے' ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ گورنمنٹ نے اس پر اعتنا نہیں کیا مگر جن مسلمانوں کو ایسا کرنا تھا ہمارے نزدیک ضرور تھا کہ اولاً گورنمنٹ سے اس کی اجازت حاصل کرتے اور اس کے بعد جو کچھ ان کو کرنا تھا' کرتے۔ ہم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ایسے پولیٹکل امور میں' جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں' بلا اجازت اور مرضی

---

[1] آخری مضامین، ص ۵۹-۶۰ [2] ایضاً، ص ۸۷

گورنمنٹ ہندوستان کے مسلمانان ہندوستان کوئی کارروائی کریں کیونکہ قانونی اور مذہبی فرض یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی گورنمنٹ کے وفادار اور اس کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہیں۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

مسلمانوں نے جو نالائق حرکتیں اس زمانے میں کی ہیں اور اخبارات میں لغو اور دور از کار تحریریں لکھی ہیں اگر انگریز اس سے بدگمان ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ مگر یہ باتیں چند روزہ ہیں اور پھر تمام امور حسب معمول ہو جائیں گے۔ میں نے ان دنوں میں چند آرٹیکل سوسائٹی کے اخبار میں لکھے ہیں * ...... اور خصوصاً جو آرٹیکل ۱۱ ستمبر کے اخبار میں درباب خلافت لکھا ہے وہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔[2] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

یہ انگلش گورنمنٹ کا رحم ہے جس نے ان باتوں پر کچھ مواخذہ نہیں کیا۔ تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالتخصیص مسلمانوں کی خیر و عافیت اسی میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے کہ جن کی ہم رعیت ہو کر اور مستامن ہو کر رہتے ہیں ان کے ساتھ وفادار رہیں اور ان کی بدخواہی نہ اپنے دل میں لائیں، نہ بدخواہوں کے ساتھ شریک ہوں، ان کو اپنا دنیوی شہنشاہ اور خداوند تعالیٰ جل شانہ کو شہنشاہوں کا شہنشاہ اور اپنا مالک حقیقی سمجھتے رہیں۔[3] (اگست ۱۸۹۷ء)

یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے خلاف ہے، نہایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی۔[4] (جون ۱۸۹۷ء)

اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو تب بھی از روئے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کا ہے اس سے ہم کسی طرح

---

* متذکرہ مضامین بعنوان ''خلافت اور خلیفہ''، ''یونانی اور ترک''، ''ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی''، ''ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ''، ''خلافت'' اور ''امام اور امامت'' سوسائٹی کے اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں سرسید کے انتقال سے چند ماہ قبل بالترتیب ۵ جون، ۱۲ جون، ۱۷ جولائی، ۱۲ اگست، ۱۱ ستمبر اور ۱۸ ستمبر کے شماروں میں شائع ہوئے۔

[1] آخری مضامین، ص ۶۹ [2] خطوط سرسید، ص ۳۱۹ [3] آخری مضامین، ص ۹۵ [4] ایضاً، ص ۲۰

یونان پر ترکی کی فتح کا جشن (۱۸۹۷ء)

یونانیوں پر ترکی کی فتح کی خوشی میں مسلمانوں نے حد اعتدال سے باہر قدم رکھا ہے' ترکوں کی اس فتح کو اسلام کی فتح سے پکارتے ہیں۔ ہماری دانست میں ایسے امور میں اسلام کو شامل کرنا اور ''اسلام' اسلام'' پکارنا نہایت ناسمجھی کی بات ہے...... ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ میں فتحیاب ہوئی اور برباد نہیں ہوئی لیکن اس کو ایک اسلامی لباس پہنانا اور ''اسلام کی فتح' اسلام کی فتح'' پکارنا اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور یہ فتح ایسی کون سی فتح ہے جس پر اتنا شور و غل مچایا جائے؟ ہر شخص جانتا تھا کہ ترکوں کے آگے یونانیوں کی کچھ حقیقت نہیں ہے' اگر وہ مقابلہ کریں گے تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے اسی طرح ترک یونانیوں کو مار لیں گے۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

جن لوگوں نے اس زمانہ میں ترکی کی فتحیابی پر ہندوستان میں متعدد جلسے کئے اور سلطان کو مبارک بادی کے تار اور ایڈریس بھیجے، وہ خود سمجھتے ہوں گے کہ اس خفیف الحرکتی سے کیا نتیجہ ہے۔ یورپ کی سلطنتوں کی پالیسی ٹرکی کی نسبت جو ہوئی ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے مسلمان سلطان ٹرکی کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور اس خوشی منانے سے سلطان کو کیا فائدہ ہوا؟ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو' جنھوں نے یہ خوشی منائی' کیا نتیجہ حاصل ہوا بجز اس کے کہ چند حمقا اور جاہلوں نے یہ سمجھا کہ سلطان ٹرکی کی فتح یابی پر خوشی منانے والے نہایت پکے مسلمان ہیں جو سلطان کی فتح یابی پر خوشی مناتے ہیں' اور خوشی منانے والوں نے اپنی بزرگی اور تقدس کو احمقوں اور جاہلوں کے نزدیک ثابت کرنا چاہا۔[2] (اگست ۱۸۹۷ء)

سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا لیکن جو کچھ ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا' بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ کے' ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ گورنمنٹ نے اس پر اعتنا نہیں کیا مگر جن مسلمانوں کو ایسا کرنا تھا ہمارے نزدیک ضرور تھا کہ اولاً گورنمنٹ سے اس کی اجازت حاصل کرتے اور اس کے بعد جو کچھ ان کو کرنا تھا' کرتے۔ ہم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ایسے پولیٹکل امور میں' جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں' بلا اجازت اور مرضی

---

[1] آخری مضامین، ص ۵۹-۶۰ [2] ایضاً، ص ۷۸

گورنمنٹ ہندوستان کے مسلمانان ہندوستان کوئی کارروائی کریں کیونکہ قانونی اور مذہبی فرض یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی گورنمنٹ کے وفادار اور اس کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہیں۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

مسلمانوں نے جو نالائق حرکتیں اس زمانے میں کی ہیں اور اخبارات میں لغو اور دور از کار تحریریں لکھی ہیں اگر انگریز اس سے بدگمان ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ مگر یہ باتیں چند روزہ ہیں اور پھر تمام امور حسب معمول ہو جائیں گے۔ میں نے ان دنوں میں چند آرٹیکل سوسائٹی کے اخبار میں لکھے ہیں * ...... اور خصوصاً جو آرٹیکل ۱۱ ستمبر کے اخبار میں در باب خلافت لکھا ہے وہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔[2] (ستمبر ۱۸۹۷ء)

یہ انگلش گورنمنٹ کا رحم ہے جس نے ان باتوں پر کچھ مواخذہ نہیں کیا۔ تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالتخصیص مسلمانوں کی خیر و عافیت اسی میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے کہ جن کی ہم رعیت ہو کر اور مستامن ہو کر رہتے ہیں ان کے ساتھ وفادار رہیں اور ان کی بدخواہی نہ اپنے دل میں لائیں، نہ بدخواہوں کے ساتھ شریک ہوں، ان کو اپنا دنیوی شہنشاہ اور خداوند تعالیٰ جل شانہ کو شہنشاہوں کا شہنشاہ اور اپنا مالک حقیقی سمجھتے رہیں۔[3] (اگست ۱۸۹۷ء)

یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے خلاف ہے، نہایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی۔[4] (جون ۱۸۹۷ء)

اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو تب بھی از روئے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کا ہے اس سے ہم کسی طرح

---

* متذکرہ مضامین بعنوان ''خلافت اور خلیفہ''، ''یونانی اور ترک''، ''ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی''، ''ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ''، ''خلافت'' اور ''امام اور امامت'' سوسائٹی کے اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں سرسید کے انتقال سے چند ماہ قبل بالترتیب ۵ جون، ۱۲ جون، ۱۷ جولائی، ۱۴ اگست، ۱۱ ستمبر اور ۱۸ ستمبر کے شماروں میں شائع ہوئے۔

[1] آخری مضامین، ص ۲۹ [2] خطوط سرسید، ص ۳۱۹ [3] آخری مضامین، ص ۷۹ [4] ایضاً، ص ۴۰

سبکدوش نہیں ہو سکتے، اور ایسی حالت میں بھی ہمارا فرض ہے کہ اپنی گورنمنٹ کے مطیع، فرماں بردار اور وفادار رہیں۔ بہت سے بہت اگر کچھ کر سکتے ہیں تو یہ ہے کہ خدا سے دعا کیا کریں کہ برٹش گورنمنٹ اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں، خواہ وہ ٹرکی کی ہو یا ایران یا افغانستان کی یا اور کسی دور دراز ملک کی، دوستی اور ارتباط رہے اور کبھی مخالفت پیدا نہ ہو۔[۱] (جون ۱۸۹۷ء)

ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہباً یہ فرض ہے کہ اپنے بادشاہ کی، جس کی وہ رعیت ہیں اور جس کے امن میں مذہبی آزادی سے وہ بسر کرتے ہیں، ہمیشہ اس کے تابع رہیں گو وہ ترکوں کے ساتھ کیسی ہی ہمدردی رکھتے ہوں اور گو ٹرکی میں اور خود قسطنطنیہ میں کچھ ہی ہوا کرے۔ فرض کرو کہ اگر خود انگلش گورنمنٹ بجائے روس کے ہوتی اور ترکوں کا ملک بظلم چھین لینا چاہتی اور گو اس بات سے کیسا ہی رنج و غم اور غصہ اور آزردگی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہوتی اس پر بھی مذہب کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں، جہاں ان کو امن اور مذہبی آزادی ہے، بجز انگریزی گورنمنٹ کی اطاعت کے اور کچھ چارہ نہیں۔[۲]

جدید سیاست ہند

جمہوری طریقہ کی ناموزونیت

میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لئے یکساں موزوں ہے۔ میری رائے میں یہ طریقہ عقلاً بھی ناممکن ہے...... حقیقی امر یہ ہے جیسا کہ مسٹر کارلائل مرحوم نے، جن سے مجھے ذاتی واقفیت رکھنے کی عزت حاصل تھی، کہیں کہا ہے کہ کثرت انسان عقل مندی سے بہت دور ہیں۔ یہ خیال فیاض نہ ہو مگر بدقسمتی سے ٹھیک ہے۔[۳]

سلطنت جمہوری کی کامیابی کے لئے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ اس آبادی میں ہم جنسیت ہو اور جتنے وہ زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ جمہوری حکومت میں ضروری اور

---

[۱] آخری مضامین، ص ۵۴ [۲] تہذیب الاخلاق (۲)، ص ۴۰۵ [۳] مکتوبات سرسید، ص ۶۲۷

خیال کرلیا جاتا ہے کہ افراد ایسے ہی مشابہ ہیں جیسے دو مٹر کے دانے۔[۱]

کل دنیا کے ممالک میں سے ہندوستان' جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں' ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقے کے لئے موزوں ہے...... مسلمانوں کی آئندہ بہبودی اور ترقی کے لئے بحیثیت ملکہ معظمہ انگلستان اور قیصرہ ہند کی باامن اور تابع اور وفادار رعایا ہونے کے میں' بوجہ برٹش سبجیکٹ (British Subject)★[1] اور وفادار سٹیزن (Citizen)★[2] کے اور اپنے ہم وطنوں کا عموماً اور اپنے ہم مذہب مسلمانوں کا خصوصاً سچا خیر خواہ ہونے کے' بہت زیادہ اور سخت مخالف ہوں کل ایسی جمہوری تحریکوں کا جو برٹش رول (Rule)★[3] کے خلاف شکایتیں اور رنجشیں بھڑکاتی ہیں اور اس ملک میں' جہاں مختلف اقوام اور مذاہب آباد ہیں' اس کی اعلیٰ قوت اور اختیار کو تزلزل میں ڈالتی ہیں۔[۲]

فرض کیجیے کہ وائسرائے کی کونسل اس قاعدہ سے ہو جس کی خواہش ہے یعنی اس میں رعایا کے انتخاب سے ممبر مقرر ہوں اور انتخاب کی صورت میں یوں فرض کیجیے کہ تمام مسلمان ایک مسلمان ممبر ہونے کے لئے ووٹ دیں اور ایک ہندو کے لئے کل ہندو ووٹ دیں اور گنئے کہ مسلمان کے کتنے ووٹ ہوئے اور ہندو ممبر کے کتنے؟ یقینی ہندو ممبر کے چوگنے ووٹ ہوں گے کیونکہ وہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں۔ پس میتھمیٹکس (Mathematics)★[4] کے ثبوت سے ایک ووٹ مسلمان ممبر کے لئے ہوگا اور چار ووٹ ہندو ممبر کے لئے۔ پس مسلمانوں کا ٹھکانا ہندوؤں کے مقابل کہاں رہے گا؟ اور جوئے کے اصول کے مطابق چار پانسے ہندوؤں کے لئے اور ایک پانسہ ہمارے لئے ہوگا۔[۳]

نمائندہ حکومت بنانے کا غیر معقول مطالبہ

اس سے پہلے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا خیال بھی ہوا ہو' میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزنٹیٹو (Representative)★[5] گورنمنٹ ہندوستان کے مناسب حال ہے؟ اول لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لئے' جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر چلتا ہو یہ

★[1] برطانوی رعیت کا فرد ★[2] شہری۔باشندہ ★[3] حاکمیت ★[4] ریاضی ★[5] نمائندہ

[۱] مکتوبات سرسید، ص ۶۲۵ [۲] ایضاً، ص ۶۲۸ [۳] مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۰۳

ہے کہ ووٹرز (Voters) ★[1] میں ہم جنسیت ہو بلحاظ قوم کے اور مذہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے۔ یعنی ریپریزنٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلّم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو۔ اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقہ حکومت عمل میں آ سکتا ہے یا مفید ہوسکتا ہے۔ جہاں یہ امور موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں، سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا۔[1]

آیا کوئی ایسی نظیر دنیا میں ہے کہ ایک غیر قوم نے غیر قوموں کو فتح کر کے ان پر حکومت کی ہو اور اس مفتوح قوم نے اس بات کا دعویٰ کیا ہو کہ ان کو ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ ملنے کا حق ہے؟......اور کبھی ایسا نہیں ہوا، بلکہ جس نے ہم کو فتح کیا ہے اس کو ہم پر اپنی حکومت قائم رکھنا ضرور ہے۔ ہاں، جب حاکم اور محکوم ایک قوم ہوں تو ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ قائم ہوسکتی ہے...... لیکن ایسے ملک میں جہاں دوسری قوم حکومت کرتی ہے، یہ خیال کرنا کہ وہاں بھی ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ قائم ہو، خیال محال ہے اور نہ آج تک دنیا کے کسی ملک کی تاریخ میں اس کا پتہ مل سکتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ ہم کونسل میں الیکشن سے ممبر مقرر کریں گے، اصول گورنمنٹ کے برخلاف ہے اور کوئی گورنمنٹ ہو، انگریز یا جرمن یا فرانس یا روس یا مسلمان، اس اصول کو کسی طرح تسلیم نہیں کرسکتی۔[2]

مجھ کو یقین ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصہ اب تک اس درجہ کو نہیں پہنچا ہے جب کہ ریپریزنٹیشن (Representation) ★[2] کا قاعدہ معاملات مختص المقام کے لحاظ سے بھی پورا پورا ہندوستان میں جاری کیا جائے۔[3]

یہ امر واجب ہو یا ناواجب، مگر ایک مسلمان موچی سے لے کر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہیں ہوگا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے کہ ہم دوسری قوم کے، جو ہمارے

★1. رائے دہندگان ★2 نمائندگی

۱۔ مکتوبات سرسید، ص ۲۳۴ ۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۳۶۷ ۳۔ ایضاً، ص ۱۶۵

ساتھ رہتی ہے، حلقہ غلامی میں آ جائیں۔[1]

کوئی طریقہ بھی الیکشن کا اختیار کرو، ہندوؤں کی تعداد مسلمان سے چوگنی ہوگی اور جو اُن کی خواہشیں ہوں گی وہ کامیاب ہوں گی اور کل ملک کی قانونی حکومت بنگالیوں کے ہاتھ میں یا ہندو بنگالی نما کے ہاتھ میں ہوگی اور مسلمان نہایت ذلت کی حالت میں پڑ جائیں گے..... ہم اپنی قوم کا اس ذلت میں پڑنا پسند نہیں کرتے اور کم سے کم یہ کہ ہم ایسے امور میں جن کے سبب ہماری قوم ذلت میں پڑے، شریک ہونا نہیں چاہتے۔[2]

کانگرس کے مقاصد اور مسلمان

''جب تک کہ گورنمنٹ کی برائیاں، صحیح یا غلط، واجب یا ناواجب، عام لوگوں میں نہ پھیلائی جائیں اس وقت تک بمقابلہ گورنمنٹ کے عام ایجی ٹیشن کی بنیاد قائم ہی نہیں ہوسکتی'' اس خیال پر نیشنل کانگرس کا وجود ہوا اور اس نے گورنمنٹ کی نسبت، جہاں تک ہو سکا، برائیوں کو تمام ہندوستان میں پھیلایا اور جن باتوں پر اس سے پہلے لوگوں کو خیال بھی نہ تھا ان کو ایک برائی کے پیرایہ میں بیان کر کے لوگوں کو چوکنا کر دیا اور برٹش گورنمنٹ کی صورت کو ایک خودغرض گورنمنٹ اور ہندوستان کو لوٹنے والی گورنمنٹ بنا کر لوگوں کو دکھایا اور اپنے گروہ کو ایک تعلیم یافتہ لوگوں کا گروہ قرار دیا۔ جن کی پیروی ان تمام لوگوں نے اختیار کی جو کالجوں سے تعلیم پا چکے تھے اور جو تعلیم پا رہے تھے، یہاں تک کہ اسکول کے لڑکوں، جو اے بی سی ڈی کا تلفظ بھی بخوبی ادا نہیں کر سکتے تھے، ان کی پیروی کرنا اور تعلیم یافتہ گروہ میں شامل ہونا اپنا فخر سمجھا..... مسلمان، سوائے بعض کے، اب تک نیشنل کانگرس میں اور اس کے ایجی ٹیشن میں شامل نہیں ہوئے ہیں، اور جو شامل ہوئے ہیں انہوں نے نہیں سمجھا کہ اس قوم کو اور ملک کو کیا نقصان پہنچتا ہے اور آئندہ پہنچے گا۔[3] (اگست ۱۸۹۷ء)

اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہیں اور اس کے سایہ عاطفت میں ہر قسم کی خوشی اور امن و آزادی سے بسر کرتے ہیں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دونوں قوموں کے باہم پولیٹیکل امور میں اختلاف رائے ہے۔ ہندو اس پولیٹیکل پالیسی کے

---

[1] دی پریزنٹ اسٹیٹ، ص ۶۰ [2] ایضاً، ص ۶۱ [3] آخری مضامین، ص ۷۶-۷۷

طرفدار ہیں جو کانگرس کے اعلیٰ ممبروں یا اس کے حامیوں اور طرف داروں کی ہے اور جس کا ہر سال مختلف مقامات میں کانگرس کے نام سے اعلان کیا جاتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلمان اس پالیسی کے برخلاف ہیں۔ لوگ ان پر اتہام لگاتے ہیں کہ گورنمنٹ کے خوشامدی ہیں لیکن یہ اتہام غلط ہے' بلکہ مسلمانوں کے نزدیک ملک کے انتظام اور امن میں اس پالیسی سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اور کسی طرح وہ پالیسی ہندوستان کی حالت کے مناسب نہیں ہے۔[۱] (جون ۱۸۹۷ء)

یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اتحاد و دوستی کے باب میں جو میری سابقہ رائے اور خواہش تھی وہ میں نے بدل دی ہے۔ مجھ سے زیادہ اور کوئی اس بات کا خواہش مند نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں قوموں میں دوستی ہو اور دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں..... مگر جب ہمارے ہندو بھائی یا ہمارے بنگالی دوست ایسی چال چلنا چاہتے ہیں جس میں ہمارا نقصان اور ہماری قوم کے لئے ذلت ہے تو بے شک پھر ہم آشنا نہیں رہتے۔ بے شک ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی قوم کو ہندوؤں اور بنگالیوں کے ان حملوں سے بچائیں جن سے ہم کو یقین ہے کہ ہماری قوم کو نقصان پہنچنے والا ہے...... بے شک ہماری قوم ذلت کے گڑھے میں گر پڑی ہے لیکن اگر ہمارے دوست بنگالی یہ چاہیں کہ وہ اس از پا افتادہ قوم کو اپنی جوتیوں کے تلے مسل ڈالیں تو ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم اس کو برداشت کریں گے۔ ان کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری مثال ایک ایسی رسی کی ہے جو بے شک جل گئی ہے مگر اس کا بل نہیں نکلا' وہ بدستور اس میں باقی ہے اور ابھی وہ بالکل ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی' اس میں گرمی بھی باقی ہے۔ یہ سمجھ کر اس کو ہاتھ لگانا چاہیے' ایسا نہ ہو کہ ہاتھ جل جائے...... کانگرس درحقیقت بن ہتھیاروں کی ایک سول وار (Civil War)* ہے۔ سول وار کا مقصد ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کس کے ہاتھ میں رہے۔ نیشنل کانگرس کا بھی یہی مقصد ہے کہ انگلش گورنمنٹ برائے نام ہندوستان کی گورنمنٹ رہے مگر ملک کی اندرونی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے۔ وہ اعلانیہ اپنا خاص نام نہیں لیتے مگر خوب سمجھتے ہیں کہ مسلمان تو اس لائق نہیں ہیں' پھر ملک کی اندرونی

---

* خانہ جنگی

[۱] آخری مضامین، ص ۵۷

حکومت ان ہی کے ہاتھ میں رہے گی...... ہم بھی سول وار کو پسند کرتے مگر بن ہتھیاروں کی سول وار کو نہیں بلکہ ہتھیاروالی سول وار کو۔ اگر گورنمنٹ اندرون ملک کی حکومت اپنے ہاتھ سے منتقل کرنا پسند کرتی ہے تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ قبل اس کے کہ وہ ایک قانون کامپٹیشن (Competition) ★[1] کا پاس کرے اور جو قوم اس کامپٹیشن کے امتحان میں پاس ہو اس کے ہاتھ میں اندرون ملک کی حکومت سپرد کردے۔ مگر اس کامپٹیشن میں دوسرے قسم کے قلم کے کام میں لانے کی اجازت دے جو ہمارے باپ دادا کے لکھنے کا قلم تھا اور جو درحقیقت ملک کی حکومت لکھنے کا قلم تھا۔ پھر جو پاس ہو وہی ملک کی حکومت کرے۔ اگر ہمارے دوست بنگالی پاس ہوں تو بے شک ان کی جوتیاں اٹھائیں گے اور اپنے سر پر رکھیں گے، مگر بغیر ایسی سول وار کے تو ہم اپنی قوم کو ان کی جوتیوں کے تلے روندوانہ پسند نہ کریں گے۔ ہمارے ہم وطن ہندو اور بنگالی بھائیوں کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری عین خواہش ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں آپس میں محبت و دوستی سے ہندوستان میں رہیں، مگر وہ دوستی اس وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی چال نہ چلے۔ اور نیز ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے یہی چال اختیار کی ہے اور پھر اس پر توقع رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ان کے شریک ہوں، ایں خیال است ومحال است وجنوں است۔[۱]

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ نیشنل کانگرس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے مختلف ذاتوں اور مذاہب کے لوگ ایک قوم ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے مقاصد اور جذبات میں یکسانیت ہے؟ میرے نزدیک یہ قطعاً ممکن نہیں اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نہ نیشنل کانگرس قسم کی کوئی چیز ہوسکتی ہے اور نہ اس سے سب کو یکساں فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے...... کانگرس کے کاموں کو میں صرف اپنی کمیونٹی (Community) ★[2] ہی کے لئے نہیں، پورے ہندوستان کے حق میں مضر سمجھتا ہوں۔ میں ہر کانگرس کے خلاف ہوں، اس کی شکل وصورت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، جو غلط تصورات پر مبنی ہو، یعنی جو پورے ہندوستان کو ایک قوم سمجھتی ہو۔[۲]

★[1] مقابلہ استعداد وصلاحیت۔ ★[2] یکساں خصوصیت کا حامل طبقۂ آبادی

[۱] دی پریزنٹ اسٹیٹ، ص ۲۸ [۲] پولیٹکل پروفائل، ص ۳۹۴

ملک ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کانگرس بھی ان ہی کی جماعت ہے۔ اس جماعت کی کارگزاریوں کا فائدہ ان کو ہی پہنچتا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مسلمانوں کی شرکت سراسر زیاں اور نقصان دہ ہے۔[۱]

جس طرح کہ نیشنل کانگرس کی کارروائی ہوتی ہے اور پولٹیکل مباحثوں کے لئے جابجا مجلسیں کی جاتی ہیں اور عام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ رعایا کے واجبی حقوق ادا نہیں کرتی، اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ نالائق اور جاہل آدمیوں کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ظالم یا کم از کم نامنصف ہے۔ ایسی مجلسوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا ہماری قوم کے لئے نامناسب ہے۔[۲]

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ برٹش گورنمنٹ کی حکومت میں تمام چیزیں اچھی ہیں...... اگر ہم کو بھی انگریزی گورنمنٹ سے کچھ شکایت ہے تو کوئی نئی بات نہیں ہے، خدا کی گورنمنٹ میں بھی تو لوگ اس کا شکر نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم گورنمنٹ سے کوئی چیز نہ مانگو۔ میں خود تمہاری طرف سے واجبی باتوں پر لڑوں گا مگر وہ چیز مانگو جو وہ تم کو دے سکتی ہو یا جن چیزوں کے تم بلحاظ انتظام ملکی مستحق ہو۔ اگر تم ایسی چیز مانگتے ہو جو تم کو گورنمنٹ نہیں دے سکتی تو گورنمنٹ کا قصور نہیں ہے بلکہ مانگنے والے کی بے وقوفی ہے۔ اور جو کچھ مانگو اس طرح پر نہیں کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں کو ظالمانہ کام قرار دو اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے داروں کو دشنام دہی سے یاد کرو اور جس قدر سخت اور ناملائم الفاظ تم کو ملیں وہ لارڈ لٹن اور لارڈ ڈفرن کے حق میں ادا کرو اور تمام انگریزوں کو ظالم بتاؤ اور اسی مضمون سے اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ کرو۔ ان باتوں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ تمہارے اوپر ان کو خدا نے حاکم کر دیا۔ یہ خدا کی مرضی ہے۔ ہمیں خدا کی مرضی پر شاکر رہنا اور خدا کے حکم کی اطاعت کر کے ان کا دوست اور وفادار رہنا چاہیے، نہ یہ کہ ان پر بے جا الزامات لگائیں اور دشمنی پیدا کریں۔ یہ نہ عقل مندی کا کام ہے اور نہ ہماری پاک مذہب کی ہدایت ہے۔ پس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں۔[۳]

۱۔ مکتوبات سرسید (۱)، ص ۳۸۱ ۲۔ دی پریزنٹ اسٹیٹ، ص ۶۲ ۳۔ مکمل مجموعہ لکچرز، ص ۳۷۵

کانگرس ہندوؤں کے لئے بھی نقصان دہ

کانگرس کی...... خواہش جناب نواب گورنر جنرل بہادر کی کونسل اور پروفیشنل قانونی کونسلوں کی توسیع اور اصلاح ہے۔ اس سے ان کی مراد ہندوستان میں ایک پارلیمنٹ کے ہونے اور آخر کار ایک جمہوری طور کی گورنمنٹ کے قائم ہونے سے ہے۔ اگر گورنمنٹ اس کی یہ خواہش منظور کر لے تو وہ صرف مسلمانوں کے ہی بہترین مطالب کے حق میں مبارک نہ ہوگی بلکہ اس سے ہندوؤں کو بھی نقصان عظیم پہنچے گا۔ اس معاملہ میں مسلمان بڑی بڑی مشکلات میں مبتلا ہیں یعنی اول قلت ان کی آبادی بمقابلہ تعداد کثیر ہندوؤں کے، دوم ان کی کوتاہی اور اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم میں ان کا عام افلاس۔ مثلاً اگر حضور وائسرائے بہادر کی کونسل کے ممبر ووٹوں کے ذریعہ سے منتخب کئے جائیں تو مسلمان ممبر کیواسطے پر ایک ووٹ کی بابت ہندو ممبر کے چار ووٹ ہوں گے کیونکہ ہندوؤں کی تعداد بہ نسبت مسلمانوں کے چہار چند ہے۔ علاوہ اس کے عمدہ انگریزی تعلیم کا نہ ہونا مسلمانوں کے الیکشن میں ایک بڑا مانع ہوگا۔ فرض کرو کہ اس مضمون کا ایک قاعدہ جاری کیا جائے کہ جن شخصوں کی سالانہ آمدنی چھ ہزار روپیہ ہو وہ الیکٹر (Elector) یعنی منتخب کرنے والے ہوں گے، اس صورت میں مسلمانوں کو بہت کم ووٹس حاصل ہوں گے اور غالباً ایک مسلمان بھی وائسرائے بہادر کی کونسل میں داخل نہ ہو سکے گا۔ تمام کونسل بنگالیوں سے بھر جائے گی۔ ہمارے صوبہ کے ہندوؤں کا کیا حال ہوگا، گو اُن کی حالت مسلمانوں کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ عمدہ ہو؟ ہمارے صوبہ کے ہندو اور بہادر راجپوت اور قوی ہیکل مرہٹے اور دوسری جنگ آور قومیں گورنمنٹ سے ناخوش ہو گئیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے امن و امان میں خلل واقع ہوگا...... اس سے صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ بہار کے ہندوؤں، پارسیوں، دیسی عیسائیوں اور اینگلو انڈین کو بھی اپنی قلیل تعداد کی وجہ سے یقیناً نقصان پہنچے گا، اگر گورنمنٹ کانگرس کی خواہش کو منظور کر لے گی۔[1]

کانگرس کی احمقانہ تجاویز

کانگرس کی ایک...... احمقانہ تجویز یہ ہے کہ فوج کا بجٹ منظوری کے واسطے ان کے روبرو

---

[1] بحوالہ سرسید کے سیاسی افکار، ص ۲۴۱

پیش کیا جائے۔ یہ تجویز ان شخصوں کے واسطے کیسی لغو معلوم ہوتی ہے جنہوں نے کبھی لڑائی کا میدان نہیں دیکھا ہے اور نہ وہ ایک گولی کے فائر کرنے یا سپاہی کے رکھنے کا خرچ بتا سکتے ہیں۔ پس جس وقت بجٹ غور کے واسطے ان کے روبرو پیش کیا جائے گا تو وہ بلا شبہ ہندوستان کی فوج کی تخفیف کا حکم دیں گے۔ اب فوج میں' اس حالت میں جبکہ ملک کی یہ کیفیت ہے اور روسی ہندوستان کی سرحد کے اس قدر قریب آ گئے ہیں' کیونکر تخفیف ہو سکتی ہے اور گورنمنٹ اس حالت میں' جبکہ ہندوستانیوں پر ہنوز پورا پورا اعتبار نہیں ہوا ہے' کیونکر کانگرس کے حامیوں کی اس درخواست کو منظور کر سکتی ہے؟ [1]

دوسری تجاویز یہ ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی جنگی خدمات عملی طور پر اس ملک کے باشندوں کے واسطے کھول دی جائیں' ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ملٹری کالج مقرر کئے جائیں' قانون اسلحہ کے بعض احکام میں ترمیم کی جائے اور ہندوستانی والنٹیئر (Volunteer)* بھرتی کئے جائیں۔ ان کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں لیکن میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ یہ درخواست منظور کی جائے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ انگریز کس قدر برسوں سے ہم پر حکومت کر رہے ہیں اور غدر کو واقع ہوئے کس قدر برس گزر گئے ہیں؟ پس ایک ایسے ملک کے باشندوں پر' جس میں بہت سی قومیں رہتی ہیں اور بہت سی زبانیں اور مذہب اور عادتیں جاری ہیں' کیونکر اس قدر قلیل عرصہ کے اندر کامل اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ فرض کرو کہ آپ یورپ کے ایک حصہ کو فتح کر لیں اور اس کے حاکم ہو جائیں تو کیا آپ اس ملک کے باشندوں پر اعتبار کریں گے؟ مسلمانوں نے اس وقت کیا کیا تھا جب انہوں نے ہندوستان فتح کیا تھا؟ مغلوں کے زمانے تک' جبکہ پورا پورا اعتبار قائم ہو گیا' ہندوؤں کو فوج میں اعلیٰ درجہ کے عہدے نہیں دئے جاتے تھے۔ اس بات کو یاد رکھو کہ جب بھی وقت آ جائے گا اور تم اپنے تئیں لائق بن لو گے تو تم کو وہی فوائد حاصل ہوں گے جو تمہارے بزرگوں نے پہلے حاصل کئے تھے۔ [2]

---

* رضا کار

[1] بحوالہ سرسید کے سیاسی افکار، ص ۲۴۱ [2] ایضاً، ص ۲۴۲

کانگرس ایجی ٹیشن، امن وامان کی بربادی

اگر کانگرس کا ایجی ٹیشن نہ روکا جائے گا تو اس کا انجام ایک غدر ہوگا جس میں اس قسم کی مصیبتیں اور خوں ریزیاں ظہور میں آئیں گی جن کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کا غدر صرف بچوں کا ایک کھیل تھا۔ اس کانگرس کا ہنوز آغاز ہے لیکن چند برسوں کے بعد اس کو غالباً ایسی بڑی ترقی ہو جائے گی کہ اس کا روکنا نہایت دشوار ہوگا۔ پس کیا گورنمنٹ کو اس کے قطعی انسداد کے واسطے بعض قوانین کا جاری کرنا مناسب اور قرین مصلحت نہیں ہے؟ اگر ہم روسیوں یا یورپ کی کسی دوسری سلطنت کی خودمختار حکومت میں ہوتے تو وہ ہرگز اس قسم کے بے ہودہ ایجی ٹیشن کو گوارا نہ کرتے۔ میں مکرر یہ بات بیان کرتا ہوں کہ کانگرس لاعلاج نفاق اور نااتفاقی کی ایک ترغیب ہے اور اس کے باعث ملک کے امن وامان میں خلل واقع ہوگا اور آخرکار ایک بربادی پیدا کرنے والی آفت پیدا ہوگی۔[1]

کانگرس کے مطالبات اگر پورے کر دئے جائیں تو امن وامان جس درجہ برہم ہوگا اس کی وسعت و گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ تعجب نہیں ہے کہ ان حالات میں سرکار کو سول (Civil)* کی جگہ پر فوجی انتظام قائم کرنا پڑے۔[2]

میرے خیال میں اگر ہندوستان کے تمام حکمران نیشنل کانگرس کے ہمدرد بن جائیں تب بھی کانگرس کے حامی کامیاب نہیں ہو سکتے۔[3]

میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں نے یہ بھی سنا کہ آک لینڈ کالون، لارڈ ڈفرن سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا اور سارے کا سارا ہاؤس آف کامنز کانگرس کے حق میں ہو جائیں تو بھی میں اس کا ہمیشہ کی مانند مخالف رہوں گا۔[4]

کانگرس مذکور کے مقاصد ملک کے لئے، ملک کے امن کے لئے، ملک کی ترقی کے لئے، گورنمنٹ کے لئے اور خاص مسلمانوں کے لئے ان کی موجودہ حالت میں اور نیز آئندہ کو بھی، گو کہ ان کی تعلیم میں کتنی ہی ترقی ہو جائے، نہایت درجہ مضر ہیں۔ اگر بالفرض محال کانگرس مذکورہ

---

* غیرفوجی

[1] بحوالہ سرسید کے سیاسی افکار، ص۲۴۲ [2] بحوالہ سرسید، سیاسی مطالعہ، ص۲۷۳

[3] دی پریزنٹ اسٹیٹ (۲)، ص۴۷ [4] بحوالہ سرسید، اے پولیٹیکل بائیوگرافی، ص۲۲۷

پیش کیا جائے۔ یہ تجویز ان شخصوں کے واسطے کیسی لغو معلوم ہوتی ہے جنہوں نے کبھی لڑائی کا میدان نہیں دیکھا ہے اور نہ وہ ایک گولی کے فائر کرنے یا سپاہی کے رکھنے کا خرچ بتا سکتے ہیں۔ پس جس وقت بجٹ غور کے واسطے ان کے روبرو پیش کیا جائے گا تو وہ بلاشبہ ہندوستان کی فوج کی تخفیف کا حکم دیں گے۔ اب فوج میں اس حالت میں جبکہ ملک کی یہ کیفیت ہے اور روسی ہندوستان کی سرحد کے اس قدر قریب آ گئے ہیں' کیونکر تخفیف ہو سکتی ہے اور گورنمنٹ اس حالت میں' جبکہ ہندوستانیوں پر ہنوز پورا پورا اعتبار نہیں ہوا ہے' کیونکر کانگرس کے حامیوں کی اس درخواست کو منظور کر سکتی ہے؟ [1]

دوسری تجاویز یہ ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی جنگی خدمات عملی طور پر اس ملک کے باشندوں کے واسطے کھول دی جائیں' ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ملٹری کالج مقرر کئے جائیں' قانون اسلحہ کے بعض احکام میں ترمیم کی جائے اور ہندوستانی والنٹیئر (Volunteer)* بھرتی کئے جائیں۔ ان کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں لیکن میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ یہ درخواست منظور کی جائے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ انگریز کس قدر برسوں سے ہم پر حکومت کر رہے ہیں اور غدر کو واقع ہوئے کس قدر برس گزر گئے ہیں؟ پس ایک ایسے ملک کے باشندوں پر' جس میں بہت سی قومیں رہتی ہیں اور بہت سی زبانیں اور مذہب اور عادتیں جاری ہیں' کیونکر اس قدر قلیل عرصہ کے اندر کامل اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ فرض کرو کہ آپ یورپ کے ایک حصہ کو فتح کر لیں اور اس کے حاکم ہو جائیں تو کیا آپ اس ملک کے باشندوں پر اعتبار کریں گے؟ مسلمانوں نے اس وقت کیا کیا تھا جب انہوں نے ہندوستان فتح کیا تھا؟ مغلوں کے زمانے تک' جبکہ پورا پورا اعتبار قائم ہو گیا' ہندوؤں کو فوج میں اعلیٰ درجہ کے عہدے نہیں دئے جاتے تھے۔ اس بات کو یاد رکھو کہ جب بھی وقت آ جائے گا اور تم اپنے تئیں لائق بن لو گے تو تم کو وہی فوائد حاصل ہوں گے جو تمہارے بزرگوں نے پہلے حاصل کئے تھے۔ [2]

---

* رضا کار

[1] بحوالہ سرسید کے سیاسی افکار، ص ۲۴۱ [2] ایضاً، ص ۲۴۲

کانگرس ایجی ٹیشن، امن وامان کی بربادی

اگر کانگرس کا ایجی ٹیشن نہ روکا جائے گا تو اس کا انجام ایک غدر ہوگا جس میں اس قسم کی مصیبتیں اور خوں ریزیاں ظہور میں آئیں گی جن کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کا غدر صرف بچوں کا ایک کھیل تھا۔ اس کانگرس کا ہنوز آغاز ہے لیکن چند برسوں کے بعد اس کو غالباً ایسی بڑی ترقی ہوجائے گی کہ اس کا روکنا نہایت دشوار ہوگا۔ پس کیا گورنمنٹ کو اس کے قطعی انسداد کے واسطے بعض قوانین کا جاری کرنا مناسب اور قرین مصلحت نہیں ہے؟ اگر ہم روسیوں یا یورپ کی کسی دوسری سلطنت کی خودمختار حکومت میں ہوتے تو وہ ہرگز اس قسم کے بے ہودہ ایجی ٹیشن کو گوارا نہ کرتے۔ میں مکرر یہ بات بیان کرتا ہوں کہ کانگرس لاعلاج نفاق اور نااتفاقی کی ایک ترغیب ہے اور اس کے باعث ملک کے امن وامان میں خلل واقع ہوگا اور آخرکار ایک بربادی پیدا کرنے والی آفت پیدا ہوگی۔[1]

کانگرس کے مطالبات اگر پورے کردئے جائیں تو امن وامان جس درجہ برہم ہوگا اس کی وسعت و گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ تعجب نہیں ہے کہ ان حالات میں سرکار کو سول (Civil)* کی جگہ پر فوجی انتظام قائم کرنا پڑے۔[2]

میرے خیال میں اگر ہندوستان کے تمام حکمران نیشنل کانگرس کے ہمدرد بن جائیں تب بھی کانگرس کے حامی کامیاب نہیں ہوسکتے۔[3]

میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں نے یہ بھی سنا کہ آک لینڈ کالون، لارڈ ڈفرن سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا اور سارے کا سارا ہاؤس آف کامنز کانگرس کے حق میں ہوجائیں تو بھی میں اس کا ہمیشہ کی مانند مخالف رہوں گا۔[4]

کانگرس مذکور کے مقاصد ملک کے لئے، ملک کے امن کے لئے، ملک کی ترقی کے لئے گورنمنٹ کے لئے اور خاص مسلمانوں کے لئے ان کی موجودہ حالت میں اور نیز آئندہ کو بھی، گوکہ ان کی تعلیم میں کتنی ہی ترقی ہوجائے، نہایت درجہ مضر ہیں۔ اگر بالفرض محال کانگرس مذکورہ

---

* غیرفوجی

[1] بحوالہ سرسید کے سیاسی افکار، ص ۲۴۲ — [2] بحوالہ سرسید، سیاسی مطالعہ، ص ۲۷۳
[3] دی پریزنٹ اسٹیٹ (۲)، ص ۴۷ — [4] بحوالہ سرسید، اے پولیٹیکل بائیوگرافی، ص ۲۴۷

کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی...... بہت زیادہ بدتر ہو جائے گا۔ اعوذ باللہ من غضب اللہ۔[1]

صحافت میں حدِ آزادی سے تجاوز

ہم لوگوں نے آزادی کے معنی سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ ہم نے آزادی کے معنی یہ سمجھ رکھے ہیں کہ گورنمنٹ کی نسبت، حکام ضلع کی نسبت، کسی فرقہ کی نسبت یا کسی شخص خاص کی نسبت جو جو دل میں آیا، اچھا یا برا، سخت یا سست، ملائم یا ناملائم، سب کچھ لکھ دیا یہاں تک کہ شخص خاص کے ذاتی امور کو بھی۔ اور شخص خاص کی نسبت سخت کلامی اور دشنام دہی اور فحش الفاظ لکھنے کو بھی ہم نے اسی آزادی میں داخل سمجھا ہے۔ اگر آزادی کے معنی درحقیقت یہی ہوں تو بلاشبہ وہ قائم رکھنے کے قابل نہیں ہے...... اس قسم کے مضامین گو ہندوستانی اخباروں میں کسی بدنیتی سے لکھے جاتے ہوں بلکہ عام ایشیائی مبالغہ آمیز تحریر اور فصاحت بیان اور لوگوں میں پسندیدہ ہونے کو تحریر ہوتے ہوں مگر آزادی کی حد سے متجاوز ہیں۔[2]

آزادی بلاشبہ رعایا کا حق ہے مگر اسی وقت تک جب تک کہ رعیت اس کے قائم رکھنے کے لائق ہو۔ جو رعیت کہ آزادی کا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں ہے وہ کبھی آزادی کا خلعت نہیں پہن سکتی۔ پس آزادی کا دعویٰ کرنے سے پہلے ضرور ہے کہ ہم اپنے تئیں آزادی کا مستحق بھی ثابت کریں۔[3]

اگرچہ مسلمان نیشنل کانگرس کے ایجی ٹیشن میں شریک نہیں ہوتے لیکن اکثر ان اخباروں نے بھی، سوائے بعض کے جو مسلمان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہیں، اور اخباروں کی دیکھا دیکھی اپنے جامہ سے باہر قدم رکھ دیا ہے اور مضامین کی تحریر میں ان کے قلم میں بھی کوئی روک نہیں رہی جو نہایت افسوس کے قابل ہے۔ مگر ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر بالفرض ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان نیشنل کانگرس کے ساتھ ایجی ٹیشن میں شریک ہو جائیں اور تمام اخبار، ہندو اور مسلمانوں کے، مضامین خلاف واقعہ اور برخلاف گورنمنٹ لکھنے پر متفق ہو جائیں تو بھی گورنمنٹ کا کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔ ہاں، بمجبوری گورنمنٹ کو دائرہ آزادی کو، جو اس وقت

۱؎ مکتوبات سرسید (۲)، ص ۴۰۵ ۲؎ مقالات سرسید (۱۰)، ص ۱۴-۱۵ ۳؎ ایضاً، ص ۱۶

ہے' زیادہ تنگ کرنا پڑے گا اور بجبوری اس کو ہندوستانی اخباروں کی آزادی چھین لینے پر قانون بنانا ہوگا' اور یہ گورنمنٹ کا کچھ قصور نہیں ہوگا۔ جو کچھ گورنمنٹ کرے گی وہ ہندوستانیوں ہی کی بداعمالی کی سزا ہوگی۔[1] (اگست ۱۸۹۷ء)

عالمگیر اسلامی قومیت اور ارضِ ہند

''قوم'' کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قسم قدر غور کرنا لازم ہے۔ زمانہ دراز سے' جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے' قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بابی انت وامی یا رسول اللہ) نے اس تفرقہ قومی کو' جو صرف دنیوی اعتبار سے تھا' مٹادیا اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے' تمام قومی رشتے سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہوگیا۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک' وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا' وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا' وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں' وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے کا' بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمہ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہوگیا بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا۔[2]

مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہوگیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہوگیا ہے اور کل مومن اخ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لئے وہ ہر ایک ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔[3]

مگر ہم کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں۔ گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمے میں' جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا ہے' شریک نہیں ہیں مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ اسی زمین پر' ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی' دکن کی ہو یا مالیہ

---

[1] آخری مضامین، ص ۸۷ — [2] سفرنامہ پنجاب، ص ۸ — [3] آخری مضامین، ص ۳۵

کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی...... بہت زیادہ بدتر ہو جائے گا۔ اعوذ باللہ من غضب اللہ۔[۱]

صحافت میں حدِ آزادی سے تجاوز

ہم لوگوں نے آزادی کے معنی سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ ہم نے آزادی کے معنی یہ سمجھ رکھے ہیں کہ گورنمنٹ کی نسبت، حکامِ ضلع کی نسبت، کسی فرقہ کی نسبت یا کسی شخص خاص کی نسبت جو جو دل میں آیا، اچھا یا برا، سخت یا سست، ملائم یا نا ملائم، سب کچھ لکھ دیا یہاں تک کہ شخص خاص کے ذاتی امور کو بھی۔ اور شخص خاص کی نسبت سخت کلامی اور دشنام دہی اور فحش الفاظ لکھنے کو بھی ہم نے اسی آزادی میں داخل سمجھا ہے۔ اگر آزادی کے معنی درحقیقت یہی ہوں تو بلاشبہ وہ قائم رکھنے کے قابل نہیں ہے...... اس قسم کے مضامین گو ہندوستانی اخباروں میں کسی بدنیتی سے لکھے جاتے ہوں بلکہ عام ایشیائی مبالغہ آمیز تحریر اور فصاحت بیان اور لوگوں میں پسندیدہ ہونے کو تحریر ہوتے ہوں مگر آزادی کی حد سے متجاوز ہیں۔[۲]

آزادی بلاشبہ رعایا کا حق ہے مگر اسی وقت تک جب تک کہ رعیت اس کے قائم رکھنے کے لائق ہو۔ جو رعیت کہ آزادی کا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں ہے وہ کبھی آزادی کا خلعت نہیں پہن سکتی۔ پس آزادی کا دعویٰ کرنے سے پہلے ضرور ہے کہ ہم اپنے تئیں آزادی کا مستحق بھی ثابت کریں۔[۳]

اگرچہ مسلمان نیشنل کانگرس کے ایجی ٹیشن میں شریک نہیں ہوتے لیکن اکثر ان اخباروں نے بھی، سوائے بعض کے جو مسلمان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہیں، اور اخباروں کی دیکھا دیکھی اپنے جامہ سے باہر قدم رکھ دیا ہے اور مضامین کی تحریر میں ان کے قلم میں بھی کوئی روک نہیں رہی جو نہایت افسوس کے قابل ہے۔ مگر ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر بالفرض ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان نیشنل کانگرس کے ساتھ ایجی ٹیشن میں شریک ہو جائیں اور تمام اخبار، ہندو اور مسلمانوں کے، مضامین خلاف واقعہ اور برخلاف گورنمنٹ لکھنے پر متفق ہو جائیں تو بھی گورنمنٹ کا کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔ ہاں، بمجبوری گورنمنٹ کو دائرہ آزادی کو، جو اس وقت

۱۔ مکتوبات سرسید (۲)، ص ۴۰۵ ۲۔ مقالات سرسید (۱۰)، ص ۱۴-۱۵ ۳۔ ایضاً، ص ۱۶

ہے' زیادہ تنگ کرنا پڑے گا اور بمجبوری اس کو ہندوستانی اخباروں کی آزادی چھین لینے پر قانون بنانا ہوگا' اور یہ گورنمنٹ کا کچھ قصور نہیں ہوگا۔ جو کچھ گورنمنٹ کرے گی وہ ہندوستانیوں ہی کی بداعمالی کی سزا ہوگی۔[1] (اگست ۱۸۹۷ء)

عالمگیر اسلامی قومیت اور ارضِ ہند

''قوم'' کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قسم قدر غور کرنا لازم ہے۔ زمانہ دراز سے' جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے' قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بابی انت وامی یارسول اللہ) نے اس تفرقۂ قومی کو' جو صرف دنیوی اعتبار سے تھا' مٹادیا اور ایک روحانی رشتۂ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے' تمام قومی رشتے سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہوگیا۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک' وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا' وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا' وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں' وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے کا' بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقٰی کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہوگیا بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا۔[2]

مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہوگیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہوگیا ہے اور کل مومن اخ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لئے وہ ہر ایک ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔[3]

مگر ہم کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں۔ گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمے میں' جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا ہے' شریک نہیں ہیں مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ اسی زمین پر' ہندوستان کی ہو یا پنجاب کی' دکن کی ہو یا ہمالیہ

---

[1] آخری مضامین، ص ۷۸ [2] سفرنامہ پنجاب، ص ۸ [3] آخری مضامین، ص ۲۵

کی، ہم دونوں رہتے ہیں۔ اسی ملک کی ہوا سے، اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور تمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں۔ ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔ ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصے ہیں: ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا۔ خدا کا حصہ خدا کے لئے چھوڑ دو اور جو حصہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو۔ تمام امور انسانیت میں، جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں، ایک دوسرے کے مددگار ہو۔[1]

ہندوستان میں لفظ ''قوم'' کا اطلاق

پرانی تاریخوں میں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ ''قوم'' کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں، ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں، یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے ''قوم'' کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔[2]

ملک ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں۔ جس طرح کہ انسان میں بعض اعضائے رئیسہ ہیں اسی طرح ہندوستان کے لئے وہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے...... جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے...... ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اپنے سے پیش قوموں کی طرح ہم بھی اس ملک میں رہ پڑے۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں،

---

[1] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۱ [2] ایضاً، ص ۹۴

مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے، ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصہ سے، جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے، قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔[۱]

میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کی بائیں آنکھ کہیں گے مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش، میرے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا۔[۲]

تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں "قوم" کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ نہیں پسند کرتا۔[۳]

وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں۔[۴]

لفظ "قوم" سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ "نیشن" (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔[۵]

یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔[۶]

ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے

---

۱ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۱۷۴ ۲ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۶۷ ۳ مکمل مجموعہ لیکچرز، ص ۱۳۷
۴ سفرنامہ پنجاب، ص ۱۴۳ ۵ ایضاً، ص ۱۶۷ ۶ ایضاً، ص ۹۳

تیئں ہندو کہہ سکتا ہے۔[1] ★

ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں، یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بناپر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔[2]

مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں ایک دوسرے کا خون مل جاتا ہے۔ خدا نے صدہا سال سے ہمارا ان کا ساتھ اس زمین پر کردیا ہے۔[3]

مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین پر گزری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں، ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی "ہندو" یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاسکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں...... ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ...... ہم دونوں قومیں نہایت محبت و اخلاص سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں

★ اپنے اس خطاب میں سرسید نے اس بات پر ہندوؤں سے گلہ کیا کہ "مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے۔" (سفرنامہ پنجاب، ص ۱۴۰)

[1] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۳۹ [2] ایضاً، ص ۱۶۷ [3] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۲۸ مئی ۱۸۷۵ء)، ضمیمہ، ص ۷

اور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر انڈیا کی سلامتی اور درازی سلطنت کی دعا کرتے رہیں جس کی بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے۔[۱] (جون ۱۸۹۷ء)

(تاریخ وفات سرسید: ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء)

---

[۱] آخری مضامین، ص ۵۵-۵۸

تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔[1] ★

ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں، یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔[2]

مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں ایک دوسرے کا خون مل جاتا ہے۔ خدا نے صدہا سال سے ہمارا ان کا ساتھ اس زمین پر کر دیا ہے۔[3]

مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین پر گزری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں، ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی "ہندو" یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جا سکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آ گئی ہیں...... ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ...... ہم دونوں قومیں نہایت محبت و اخلاص سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں

★ اپنے اس خطاب میں سرسید نے اس بات پر ہندوؤں سے گلہ کیا کہ "مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے۔" (سفرنامہ پنجاب، ص ۱۴۰)

[1] سفرنامہ پنجاب، ص ۱۳۹ [2] ایضاً، ص ۱۶۷ [3] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۲۸ مئی ۱۸۷۵ء)، ضمیمہ، ص ۷

اور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر انڈیا کی سلامتی اور درازی سلطنت کی دعا کرتے رہیں جس کی بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے۔[1] (جون ۱۸۹۷ء)

(تاریخ وفات سرسید: ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء)

[1] آخری مضامین، ص ۵۵-۵۸

کتابیات

کسی شخصیت کی خودنوشت حیات یا افکار کی ترتیب و تدوین میں اُس کی تمام تر تحریروں اور بیانات کا مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقف کے پیش نظر سرسید کی معلوم تالیفات اور ان کے خطبات و دیگر تحریرات کے مجموعوں کو "کتابیات" کی تفصیل میں "مطالعہ سرسید کے مآخذ" کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس فہرست میں ہر ایک حوالہ جاتی کتاب ہو۔ جہاں ایک ہی تالیف کی ایک سے زیادہ اشاعتوں کا ذکر ہے، وہاں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ ان میں سے کون سی حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اگرچہ اس مطالعہ میں حیات و افکار سرسید پر لکھی گئی بہت سی تالیفات کے علاوہ تحریک علی گڑھ اور اس سے منسلک شخصیات سے متعلق کتابیں اور متعدد رسائل و جرائد بھی خاصی اہمیت کے حامل رہے ہیں مگر ان میں سے صرف انہی کی تفصیل "دیگر چند متفرق مآخذ" کے زیر عنوان دی گئی ہے جن میں سے اقتباسات منتخب کئے گئے۔

علاوہ ازیں حواشی میں بعض طویل ناموں والی کتب کی نشان دہی مختصراً ان کے اول حروف سے کی گئی ہے۔ ذیل میں مختصر ناموں کے مقابل ان کے پورے نام درج کئے جاتے ہیں:

کتابیات

کسی شخصیت کی خودنوشت حیات یا افکار کی ترتیب وتدوین میں اُس کی تمام تر تحریروں اور بیانات کا مطالعہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقف کے پیش نظر سرسید کی معلوم تالیفات اوران کے خطبات و دیگر تحریرات کے مجموعوں کو ''کتابیات'' کی تفصیل میں ''مطالعہ سرسید کے مآخذ'' کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس فہرست میں ہر ایک حوالہ جاتی کتاب ہو۔ جہاں ایک ہی تالیف کی ایک سے زیادہ اشاعتوں کا ذکر ہے، وہاں یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ ان میں سے کون سی حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اگرچہ اس مطالعہ میں حیات وافکارِ سرسید پر لکھی گئی بہت سی تالیفات کے علاوہ تحریک علی گڑھ اور اس سے منسلک شخصیات سے متعلق کتابیں اور متعدد رسائل و جرائد بھی خاصی اہمیت کے حامل رہے ہیں مگر ان میں سے صرف انہی کی تفصیل ''دیگر چند متفرق مآخذ'' کے زیرِ عنوان دی گئی ہے جن میں سے اقتباسات منتخب کیے گئے۔

علاوہ ازیں حواشی میں بعض طویل ناموں والی کتب کی نشان دہی مختصراً ان کے اول حروف سے کی گئی ہے۔ ذیل میں مختصر ناموں کے مقابل ان کے پورے نام درج کیے جاتے ہیں:

مختصر نام	پورا نام
احکام طعام	احکام طعام اہل کتاب
ازالۃ الغین	ازالۃ الغین عن ذی القرنین
النظر	النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی
ایڈریس اور اسپیچیں	ایڈریس اور اسپیچیں متعلقہ ایم اے او کالج
تبیین الکلام	تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام
ترقیم	ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم
تفسیر الجن	تفسیر الجن والجان علیٰ مافی القرآن
خطبات احمدیہ	الخطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ
خلق الانسان	خلق الانسان علیٰ مافی القرآن
راہ سنت	راہ سنت درر دِ بدعت
سرسید۔ سیاسی مطالعہ	سرسید احمد خاں۔ ایک سیاسی مطالعہ
مکمل مجموعہ لکچرز	مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید
مجموعہ لکچرز محسن الملک	مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک
لائل محمڈنز	An Account of the Loyal Mahomedans of India
پولٹیکل پروفائل	Political Profile of Sir Syed Ahmad Khan
دی پریزنٹ اسٹیٹ	Sir Syed Ahmed Khan on the Present State of Indian Politics
دی لائف اینڈ ورک	The Life and Work of Syed Ahmed Khan
سلیکٹڈ ڈاکومنٹس	Selected Documents from the Aligarh Archives
سرسید۔ اے پولٹیکل بائیوگرافی	Sir Syed Ahmed Khan - A Political Biography

مطالعہ سرسید کے مآخذ

(بلحاظ ترتیب حروف تہجی)

تصانیف سرسید

آثار الصنادید (طبع اول) مطبع سید الاخبار دہلی (۱۸۴۷ء)

......ایضاً......طبع دوم (برائے حوالہ متن) مطبع سلطانی و مطبع احمدی دہلی (۱۸۵۴ء)

......ایضاً......(مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی (۱۹۶۶ء)

......ایضاً......(جلد اول تا جلد سوم) مرتبہ خلیق انجم۔ اردو اکادمی دہلی (۱۹۹۲ء)

آئین اکبری (تصحیح) مطبع اسمٰعیلی دہلی (۱۲۷۲ھ) ۱۸۵۶ء

ابطال غلامی: مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۳ء)

احکام طعام اہل کتاب۔ مطبع منشی نول کشور کان پور (۱۸۶۸ء)

ازالۃ الغین عن ذی القرنین۔ مطبع مفید عام اکبر آباد (۱۳۰۷ھ) ۱۸۹۰ء

اسباب بغاوت ہند (مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی) اردو اکیڈمی سندھ کراچی (۱۹۵۷ء)

......ایضاً......(مرتبہ فوق کریمی) یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ (۱۹۵۸ء)

......ایضاً......(مرتبہ فوق کریمی) انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی (۱۹۸۵ء)

......ایضاً......(مرتبہ سلیم الدین قریشی) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور (۱۹۹۷ء)

اسباب سرکشی ہندوستان (اسباب بغاوت ہند) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء)

التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم ہند۔ پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور (۱۸۶۳ء)

الخطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ (خطبات احمدیہ) مسلم پرنٹنگ ورکس لاہور (س۔ن)

الدعا والاستجابہ۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۲ء)

النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۸۹ء)

تاریخ فیروز شاہی (تصحیح)۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ (۱۸۶۲ء)
تبریۃ الاسلام عن شین الامتہ والغلام۔ مطبع سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ (۱۸۹۵ء)
تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام
(حصہ اول) پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور (۱۸۶۲ء)
(حصہ دوم) پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور و علی گڑھ (۱۸۶۵ء)
(حصہ سوم) مشمولہ تصانیف احمدیہ' حصہ اول' جلد دوم
تحریر فی اصول التفسیر۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۲ء)
تحفہ حسن (ترجمہ) مشمولہ تصانیف احمدیہ' حصہ اول' جلد اول
تذکرہ اہل دہلی (آخری باب ''آثار الصنادید'' طبع اوّل) مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڈھی۔
انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی (۱۹۶۵ء)
ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۳۰۷ھ) ۱۸۹۰ء
تسہیل فی جر الثقیل (ترجمہ) یتیموں کا چھاپہ خانہ آگرہ (۱۸۴۴ء)
تصانیف احمدیہ۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ
حصہ اول' جلد اول (۱۸۸۳ء)
حصہ اول' جلد دوم (۱۸۸۷ء)
حصہ اول' جلد سوم تا جلد نہم (دیکھئے تفسیر القرآن جلد اول تا جلد ہفتم بالترتیب)
تفسیر الجن والجان علیٰ مافی القرآن۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۳۰۹ھ) ۱۸۹۲ء
تفسیر السموات۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۸ء)
......ایضاً......(برائے حوالہ متن) نول کشور سٹیم پریس لاہور (۱۹۰۹ء)
تفسیر القرآن، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ
جلد اول (۱۸۸۰ء)
جلد دوم (۱۸۸۲ء)
جلد سوم (۱۸۸۵ء)

جلد چہارم (۱۸۸۸ء)

جلد پنجم (۱۸۹۲ء)

جلد ششم (۱۸۹۵ء)

جلد ہفتم مطبع مفید عام آگرہ (۱۹۰۴ء)

توزک جہانگیری (تصحیح) پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور/علی گڑھ (۱۸۶۴ء)

جام جم۔ چھاپہ خانہ مستقر الخلافت اکبرآباد (۱۸۴۰ء)

جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ لیتھوگرافک پریس سید محمد خان بہادر دہلی (۱۸۴۳ء)

خطبات احمدیہ (دیکھئے: الخطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ)

خلق الانسان علی مافی القرآن۔ مطبع مفید عام اکبرآباد (۱۳۰۹ھ) ۱۸۹۲ء

راہ سنت در رد بدعت (مشمولہ تصانیف احمدیہ حصہ اول، جلد اول)

رسالہ خیرخواہان مسلمانان (دیکھئے لائل محمڈنز آف انڈیا)

ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر۔ ہنری ایس کنگ لندن (۱۸۷۲ء)

سرکشی ضلع بجنور (برائے حوالہ متن) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء)

......ایضاً......(مرتبہ شرافت حسین مرزا) ندوۃ المصنفین دہلی (۱۸۶۴ء)

......ایضاً......(مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) سلمان اکیڈمی کراچی (۱۹۶۲ء)

سلسلۃ الملوک۔ مطبع شرف المطالع دہلی (۱۸۵۲ء)

سیرت فریدیہ۔ مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۶ء)

......ایضاً......(مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۶۴ء)

شکریہ (مرادآباد کے مسلمانوں کا) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۵۹ء)

فضائل الامام من رسائل حجۃ الاسلام (تصحیح وتدوین) مطبع مفید عام اکبرآباد (۱۳۱۰ھ) ۱۸۹۳ء

فوائد الافکار فی اعمال الفرجار (ترجمہ) چھاپہ خانہ سید الاخبار دہلی (۱۸۴۶ء)

قدیم نظام دیہی ہندوستان۔ مطبع سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ (۱۸۷۸ء)

فقرات سرسید (کتاب فقرات) مرتبہ حکیم محمد حسین خاں شفا۔ اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد (انڈیا) ۱۹۸۸ء

قواعد صرف ونحو زبان اردو (مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری) ادارہ تصنیف وتحقیق کراچی (۱۹۹۰ء)

قولِ متین در ابطال حرکت زمین۔ مطبع سید الاخبار دہلی (۱۲۶۵ھ) ۱۸۴۸ء

کتاب نقرات۔ مطبع ضیائی میرٹھ (۱۸۷۰ء)

کلمۃ الحق در بیان حقیقت پیری ومریدی (مشمولہ تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول)

کیمیائے سعادت (جزوی ترجمہ) مشمولہ تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول

لائل محمڈنز آف انڈیا (رسالہ خیرخواہان مسلمانان) مفصلائٹ پریس میرٹھ

حصہ اول (۱۸۶۰ء)

حصہ دوم (۱۸۶۰ء)

حصہ سوم (۱۸۶۱ء)

نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور شیخ (مشمولہ تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول)

ہنٹر پر ہنٹر۔ اقبال اکیڈمی لاہور (۱۹۴۹ء)

A Series of Essays on the Life of Mohammad
Trubner & Co. London. (1869-70)

Causes of the Indian Revolt
(Comp. & Ed. Salim al-Din Quraishi)
Sang-e-Meel Publications, Lahore, (1997)
Review on Dr.Hunter's Indian Musalmans
Premier Book House, Lahore.

Strictures upon the Present Educational System in India
Henry S.King & Co. London. (1869)

The Causes of the Indian Revolt
The Book House, Lahore.

سرسید کی تحریروں اور تقریروں کے مجموعے

آخری مضامین (برائے حوالہ متن) مرتبہ امام الدین گجراتی۔ رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء)

ایضاً...... (مرتبہ امام الدین گجراتی واحمد بابا مخدومی) کواپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور (طبع سوم)

انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (مرتبہ اصغر عباس) اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ (۱۹۸۲ء)

تفسیر القرآن (جلد ہشتم) مشتمل بر متفرق مضامین مذہبی، فیروز پرنٹنگ پریس لاہور (۱۹۲۱ء)
تہذیب الاخلاق (جلد دوم) مرتبہ منشی فضل الدین۔ مصطفائی پریس لاہور (۱۸۹۵ء)
خطبات سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور
جلد اول (۱۹۷۲ء)
جلد دوم (۱۹۷۳ء)
خطوط سرسید (مرتبہ سید راس مسعود) نظامی پریس بدایوں (۱۹۲۴ء)
سرسید کا آئینہ خانۂ افکار (مرتبہ ابوالخیر کشفی) فضلی سنز کراچی (۱۹۹۸ء)
سرسید کی اسلامی بصیرت (مرتبہ جمال خواجہ) نیو علی گڑھ موومنٹ علی گڑھ (۱۹۸۷ء)
سرسید کی تعزیتی تحریریں (مرتبہ اصغر عباس) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۱۹۸۹ء)
سفرنامہ پنجاب (سید احمد خاں کا) مرتبہ سید اقبال علی، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء)
مسافران لندن (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۱ء)
مقالات سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور
حصہ اول (۱۹۶۲ء)
حصہ دوم وسوم (۱۹۶۱ء)
حصہ چہارم تا دہم (۱۹۶۲ء)
حصہ ۱۱ تا ۱۳ (۱۹۶۳ء)
حصہ ۱۴ (۱۹۶۵ء)
حصہ ۱۵ (۱۹۶۳ء)
حصہ ۱۶ (۱۹۶۵ء)
مقالات سرسید (مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی) نیشنل پرنٹرز کمپنی علی گڑھ (۱۹۵۲ء)
مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) یونین پرنٹنگ پریس دہلی (۱۹۶۰ء)
مکتوبات سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۵۹ء)
مکتوبات سرسید (طبع دوم) مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور

جلد اول (۱۹۷۶ء)

جلد دوم (۱۹۸۵ء)

مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء)

Correspondence of Sir Syed Ahmad Khan and his Contemporaries (Ed.Salim al-Din Quraishi)
Sang-e-Meel Publications, Lahore.(1988)

Letters to and from Sir Syed Ahmad Khan
(Ed. Sh. Ismail Panipati)
Board of the Advancement of Literature, Lahore. (1982)

Political Profile of Sir Syed Ahmad Khan
(Ed. Hafeez Malik) Islamic University, Islamabad. 1982.

Sir Syed Ahmad Khan's Educational Philosophy:
(A Documentary Record) Ed. Hafeez Malik. National Instt. of Historical & Cultural Research, Islamabad. (1989)

Sir Syed Ahmad Khan on the Present State of Indian Politics
(Ed. Theodore Beck) Pioneers Press, Allahabad. (1888)

Writings and Speeches of Sir Syed Ahmad Khan
(Ed. Shan Muhammad) No-Chiketa Publications, Bombay. (1972)

دیگر چند متفرق مآخذ

ایڈریس اور اسپیچیں (متعلقہ ایم اے او کالج) مرتبہ نواب محسن الملک، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء)

برگِ گل کراچی، سرسید نمبر (نقشِ ثانی) ۶۹-۱۹۶۸ء

تذکرہ سرسید (محمد امین زبیری) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۱۹۶۱ء)

تذکرہ وقار (محمد امین زبیری) علی گڑھ (۱۹۳۸ء)

"تہذیب الاخلاق علی گڑھ" کے متذکرہ شمارے

حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء)

روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۵ء)

سرسید احمد خاں — ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

سرسید کے سیاسی افکار (ڈاکٹر فوق کریمی) ایشیا بک سنٹر لاہور (۱۹۹۰ء)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اخبار سائنٹفک سوسائٹی) کے متذکرہ شمارے
کلیات نثر حالی (جلد دوم) مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۸ء)
مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک۔ نول کشور گیس پرنٹنگ پریس لاہور (۱۹۰۴ء)
موعظہ حسنہ (ڈپٹی نذیر احمد) مرتبہ عبدالغفور شہباز۔ مطبع انصاری دہلی (۱۳۰۸ھ) ۱۸۹۰ء
''مہذب'' لکھنؤ (یکم اگست و یکم نومبر ۱۸۹۰ء کے شمارے)

Selected Documents from the Aligarh Archives
(Ed. Yusuf Hussain) University Press, Aligarh. (1966)

Sir Syed Ahmad Khan - A Political Biography
(By Shan Mohammad) Universal Books, Lahore. (1976)

The Life and Work of Syed Ahmed Khan
(By G.F.I Graham) Hedder & Stoughton, London. (1909)